نوآبادیات، مزاحمت اور اردو صحافت:
لکھنؤ کا ہفتہ وار اودھ پنچ (۱۸۷۷-۱۹۳۴)

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی

مقالہ نگار

رضی احمد

نگراں

پروفیسر مظہر مہدی حسین

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی- ۶۷

2017

जवाहर लाल नेहरू विश्वविद्यालय
नई दिल्ली— 110067
Jawaharlal Nehru University
Centre of Indian Languages
School of Languages, literature & Culture studies
New Delhi 110067

Dated 20 /06/2017

DECLARATION

I hereby declare that the research work done in this Ph.D. thesis entitled *Nau-Abadiyat, Muzahamat aur Urdu Sahafat: Lucknow ka Haftahwar Awadh Panch (1877-1934) (Colonialism, Resistance and the Urdu Journalism: The weekly Awadh Panch of Lucknow, 1877-1934)* by me is an original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution.

Razi Ahmad
(Research Scholar)

Prof. Mazhar Hussain
(Mazhar Mehdi)
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Gobind Prasad
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

GRAM JAYENU Tel, (91-011)26741227,26742676, Extn:4217(D)26704217,Telefax(91-011)26704217
Email :chair_cil @mail.jnu.ac.in,jnucil@gmail.com

فہرست

پیش لفظ ۱- ۸

باب اول: ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات ۹- ٦٦

- نوآبادیات: تفہیم وتشریح
- انگریزوں سے پہلے کا ہندوستان
- ہندوستان کو مسلم حکمرانوں کی دین
- ہندوستان برطانوی نوآبادیات کی زد میں
- ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات
- اردو صحافت کا نوآبادیات مخالف رویہ

باب دوم: اودھ پنچ کا اجرا، اس کے نمائندہ قلم کار اور ہندوستان کا سماجی، سیاسی و معاشی پس منظر

٦٧ - ۱۳۲

- اودھ پنچ کا اجرا: ایک تعارف
- اودھ پنچ کے نمائندہ قلم کار اور ان کی تحریریں
- اودھ پنچ کا صحافتی دور اور ملک کا سیاسی، سماجی و معاشی پس منظر

باب سوم: نوآبادیاتی سیاسی و معاشی پالیسی اور اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ ۱۳۳- ۲۱۲

- انگریزوں سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی حالت

- مسلم حکمرانوں کے دور میں ترقیاتی اقدامات
- برطانوی حکمرانوں کی سیاسی پالیسی اور حکمت عملی
- ہندوستانی معیشت پر برطانوی اثرات
- برطانوی سیاسی و معاشی پالیسی کے خلاف اودھ پنچ کا مزاحمتی کردار

باب چہارم: نوآبادیاتی تہذیبی اور معاشرتی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ ۲۱۳- ۲۶۰

- انگریزوں سے پہلے ہندوستانی معاشرت
- انگریزوں کے ذریعہ تہذیبی و معاشرتی تبدیلیاں
- ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر انگریزی حملہ کے خلاف اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ

باب پنجم: نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ ۲۶۱- ۳۱۱

- انگریزوں سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی صورت حال
- انگریزی دور اقتدار میں ہندوستان کی تعلیمی حالت
- مسلم دور حکمرانی میں روزگار کی حالت
- انگریزی دور اقتدار میں روزگار کی حالت
- برطانوی تعلیمی و ملازمتی پالیسی کے خلاف اودھ پنچ کا رویہ

حاصل مطالعہ ۳۱۲- ۳۲۱

کتابیات ۳۲۲- ۳۳۰

پیش لفظ

ہندوستان اپنی صنعت و حرفت، زرعی پیداوار اور تجارت کے اعتبار سے شروع ہی سے اہمیت کا حامل رہا ہے، اسی وجہ سے دیگر ممالک کے بہت سے لوگوں اور کمپنیوں نے تجارتی مقاصد کے پیش نظر یہاں کا رخ کیا اور یہاں کے لوگوں اور حکمرانوں نے ان سب آنے والوں کا استقبال کیا اور انہیں ہر طرح کی اعانتیں اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان ہی غیر ملکی کمپنیوں میں برطانیہ سے آنے والی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' بھی ہے جسے مغل حکمراں جہانگیر کے عہد میں تجارت کی منظوری دی گئی، اس کمپنی کے مالک اور اس سے منسلک دیگر عہدیداران انگریز تھے، جن کا مقصد اصلی تجارت کے پس پردہ یہاں کی حکومت پر قابض ہونا تھا اور وہ اول دن سے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے خاکے اور منصوبے تیار کرنے لگے۔ اس خواب کی تعبیر دکن میں سلطان ٹیپو کی شہادت اور جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد ملنی شروع ہوگئی۔ بنگال پر تسلط کے بعد ملک کے دیگر حصوں کا استحصال بھی شروع ہوگیا اور ہندوستان کی دولت انگلستان منتقل ہونے لگی، انگلستان سے تیار شدہ مال ہندوستانی بازاروں میں بڑی تعداد میں فروخت ہونے لگا اور ہندوستان کی صنعت و حرفت تباہ و برباد ہوتی چلی گئی اور ہندوستان صرف ایک زرعی ملک بن کر رہ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح ہندوستان برطانوی نوآبادیات کا حصہ بن گیا اور یہاں سے ہندوستانی باشندوں اور یہاں کے مال و متاع کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا ایک روح فرسا دور شروع ہوگیا۔

یورپ کے جن ممالک نے ہندوستان میں آکر تجارت کے پس پردہ اپنی نوآبادیات قائم کرنے کی کوشش کی ان میں پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز خاص طور سے قابل ذکر ہیں، لیکن ان میں سے انگریز ہی ہندوستان میں اپنی نوآبادیات قائم کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ انگریزوں نے ہندوستانی باشندوں پر اپنی سماجی، سیاسی اور تہذیبی برتری قائم کرنے کے

لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے، انہوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان مذہب کے نام پر ہندو مسلم میں تفریق پیدا کی تو دوسری طرف ایک ہی مذہب کے لوگوں کو مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا، کیوں کہ ان کے متحد ہونے سے ان کی حکومت کو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو کہیں ذات کے نام پر تو کہیں علاقے کے نام پر بھی لڑانے کی کامیاب کوشش کی۔ انگریز حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں اور ان کی تہذیب و تمدن کو غیر مہذب اور غیر شائستہ کہہ کر انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھا، مقامی باشندوں کے اوپر یورپ سے لائی گئی تہذیب و تمدن کو تھوپنے، اپنی نسلی، سماجی و سیاسی برتری کو قائم رکھنے اور اپنی عنان حکومت کو بنائے رکھنے کو نوآبادیات کا نام دیا۔ نوآبادیت پر حکومت کے زعم میں طرح طرح کی بندشیں عائد کیں اور نئے نئے قوانین نافذ کیے جن کی مدد سے ان کا برابر استحصال کیا جاتا رہا اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا گیا۔

نوآبادیاتی نظام کا مطالعہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دیگر ممالک پر بھی اپنی شہنشاہیت کا سکہ جما کر عوام کو طرح طرح کے مسائل سے دوچار کیا۔ سیاسی، اقتصادی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے ان کا استحصال کیا۔ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے جب جب عوام کی طرف سے بغاوت کا علم بلند کیا گیا، حکومت نے بڑی بے دردی اور ظلم و زیادتی سے اسے دبا دیا۔ ہر موقع پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے نوآبادیاتی ہندوستان میں حکومت کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ ان حالات میں مختلف تنظیموں، اداروں اور گروہوں کے ذریعہ اس کی مخالفت اور موافقت دونوں کا سلسلہ جاری رہا۔ برطانوی جارحیت اور نوآبادیاتی طرز حکومت کے خلاف اردو صحافت نے نمایاں کردار ادا کیا، جن اخبارات نے صحافتی دیانت داری کو اپناتے ہوئے قابل تعریف مزاحمتی کارنامہ انجام دیا ان میں اودھ پنچ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

اودھ پنچ ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو لکھنؤ سے جاری ہوا اور ۱۹۳۴ء میں بند ہو گیا، یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ یہ اپنے طرز کا پہلا اخبار تھا جس نے صحافت کی عام روش سے ہٹ کر طنز و ظرافت کا لب و لہجہ اختیار کیا اور سب سے پہلے نہ صرف

اردو صحافت بلکہ اردو ادب میں مغربی طنز و ظرافت کو رواج دیا۔ یہ اخبار نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اس وقت قومی اخبار تھا اور قومی خدمت کی غرض ہی سے نکالا گیا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت کے ابتدائی ایام ہی میں عوام و خواص کے درمیان اسے شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی اور ملک کے کونے کونے میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس اخبار کے مدیر اور بانی منشی سجاد حسین نے اپنی قلمی طاقت کے ذریعہ نو آبادیاتی طرز حکومت اور اس کے مضر اثرات سے ہندوستانیوں کو آگاہ ہی نہیں کیا بلکہ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر روح پھونک دی۔ انگریزوں کی طرف سے سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی حملوں کا اس اخبار نے بھرپور مقابلہ کیا اور انگریز حکمرانوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے ساتھ کی جانے والی تفریق اور ظلم و زیادتی کو ہدف تنقید بنایا۔

اس موضوع سے متعلق موجود مضامین اور کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ پنچ کی صحافتی حیثیت اور اس کی ادبی خدمات کا جائزہ اوّلاً تو بہت ہی کم لیا گیا ہے اور جن حضرات نے اپنی تحریروں میں اسے جگہ دیا، ان میں اکثر و بیشتر حضرات نے اس کے صرف ایک پہلو کا مطالعہ کیا، انہوں نے صرف اس کے پیرایۂ اظہار کا جائزہ لیا اور اردو ادب اور صحافت میں طنز و ظرافت کے اضافہ کی حیثیت سے ہی اس اخبار کا جائزہ لیا۔ بلا شبہ اردو ادب کو طنز و ظرافت کی شکل میں اس اخبار کے ذریعہ ایک عظیم تحفہ ملا اور اس نے اردو ادب کے سرمایہ میں مغربی طنز و ظرافت کے باب کا باقاعدہ آغاز کیا، لیکن یہ اس کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کر کے اس کے دوسرے پہلوؤں کو نظرانداز کرنا اس اخبار کے ساتھ اور اس کے بنیادی مقصد کے تئیں ناانصافی ہو گی۔ نو آبادیاتی ہندوستان میں ادبی باریکیوں اور صحافتی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتے ہوئے نو آبادیات مخالف کردار اودھ پنچ کی صحافت کا زریں باب ہے۔ لہذا اس تحقیقی مقالہ کے ذریعہ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس اخبار کے نو آبادیات مخالف کردار کو سامنے لایا جائے۔ نو آبادیاتی جارحیت اور مغرب زدگی کی مخالفت اس اخبار کا نصب العین تھا اور اس سے اس اخبار نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، لہذا اس مقالہ میں ان ہی گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قدیم اخبارات ورسائل پر تحقیق کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔ چوں کہ ان کی فائلوں تک رسائی بہت ہی مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتی ہے۔ محدود وقت اور محدود وسائل کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک کی مختلف لائبریریوں اور اداروں سے استفادہ مشکل ہوتا ہے، جب کہ اس طرح کے کام کے لئے ہر اس جگہ کا سفر کرنا ضروری ہے جہاں سے اس موضوع پر کسی بھی طرح کے تعاون کی امید ہو۔ ایسا ہی کچھ معاملہ میرے ساتھ بھی رہا۔ جہاں تک اس موضوع سے متعلق ثانوی ماٰخذ تک رسائی کی بات ہے تو اس میں زیادہ دقتیں نہیں اٹھانی پڑیں لیکن بنیادی ماٰخذ کے طور پر اودھ پنچ کی فائلوں تک رسائی میں بڑی دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اودھ پنچ چونکہ کافی قدیم اخبار ہے اور اس کی فائلیں منتشر حالت میں مختلف اداروں اور لائبریریوں میں ہیں، کہیں بھی اس کی تمام فائلیں یا اکثر فائلیں موجود نہیں ہیں اور جہاں ہیں بھی وہ بڑی بوسیدہ حالت میں ہیں، انتہائی تگ و دو کے بعد اودھ پنچ کی اکثر فائلوں تک رسائی حاصل کر کے ان سے استفادہ ممکن ہو سکا۔ اس سلسلہ میں میں نے دہلی اور بیرون دہلی کی مختلف جامعات اور لائبریریوں سے استفادہ کیا اور ہر جگہ منتظمین و کارکنان نے ممکنہ تعاون پیش کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

ہم نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، ان سبھی ابواب کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

باب اول: ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے اثرات

مقالہ کا یہ ابتدائی باب ہے، اس میں اولا نو آبادیات کی اصطلاح کی تفہیم و تشریح کی گئی ہے۔ انگریزوں سے پہلے کے ہندوستان کے مختصر حالات اور اس کے بعد ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے تحت وجود میں آنے والے اثرات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر ہندوستان میں مختلف اثرات مرتب ہوئے، لہذا تہذیبی و سماجی اثرات، سیاسی اثرات، مذہبی اثرات اور معیشتی اثرات جیسے موضوعات کو سامنے رکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نظام حکومت کی وجہ سے کیا نتائج مرتب ہوئے اور ان کے نقصانات درج بالا امور پر کس طرح مرتب ہوئے اور اردو صحافت کا اس ضمن میں کیا رویہ رہا۔

باب دوم:　　اودھ پنچ کا اجرا، اس کے نمائندہ قلم کار اور ہندوستان کا سماجی، سیاسی و معاشی پس منظر

اس باب کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اودھ پنچ کا اجرا کب اور کن حالات میں عمل میں آیا اور اس کی اشاعت میں کیا مقاصد اور عوامل کار فرما تھے اور اپنی اشاعت کے اول روز ہی سے اس نے اپنے بنیادی مقصد اور مطمح نظر کے پیش نظر کس طرح حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد اس اخبار کے چند نمائندہ قلم کاروں کا تعارف اور ان کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش کیے گئے ہیں تاکہ اخبار کے رجحان اور اس کی صحافتی حیثیت کو متعین کیا جاسکے اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ ان قلم کاروں نے کس طرح اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریز حکمرانوں کی ظلم و زیادتی کے خلاف لکھ کر اپنی صحافتی دیانتداری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد اس پس منظر کو بیان کیا گیا ہے جس میں اودھ پنچ کی اشاعت عمل میں آئی، جس وقت اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا اس وقت ملک تاریخ کے بڑے نازک دور سے گذر رہا تھا، دو متضاد تہذیبوں اور قوموں کے اختلاط نیز ایک نئے طرز حکومت کی وجہ سے اس وقت کے سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات بے ہنگمی اور بے رہ وری کا شکار تھے۔ اس باب میں ان امور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب سوم:　　نوآبادیاتی سیاسی و معاشی پالیسی اور اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ

اس باب میں ان امور سے بحث کی گئی ہے جن کا تعلق ملک کی سیاسی و معاشی صورت حال سے ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی صورت حال کیا تھی اور انگریزوں کے حصول اقتدار کے بعد ملک کی سیاسی و معاشی فضا کس طرح بدلی اور انہوں نے ملک کے سیاسی و معاشی امور میں کس طرح دخل اندازی کی۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کو کنگال بنا کر یہاں کے مال و متاع کو برطانیہ منتقل کرنے کے لئے کیا کیا پالیسیاں وضع کیں اور کس طرح سے یہاں کے مال و دولت کو بے دریغ خرچ کر کے ہندوستان کو معاشی ابتری کا شکار بنایا۔ نتیجتاً یہاں کا سماج کس طرح پریشانی اور بے چینی کی صورت حال سے دوچار ہوا۔ ان سیاسی و معاشی امور کے حوالے سے اودھ پنچ کا کیا ردعمل تھا اور ملک کی

معاشی تنزلی اور سیاسی صورت حال پر اس نے اپنے صفحات میں کس طرح کا مزاحمتی کردار نبھایا، اس باب میں درج بالا امور سے بحث کی گئی ہے۔

باب چہارم: نوآبادیاتی تہذیبی اور معاشرتی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ

اس باب کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ہندوستان انگریز حکمرانوں کی نوآبادی میں داخل ہوا، اس سے قبل ملک کی تہذیبی و معاشرتی صورت حال کیسی تھی۔ ہندوستان اپنی تہذیب و ثقافت اور نظام معاشرت کے اعتبار سے کس امتیازی شان کا حامل تھا۔ اس وقت کے سماج کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور ملنے جلنے کا کیا انداز تھا، لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد دو تہذیبوں کا تصادم ہوا اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو ختم کر کے یہاں انگریزی کلچر کو رواج دینے کے لئے انگریزوں نے جس طرح کی پالیسی وضع کی اور پھر اس ضمن میں انھوں نے جو اقدام کئے، اس باب میں ان امور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دو الگ الگ تہذیبوں کے تصادم کی وجہ سے یہاں کے باشندوں میں کس طرح کی بے چینی اور اضطرابی کی کیفیت پیدا ہوئی اور اودھ پنچ نے اس ضمن میں کیا کردار ادا کیا۔

باب پنجم: نوآبادیاتی تعلیمی و ملازمتی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ

مقالہ کا یہ آخری باب ہے۔ اس باب کے تحت یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے قائم ہونے سے پہلے ہندوستان کا تعلیمی نظام اور ہندوستانی باشندوں کی تعلیمی حالت کیسی تھی اور برطانوی اقتدار کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی باشندوں کی تعلیمی و اقتصادی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس ضمن میں کیا اقدامات کئے۔ تعلیم اور ملازمت کے حوالے سے ہندوستانیوں کی ترقی کے لئے انھوں نے کیا پالیسیاں اپنائیں اور پھر یہاں کے باشندوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم ہی کے ذریعہ کوئی بھی قوم اپنے نفع و نقصان کو صحیح طور پر سمجھ پاتی ہے اور کسی بھی قوم کی ترقی و تنزلی اس کی تعلیمی صورت حال پر ہی منحصر ہے۔ کسی بھی قوم اور کسی بھی ملک کے باشندوں اور

خاص کر نوجوان نسل کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اسے بہتر سے بہتر ملازمت کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ چنانچہ اس باب میں اسی حوالے سے اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریز حکمراں اس ملک کے مال و دولت سے اپنے اقتصادی حالات کو سدھار کر اپنے ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لئے فکرمند اور کوشاں رہے اور ہندوستانی صنعت وزراعت کو برباد کر کے اپنے ملک کو دنیا کا عظیم ترقی یافتہ ملک بنادیا، لیکن ہندستانیوں کی ترقی اور خوش حالی کے لئے انھوں نے کیا تعلیمی اور ملازمتی اقدامات کئےاور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ نیز انگریز حکمرانوں نے ہندوستانیوں کے تعلق سے جو بھی تعلیمی اور ملازمتی پالیسی بنائی اور اس پر جو بھی اقدامات ہوئے اس سلسلے میں اودھ پنچ کا کیا رویہ رہااور اس نے اس ضمن میں کیا کردار ادا کیا۔

اس مقالے کی تیاری کے دوران بہت سے کرم فرماؤں کی عنایتیں اور مفید مشورے میرے شامل حال رہے، یہاں ان سب کا شکر و سپاس میرا اخلاقی فریضہ ہے، چند مخلصین و مشفقین اور رفقاء وہ ہیں جن کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ سب سے پہلے اللہ رب العزت کے بے پایاں احسانات کی شکر گزاری کے بعد اپنے والدین کا سراپا ممنون و شکر گزار ہوں جن کی محبت و شفقت کا کوئی بدل نہیں۔ مجھے اس وقت شدت کے ساتھ اپنے والد مرحوم و مغفور کی یاد آرہی ہے جو اس ریسرچ کے دوران ہم سب گھر والوں کو صدموں سے نڈھال چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جاملے، اللہ پاک انہیں کروٹ کروٹ آرام و سکون عطا فرمائے۔ رب کریم کے فضل سے کائنات کی عظیم نعمت والدہ محترمہ کی شفقت و محبت ابھی حاصل ہے، اللہ ان کے سایۂ عاطفت کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر قائم رکھے اور انہیں دارین میں اجر جزیل عطا فرمائے۔ اسی کے ساتھ اپنے بڑے بھائی مولانا محمد ثناءاللہ قاسمی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تعلیم وتربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا، وہ میرے تعلیمی سفر کو جاری رکھنے میں ہر طرح کا تعاون پیش کرتے رہے اور میری ہر کامیابی کو اپنی ذاتی کامیابی سمجھ کر خوشی و مسرت کے پھول لٹاتے رہے۔ شکر گزاری کے یہ الفاظ ان کے خلوص اور محبت کا بدل نہیں ہو سکتے۔

میں سراپا ممنون اور صمیم قلب سے شکر گزار ہوں اپنے مشفق اور کرم فرما استاذ محترم اور میرے اس تحقیقی مقالے کے نگراں پروفیسر مظہر مہدی کا جنہوں نے میرے لئے اس اہم موضوع کا انتخاب فرمایا اور مجھے اس پر کام کرنے کا سنہری موقع عنایت فرمایا۔ اس مقالے کی تیاری کے دوران اپنے تعاون نیز مفید اور گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہے اور ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے رہے جن کی بنا پر میں اس مقالے کو بحسن و خوبی مکمل کر سکا۔ اپنے سینٹر کے دیگر اساتذۂ کرام کا بھی شکریہ ادا کرنا میرا خوش گوار فریضہ ہے چوں کہ ان حضرات کی توجہات اور مشوروں کی بدولت میرا علمی سفر جاری ہے۔

دوستوں میں سب سے پہلے اپنے مخلص ترین دوست حفظ الرحمن قاسمی کا شکر گزار ہوں جن کا تعاون مختلف انداز میں مجھے حاصل رہا، ان کی بے لوث محبت اور خلوص کا مجھے ہر لمحہ احساس رہتا ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں معین الدین، فاروق اعظم قاسمی، جاوید اقبال اور عبید الکبیر جیسے رفقاء اور مخلص احباب کا تذکرہ نہ کروں جن کے مفید مشورے اور تعاون مجھے حاصل رہے۔ اس پُر مسرت موقع پر اپنی شریک حیات کا بھی شکر گزار ہوں جو ہر ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں اور مجھے خانگی ذمہ داریوں سے فارغ رکھ کر اس مقالے کی تیاری کے لئے درکار یکسوئی فراہم کرتی رہیں۔ انہوں نے میرے لئے خوشیوں اور مسرتوں کا سامان فراہم کرنے والے اور میرے قلب و جگر کو معطر رکھنے والے میرے لخت جگر عمار اور ریان کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داریوں کو بخوشی اپنے سر لے کر مجھے اس علمی کام کے لئے فارغ رکھا، اللہ ان تمام کی محبتوں اور عنایتوں کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

رضی احمد

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

باب اول

ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات

- نوآبادیات: تفہیم و تشریح
- انگریزوں سے پہلے کا ہندوستان
- ہندوستان کو مسلم حکمرانوں کی دین
- ہندوستان برطانوی نوآبادیات کی زد میں
- ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات
- اردو صحافت کا نوآبادیات مخالف کردار

ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات

نوآبادیات: تفہیم وتشریح

نو آبادیات بمعنی مقبوضات جمع ہےاس کا مفرد نوآبادی ہے ۔ انگریزی زبان میں اس کے لیےColonialism کا لفظ مستعمل ہے، Colonialism کا لفظ Colony سے ماخوذ ہے جس کا ایک معنی جس کے ذریعے اس کے مفہوم کو سمجھنا آسان ہے وہ 'Oxford Advanced Learner's Dictionary'کے مطابق یہ ہے: A country or an area that is governed by people from another more powerful country. (کوئی ایساملک یاعلاقہ جہاں پر کسی دوسرے زیادہ طاقتور ملک کے لوگوں کی حکمرانی ہو۔) آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی اس تشریح کی روشنی میں Colonialism کی اس لفظی تحقیق سے اس کی اصطلاح کو سمجھنااوراس کی تفہیم وتشریح آسان ہو جاتی ہے۔ آسان لفظوں میں مختصرانوآبادیات کی تشریح ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے: "کسی بھی ملک یاکسی علاقے پراس ملک یاعلاقے کے مقابلے میں زیادہ طاقتور کسی دوسرے ملک کی حکومت یاعوام کااس انداز میں قبضہ کر لیناکہ اس مقبوضہ ملک کے ہر طرح کے معاملات پراس قابض ملک کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور وہ اپنے انداز میں اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرے، جس طرح چاہے محکوم عوام کااستحصال کرے اور مقبوضہ ملک کی دولت وصنعت کواپنے مفاد کے لیے اپنے طور پر استعمال میں لائے، نوآبادیات کہلاتا ہے۔" اس عمومی تشریح کو اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کے تناظر میں دیکھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کا تجارت کی غرض سے ہندوستان میں آکر شاطرانہ وعیارانہ چالوں سے یہاں کے تخت وتاج پر قابض ہو جانااور یہاں کی عوام کا استحصال کرتے ہوئے یہاں کی دولت کواپنے مفاد کے لیے استعمال کرناہندوستان کے لیے برطانوی نوآبادیات کہلاتا ہے۔

کسی بھی ملک پر دوسرے ملک کی حکومت یا عوام کا اس طرح قابض ہو جانا کہ اس مقبوضہ ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات پر قابض ملک کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور اسی کی حکمرانی ہو، وہ جس طرح چاہے محکوم عوام کا استحصال کرے اور اس ملک کی دولت و ثروت کو اپنے حصول مفاد کے لئے اپنے طور پر استعمال میں لائے، نو آبادیات کہلاتا ہے۔ اس کی مزید تشریح و توضیح ہمیں پروفیسر مظہر مہدی کی اس عبارت میں ملتی ہے:

> نسل، تہذیب، معیشت اور ٹکنالوجی کے معاملات میں 'برتر' اور ترقی یافتہ سمجھی جانے والی غیر ملکی اقلیت بالخصوص یوروپیوں کا ان ہی معاملات میں 'کم تر' اور پس ماندہ خیال کی جانے والی مختلف نسل کی اجنبی اکثریت علی الخصوص افریقی اور ایشیائی معاشروں کو سیاسی، معاشی، تہذیبی اور دانشورانہ محکومی کی حالت میں اس وقت تک رکھنا جب تک کہ وہاں کے عوام اس حکومت کے خلاف قوم پرست تحریک چھیڑ کر اپنے ملک کو آزادانہ کرالیں، نو آبادیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔[1]

پروفیسر مظہر مہدی کی اس تشریح سے پتہ چلتا ہے کہ نو آبادیات کا مطلب یہ ہے کہ ایک ملک جو اپنے آپ کو مختلف جہات مثلاً نسل، تہذیب، معیشت اور جدید ٹکنالوجی وغیرہ کے اعتبار سے برتر اور ترقی یافتہ سمجھتا ہے وہ ایک ایسے ملک پر قابض ہو کر اسے اپنی محکومی میں رکھتا ہے جسے وہ مذکورہ بالا امور میں کم تر اور پس ماندہ خیال کرتا ہے، اور یہ غیر ملکی اقلیت اس محکوم معاشرہ اور قوم کو اس وقت تک اپنی محکومی میں رکھتی ہے جب تک کہ وہاں کی عوام اس نظام حکومت اور افراد حکومت کے خلاف قومی تحریک چھیڑ کر اور جان و مال کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو آزادانہ کرالیں۔ نو آبادیات کے حوالے سے ہی پروفیسر مظہر مہدی نے اسی کتاب میں مشہور مؤرخ بپن چندر کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر ملکی حکمراں طبقہ کا وہ نیا رشتہ جو وہ اس محکوم ملک کے لوگوں کے ساتھ قائم کرتا

---

[1] مظہر مہدی، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نو آبادیاتی ہندوستان، ص ۱۳

ہے جسے وہ ملکی یا طبقاتی امتیاز کا حامل نہیں سمجھتا، نو آبادیات کہلاتا ہے۔ اس نو آبادیاتی طرز حکومت میں ملک کے دولت مند طبقے کو غیر ملکی حکمراں طبقہ اقتدار میں شریک نہیں کرتا، اس طرح وہ محکوم طبقہ حکمران جماعت کا حصہ بننے کے بجائے مکمل طور پر اس کا محکوم ہوتا ہے اور حکمراں طبقہ پوری محکوم آبادی کا استحصال کرتا ہے، محکوم ملک کی معیشت اور وہاں کے مال و دولت کو اپنے ملک کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد اور مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نو آبادیات کی مزید وضاحت اسی کتاب میں آگے مذکور ہے، جسے مصنف نے معروف ہندوستانی مؤرخ بپن چندرا کے خیالات اور اس کی تحریر سے اخذ کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ... گویا نو آبادیات حاکم اور محکوم کے قدیم اور روایتی رشتے کے برعکس اس نئے رشتے کا نام ہے جو کوئی غیر ملکی حکمراں طبقہ ایسے لوگوں کے ساتھ قائم کرتا ہے جو اس کے نزدیک کسی ملکی یا طبقاتی امتیاز کے حامل نہیں ہوتے۔ اس رشتے کی رو سے یہ محکوم آبادی، نو آبادی کہلاتی ہے اور یہ حکمراں طبقہ پوری محکوم نو آبادی کا استحصال کرتا ہے اور وہاں کی معیشت اور معاشرہ کو اپنے ملک (ہندوستان کے مقابلے میں برطانیہ) کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد کے حصول کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔[1]

نو آبادیات کے حوالے سے مذکور درج بالا تحریر سے نو آبادیات کی تشریح و توضیح، اس کے طریقہ کار اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ضرر رساں طرز حکومت سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں غیر ملکی حکمراں طبقہ اس محکوم ملک کے باشندوں کی تہذیب و ثقافت اور معاشرتی امور میں دخل اندازی کر کے انہیں ختم کرنا اور اپنے ملک کی تہذیب و معاشرت کو اس نو آبادی میں نافذ کرنا چاہتا ہے، اس طرح محکوم ملک کی معیشت کو اپنے ملک کے مفاد کو ترقی دینے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

---

[1] مظہر مہدی، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نو آبادیاتی ہندوستان، ص ۱۳

نوآبادیات کے حوالے سے ڈاکٹر ظفر امام نے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

دنیا کی تاریخ میں جابر قوموں نے ہمیشہ کمزور اور پسماندہ قوموں کو غلام بنا کر ان پر ظلم ڈھائے ہیں، یہ عمل تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی شروع ہو چکا تھا، لیکن نوآبادیات اور نیم نوآبادیات کی غلامی اپنی نوعیت میں بے مثال ہے، اس کا قیام سرمایہ دار ملکوں کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی تیز رفتاری سے منافع کمانے کی ہوس اور خود اندرون ملک کے سرمایہ دارانہ نظام میں اس رفتار سے منافع حاصل ہونے کی اہلیت کے کم ہونے سے ہوا، نوآبادیات اور نیم نوآبادیات کے قائم ہونے کے ابتدائی دور میں سرمایہ دار ملکوں کے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنی فیکٹری کی بنی ہوئی اشیاء کا نوآبادیات اور نیم نوآبادیات کے خام مال اور گھریلو دستکاری کے تیار شدہ مال سے براہ راست تبادلہ کرتے اور اس طرح ان کو منافع حاصل ہوتا۔[1]

پروفیسر مظہر مہدی نے G. Balandier کے اس خیال کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دی ہے جس میں انہوں نے نوآبادیاتی نظام میں حکمراں جماعت اور محکوم طبقہ کے درمیان حاکم اور محکوم رعایا کے رشتہ کو بتایا ہے۔ اس نظام میں حکمراں طبقہ محکوم عوام کو کسی بھی طرح سے توجہ کا مستحق نہیں سمجھتا اور ان سے میل جول اور ربط و تعلق قائم نہیں کرتا۔ G. Balandier کے خیال کو پروفیسر مظہر مہدی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

G. Balandier کا خیال ہے کہ نوآبادیاتی معاشرے میں حکمران طبقہ خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے، اس غرض سے وہ نوآبادیاتی میں لوگوں سے کم سے کم رابطہ رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ محکوم لوگوں پر اپنا رعب، دبدبہ اور غلبہ برقرار رکھ سکے، اس سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے اس میں باہمی مفاہمت اور ایک دوسرے کی قدر کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی، وہ اگرچہ خود کو لوگوں کے لیے پیروی کے قابل بنا کر پیش کرتا ہے لیکن عملاً وہ اس پیروی کی تمام راہیں

[1] ظفر امام، مارکسزم ایک مطالعہ، ص ۱۰۳

مسدود کر دیتا ہے، وہ طبقہ ایسے نظریوں کی حمایت کرتا ہے جو غالب گروہ کی حیثیت کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں اور ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جو نو آبادیاتی اقتدار کے استحکام کو تقویت بخشی ہے۔[1]

مندرجہ بالا تشریح سے اس نظام حکومت کی خرابیوں اور ظلم واستحصال کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس نظام میں حکمراں طبقہ محکوم ملک کے باشندوں کو اپنے آہنی پنجوں میں لا کر ان کا بڑی تیزی سے استحصال کرتا ہے۔ نو آبادیات دراصل ایک دریا کی مانند ہے جو عالمی سرمایہ داری کی آبیاری کرتا رہتا ہے، اگر اس کا رخ بدل دیا جائے یا یہ دریا سوکھ جائے تو اس نظام کو بہت بڑا نقصان پہنچے گا۔ تاریخ عالم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ اور سرمایہ دار ملک مثلاً برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور جاپان نے اپنے اپنے نو آبادیات کا بلا روک ٹوک استحصال کر کے بے انتہا مال و زر اپنے اپنے ملکوں کے لئے جمع کیا، سچ تو یہ ہے کہ ان مذکورہ ملکوں کی موجودہ خوش حالی اور زود رفتار صنعتی ترقی نو آبادیات کا خون چوس کر ہی ہوئی ہے اور ان کے زیر اثر محکوم ممالک کی تنزلی اور پسماندگی بھی اسی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ ہے۔

اس نظام کے تحت حکمراں طبقے (انگریزوں) نے محکوم ملک (ہندوستان) کا پوری طرح استحصال کیا۔ یہاں کے مال ودولت کو اپنے ملکی مفاد کے لئے بے دریغ استعمال کیا، یہاں کی معیشت کو تباہ و برباد کیا، فیکٹریاں، ملیں، کارخانے اس لئے نہیں قائم کئے کہ ان کے ذریعے ہندوستان کی ترقی ہو بلکہ یہاں کے خام مال اور مزدوروں کی محنت کو سستی قیمتوں پر حاصل کر کے سرمایہ دارانہ ذہنوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ملک برطانیہ کی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ ہندوستان کی معیشت کو لوٹ کھسوٹ کر برباد کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب و تمدن اور اقدار و روایات پر حملے کئے گئے اور مغربی تہذیب کو پھیلانے اور عام کرنے کے سارے طریقے استعمال کئے گئے۔ عیسائی مذہب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کو اپنے مذاہب بدلنے کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ ترقی یافتہ

---

[1] مظہر مہدی، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نو آبادیاتی ہندوستان، ص ۱۴

ممالک کے ذریعہ محکوم ممالک کے قبضہ کرنے کے پیچھے ان کے جو مقاصد تھے انہیں ڈاکٹر ظفر امام نے یوں بیان کیا ہے:

> نئے ملوں، کارخانوں اور خام مال کی رسد و طلب اور سستی محنت کے استحصال پر پورا قبضہ کرنے کی ہوس میں آہستہ آہستہ ان پسماندہ ملکوں پر یوروپی ملکوں کو پورا سیاسی اقتدار جمانے کی ضرورت محسوس ہوئی اس طرح ان یوروپی ملکوں نے ان پسماندہ ممالک میں ایک نیم ریاست قائم کرلی جو طاقت کے زور پر ان کے عوام پر حکومت کرنے لگی، ان پر حکومت کرنے کا طریقہ سفاکانہ و بے رحمانہ تھا، جس کی بنیاد پولیس، فوج اور ڈنڈا تھی، اس حکومت کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کس طرح ان ملکوں کا پورا استحصال کرنے کے لئے نت نئے طریقے اپنائے جائیں، چنانچہ یہ سارے بدقسمت ممالک یوروپی ممالک کی حکومتوں یعنی ان کے برسر اقتدار طبقے کے غلام ہوگئے اور ان کی ساری ترقی و توسیع کا انحصار ان کے رحم و کرم پر ہوگیا۔[1]

انگریز حکمرانوں کے ذریعہ نوآبادیاتی ہندوستان میں صنعتی اور اقتصادی ترقی کو نہ صرف زبردستی روکنے کی کوشش کی گئی بلکہ یہاں کی گھریلو صنعتوں اور زراعتی نظام کو بھی بڑے خفیہ اور منظم انداز میں جان بوجھ کر ناکارہ اور تباہ کردیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی عوام اور خاص کر مزدوروں اور کسانوں کی معاشی حالت کنگالوں کی سی ہوگئی، کسانوں سے لگان کے نام پر اس کی پیداوار کا بڑا حصہ وصول کرلیا جاتا، سرکار ان زمینداروں کا ساتھ دیتی جو کسانوں پر کمر توڑ لگان لگاتے اور ان ساہوکاروں اور تاجروں کی پشت پناہی کرتی جو طرح طرح سے غریب کسانوں اور مزدوروں کو لوٹتے اور ان کا استحصال کرتے۔ ان حالات میں ملک کی پوری کی پوری آبادی غریبی اور محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور

---

[1] ظفر امام، مارکسزم، ایک مطالعہ، ص ۱۰۴

ہو گئی، بھوک مری اور فاقہ کشی تک کی نوبتیں پہنچ گئیں، بڑے بڑے سرمایہ دار اور زمین و جائداد کے مالک آہستہ آہستہ اس نظام کا شکار ہوتے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ وہ لوگ جن کے درباروں سے روزانہ سینکڑوں لوگوں کی روزی روٹی اور معاش کا سلسلہ جڑا ہوا تھا وہ خود فاقہ کشی کا شکار ہونے لگے، ان کی زمینوں، جائداد اور مال وزر کو ضبط کر لیا گیا اور ملک میں معاشی بدامنی اور سماجی بے راہ روی کا نقشہ ہر طرف دیکھنے کو ملنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر انصاف پسند مؤرخین اور قلم کاروں نے نو آبادیاتی حکومت کی پالیسیوں اور نظام حکومت پر تنقید کی ہے اور اسے ایک ظالمانہ اور متعصبانہ رویہ قرار دیا ہے۔

نو آبادیات کی اصطلاح دراصل یورپ کے صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے معاشی بدلاؤ اور ان کی سماجی و تہذیبی برتری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس صنعتی یا سائنسی انقلاب کے سبب یورپ کے مختلف ملکوں کو اپنے تیار شدہ مال کے لیے نئی نئی تجارتی منڈیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے تجارتی منڈیوں کی تلاش میں ایشیا، افریقہ اور شمالی و جنوبی امریکہ میں اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ ابتدا میں تو انہوں نے تجارت کے لیے اپنی منڈیاں قائم کیں اور سامانوں کے تحفظ کے لیے محفوظ قلعے تعمیر کیے لیکن اس کے پس پردہ ان کے اصل مقاصد ان ممالک پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا تھا، چنانچہ انہوں نے بیشتر ممالک کو غلام بنا کر اپنی حکومتیں قایم کر لیں اور ان کے اوپر اپنی تہذیب و تمدن اور قوانین و ضوابط کو سختی کے ساتھ لاگو کیا۔

نو آبادیاتی نظام دراصل اپنے سے مختلف قوم پر اقتصادی اور سیاسی بالادستی قائم کر کے حکومت بھی کرتا ہے اور استحصال بھی۔ اس نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں حکمراں طبقہ اپنے ہی مفاد کی سوچتا ہے، محکوم کو حکمراں جماعت کا حصے دار کبھی نہیں بناتا، محکوم عوام سے زیادہ رابطہ بھی قائم نہیں رکھنا چاہتا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت سے پہلے بھی شہنشاہیت قائم تھی، لیکن انگریزی حکومت سے بہت مختلف تھی۔ ماقبل کے حکمرانوں نے عوام کو اپنا

سمجھا، یہاں تک کہ شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم کیے۔ نو آبادیاتی حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے استحکام کی خاطر مختلف غیر انسانی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے بھی اپناتی ہے۔

نو آبادیاتی نظام کا اپنا ضابطہ، قانون اور اصول ہوتا ہے۔ محکوم ہر طرح مجبور ہوتا ہے، اگر کہا جائے کہ وہ نہ زندہ ہوتا ہے اور نہ مردہ تو غلط نہ ہوگا۔ قانون سازی میں محکوم کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، لیکن قانون پر چلنا اس کے لیے لازم ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں حکمراں طبقہ عوام سے بہت ربط ضبط رکھتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ حکام محکوم لوگوں پر اپنا رعب ودبدبہ رکھ سکیں۔ اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ حکمراں طبقہ کبھی نہیں چاہتا کہ عوام میں اتحاد رہے۔ مختصر یہ کہ نو آبادیات کی اصل بنیاد اقتصادیات ہوتی ہے۔ مفتوح ملکوں سے دولت کی نکاسی ہوتے رہنے سے محکوم عوام دن بدن غریب ہوتے جاتے ہیں، چونکہ ہندوستان نو آبادی کی شکل میں حکومت برطانیہ کے زیر اثر دو سو برسوں تک رہا اس لیے یہاں بھی انگریزوں نے وہی رویہ اپنایا جو دیگر ممالک میں انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔

نو آبادیاتی نظام حکومت کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ نو آبادی ملک کے معاشی، معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، قانونی اور دیگر جملہ امور میں اس کے ذریعہ کی جانے والی تبدیلیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر اس نو آبادی کی پیداواری صلاحیت کو پوری طرح نچوڑ سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے محکوم عوام پر قسم قسم کے محصولات عائد کرتی ہے۔ اس حکومت کا کردار ہی ایسا ہے کہ وہ رفاہ عام اور فلاح و بہبود کا جو کام بھی شروع کرتی ہے اس کو منطقی نتیجے تک نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ اس کام کے لیے اس کی نیت ہی صاف نہیں ہوتی، اور اس نو آبادی ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے وہ کسی بھی طرح سنجیدہ نہیں ہوتی۔

اپنے اقتدار کی بقا اور تحفظ کی خاطر نو آبادیاتی حکمراں طبقہ یہ مفروضہ پیش کرتا ہے کہ اس کے محکوم معاشرے کا اتحاد اسی حکومت کے تحت ممکن ہے، ورنہ اس کی غیر موجودگی میں یہ معاشرہ منتشر ہو جائے گا۔ اس حکمراں طبقے کے

خیال میں محکوم عوام میں بجائے خود حکمرانی کرنے کی استعداد مفقود ہوتی ہے، یوں ان کو سیاست جیسی چیز سے دور رہتے ہوئے نام نہاد فیض رساں حکومت سے چپ چاپ فیض حاصل کرتے رہنا چاہیے، اس طرح نوآبادیات میں حکمراں طبقے کی نفسیات میں عوام کی تسلیم ورضا کا حصول شامل ہوتا ہے۔ یہ طبقہ عوام کی سیاسی عمل دخل کی پرزور مخالفت کرتا ہے اور ان کو سیاست مخالف آئیڈیولوجی کے دام فریب میں پھنسانے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہے اور جب وہ تمام تدابیر اختیار کرنے کے باوجود عوام کی نوآبادیات مخالف سیاست کاری کا سدباب کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو وفادارانہ محکوم کو باہم تقسیم کرنے والی اور فرقہ وارانہ سیاست کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ نوآبادی میں محکوم عوام کے ابھرتے ہوئے قومی اتحاد کے نہ صرف فروغ کو روکتا ہے بلکہ اس کو توڑنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ حکمراں طبقہ نوآبادیاتی معاشرے کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ محکوم عوام کی نوآبادیات مخالف جدو جہد کو ذات کے خلاف ذات، فرقے کے خلاف فرقے اور کبھی طبقے کے خلاف طبقے کی لڑائی کی شکل دینے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

انگریزوں سے پہلے کا ہندوستان

قدرت نے ہندوستان کو بڑے پیمانے پر بنایا اور نوازا ہے۔ اسی پیمانے کی مناسبت سے اس کو طرح طرح کی فضاؤں سے، رنگ برنگی طبیعتوں سے، مختلف مذاہب اور برادریوں سے اور مختلف رنگ ونسل کے آدمیوں سے آباد کیا ہے۔ یہ ایک دیس بھی ہے اور ایک دنیا بھی۔ اس ملک میں کبھی ایک راج اور ایک دیس کے خیال نے اس کا بل بوتا اتنا بڑھادیا کہ آدھی دنیا میں اس کا سکہ چلتا تھا، کبھی اس کے سینکڑوں راج اور سینکڑوں دیس ہو گئے اور اس کی بے بسی دیکھ کر جس نے چاہا اس کی دولت لوٹی اور جس نے چاہا اس کا مالک بن بیٹھا۔

یوں تو ہندوستان میں مختلف ملک کے باشندوں اور قوموں نے اقتدار کے حصول کی کوشش کی اور بہتوں کو اس میں کامیابی بھی ملی لیکن انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو دیکھیے تو سب سے پہلے آنے والے عرب تھے۔ یہ تجارت کرتے تھے، کاروبار میں کھرے تھے، اس لئے ان کی خاص آؤ بھگت کی گئی، مغرب اور جنوب میں سمندر کے کنارے جو شہر آباد تھے ان میں انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی بسا لیں۔ انہوں نے اپنے اخلاق و کردار، طرز معاشرت اور معاملات میں صفائی اور ایمان داری کی وجہ سے یہاں کے باشندوں پر اچھے اثرات ڈالے۔ جنوبی ہندوستان میں بسنے والے عربوں نے جو اثر ہندوستانی زندگی پر ڈالا اس کی مثال شمالی ہند کی مسلم ریاستوں کی ساری کارگزاری میں بھی نہیں ملتی۔

عربوں کے بعد جو مسلمان ہندوستان آئے وہ ترک تھے اور ان کے آنے کی شان اور تھی۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی ہندوستان ایک راج اور ایک دیس رہ چکا تھا، مگر اتحاد کا جو حوصلہ ترک اپنے دلوں میں لائے وہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ سارے ملک پر ایک جگہ سے حکومت کرنا چاہتے تھے، ان کے جسم کے ٹکڑے ہو جاتے مگر وہ اپنی ریاست کے ٹکڑے نہ ہونے دیتے اور اپنا پرایا جو کوئی بھی اس معاملے میں ضد کرتا اسے وہ زندہ نہ چھوڑتے، سارا ہندوستان ان کے قبضے میں نہیں آیا لیکن جہاں تک ان کا بس چلا انھوں نے متحدہ ریاست کی خاطر مقام، نسل اور مذہب کا فرق مٹا دیا، حکومت کا حق سب پر برابر رکھا اور حکومت پر سب کا حق برابر، چاہے وہ قریب کے لوگ ہوں یا دور کے ۔ حکومت کا جو دشمن ہوتا اسے وہ دشمن سمجھتے چاہے وہ مسلمان ہوتا یا ہندو، اسی طرح وہ دوستی کا بھی حق ادا کرتے، اس میں بھی انہیں نسل اور مذہب سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ان کا حوصلہ کسی ایک شخص کا حوصلہ نہیں تھا، بلکہ ان تمام لوگوں کا جو سمجھ دار تھے اور خود غرض نہ تھے۔ اس میں سمجھیے ان کے دل اور دماغ ڈوبے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں آتے ہی انہوں نے ایک ریاست کی بنیاد رکھی اور اسے بڑھانے اور مضبوط کرنے میں مشغول ہو گئے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر ریاست کو

پھیلایا، لیکن آخر میں یہ بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ ان کے کندھے اسے سنبھال نہ سکے، وہ لڑکھڑا کر گرے اور ان کی ریاست کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔

پھر پٹھان جن کو یہ حوصلہ ورثے میں ملا ہے، اسے پورا کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ شیر شاہ کے زمانے میں شمالی ہندوستان پھر ایک چھت کے سائے میں آگیا اور جب پٹھانوں کی ہمت جواب دینے لگی تو مغلوں نے آکر کندھا دیا، اکبر کے زمانے سے مسلمانوں کی ریاست کا ایک اور قابل ذکر دور شروع ہوا، یہ دوسری ریاست بھی پورے ہندوستان کو ایک راج اور ایک دیس بنانے کی کوشش میں پھلی پھولی اور تباہ بھی ہوئی، اور ترکوں کی طرح مغلوں کو بھی اتحاد کی آرزو نے کامیابی کے عروج پر پہنچا دیا اور پھر اسی نے ان کو مٹا بھی دیا۔

ہندوستان کو ایک ریاست بنانے کا جو حوصلہ مسلمانوں کو تھا، چاہے وہ ترک ہوں یا پٹھان یا مغل، اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس کے پیچھے انھوں نے اپنا پسینہ بھی بہایا اور خون بھی اور بہت سی عداوتیں بھی مول لیں، اس سے جو فائدہ پہنچا وہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس حوصلے نے جنگل کٹوائے، ایسی سڑکیں بنوائیں جو ہندوستان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک جوڑتی تھیں اور ان کے دھاگوں میں سرائے اور ڈاک چوکی، قصبے اور شہر کے دانے پروئے، اس نے تھانے اور چھاؤنیاں بنوائیں اور حکومت کا وہ ڈھانچہ تیار کیا جو ہندوستان کی ترقی اور افتخار کا سبب بنا، صنعت و حرفت اور معاشرت و تہذیب، سب میں ایک ہی دھن پیدا کر دی۔ ترکوں میں اگر یہ حوصلہ نہ ہوتا تو ہندوستان مزید کئی دہائیوں تک تاتاریوں کے ہاتھوں لٹتا رہتا۔ مغلوں میں یہ حوصلہ نہ ہوتا تو ہندوستان بہت پہلے یوروپی نوآبادیوں اور مقبوضات کا حصہ بن گیا ہوتا، وہ تہذیب اور وہ زبان نہ ہوتی جو اس وقت ہمارے اتحاد کا سہارا ہے۔

اتحاد کا یہ حوصلہ خالی سیاسی اتحاد کا حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا، ترکوں اور مغلوں کو ایک ٹھکانے کی تلاش تھی، ہندوستان کو انھوں نے اپنا وطن بنایا اور یہ سمجھ کر رہے کہ یہاں سے بس اب جائیں گے تو اپنے آخری سفر پر ہی جائیں

گے۔ان کی سرکاری زبان تو فارسی رہی، لیکن بول چال کے لیے انھوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں اور ان میں سے ہر ایک کو ادبی زبان کا مرتبہ دیا اور شمالی ہندوستان کی بھاشاؤں کو ملا کر ایک ایسی زبان بنائی جو قومی زبان کہی جا سکتی ہے۔وہ ایسے اوچھے نہ تھے کہ ہر بات کی نقل کرتے اور ایسے تنگ دل بھی نہ تھے کہ دوسروں کی اچھی چیز کو پسند نہ کرتے۔ ہندوستان آتے ہی یہاں کی فضا ان کے دلوں میں سما گئی، زبان کی طرح یہاں کے ہر فن کی انھوں نے قدر کی، ہر صنعت کو ترقی دی، اپنے مذاق کو یہاں کے مذاق میں سمو دیا اور ہر چیز میں ایک وضع نکالی جسے ہم ٹھیٹھ ہندوستانی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہندو مسلم مذاق کا یہ میل امیر خسرو کی ملی جلی فارسی ہندی نظموں، ان کی غزلوں اور پہیلیوں سے شروع ہوتا ہے جب ترکوں کو آباد ہوئے تین پشتیں بھی نہیں گزری تھیں، اور اب وہ ہماری طبیعت اور عادات میں اس طرح کھپ گیا ہے کہ اس پر میل کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ ہندو مسلمان کے میل جول سے نہ کوئی نیا مذہب بنا اور نہ بننا چاہیے تھا لیکن جس طرح صنعت، فن تعمیر، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دونوں کے مذاق نے مل ایک معیار قائم کیا، جیسے دونوں کے میل جول نے گفتگو اور صحبت کے آداب مقرر کیے، ویسے ہی ان کے دلوں نے مل کر انسانیت کا ایک تصور بنایا جس کے سامنے سب کے سر جھکتے تھے اور جو سب کو برابر عزیز تھا۔ انسانیت کا یہ تصور اس زمانے میں بھی ایک سہارا تھا جب کہ مغل سلطنت برباد ہو چکی تھی، اس پر اس وقت بھی اعتبار رہا جب لوگوں نے عام طور سے ایک دوسرے پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکمرانی کا ذکر کرتے ہوئے محمود علی نے بالکل سچ کہا ہے:

> انگریزی تعلیم، یورپی تہذیب اور اس تجارتی مال نے، جو اس یقین کے ساتھ ہمارے بازاروں میں بھر دیا جاتا تھا کہ ہم اسے جھک مار کر خریدیں گے، ان باتوں کو بھلا دیا جو ہندوستان کو اس خالص ہندوستانی تہذیب نے سکھائی، ان چیزوں کو ہماری نظر سے چھپا دیا جو اس نے بنائی۔ ہم بھول گئے ہیں کہ دری اور قالین، چلمن اور پردہ، حوض، فوارہ اور چبوترہ، سلفچی، دستر خوان

اور پلیٹیں، لوٹا اور صراحی، جوتے اور ٹوپی اور سلے ہوئے کپڑوں کا عام رواج، ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کی رسم، مکان کی وہ تقسیم جس میں ملاقات کے لیے ایک الگ حصہ ہوتا ہے اور خلوت کا الگ، وہ صحبتیں کہ جن میں غیروں کی قدر اپنوں سے زیادہ کی جاتی ہے، وہ دعوتیں کہ جن میں ہر ذات اور پیشے کے لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے ہیں، تعلیم حاصل کرنے کا عام حق، اپنے جوہر دکھانے کا سب کے لیے یکساں موقع، یہ ساری باتیں مسلمانوں کے ساتھ آئیں اور ہندوستانی تہذیب میں کھپادی گئیں، نئی چیز کا شوق بھی انھیں نے پیدا کیا، رہن سہن میں بھی تکلف اور نفاست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی اور گھریلو زندگی اور میل جول ہر ممکن طریقہ سے سنوارا گیا۔[1]

ہندوستان کو مسلم حکمرانوں کی دین

مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کے بعد یہاں کے لوگوں کے دل جیتنے اور ہندوستان کی عظمت اور اس کو جنت نشاں بنانے کی مختلف کوششیں کیں، یہاں کے باشندوں سے اچھے نظام سلطنت کے ذریعہ میل جول بڑھایا، وہ بخوبی جانتے تھے کہ نظام سلطنت کو ہندوؤں کی حصہ داری کے بغیر کامیاب نہیں بنایا جا سکتا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان کی ثقافتی اور تمدنی زندگی میں اشتراک پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، یہاں کی سماجی اور مذہبی زندگی میں کسی بھی طرح کی مداخلت نہیں کی۔ بغاوت اور سازشوں کو دبانے میں ہندو فوجی سرداروں کو بھی سربراہ بنایا، فوج میں برابر کے شریک کیے، شادی بیاہ کے رشتے قائم کیے، یہاں کے رسم و رواج اور تہواروں کا احترام کیا، مسلمان اپنے ساتھ مساوات، علوم و فنون، تہذیب و تمدن کا سرمایہ لے کر ہندوستان آئے جس کو مسلمانوں نے یہاں کے باشندوں میں پوری فیاضی کے ساتھ لٹایا، مسلمانوں نے یہاں کے چپہ چپہ سے محبت کی اور اپنے جذبۂ عشق کی سجدہ

---

[1] محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص ۲۴

گاہ بنایا، انہوں نے ہندوستان کو آریوں کی طرح مادرِ وطن کا پر عظمت مقام دے دیا، اس کی خدمت ان کا فرض بن گیا اور اس کی حفاظت واحترام مسلمان حکمرانوں کا سرمایۂ افتخار بن گیا۔

ہندوستان کی عزت اور شان و شوکت تمام دنیا میں مثل دیگر آزاد اقوام کے ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی تھی۔ یہاں کے علوم ہندسہ، حکمت و فلسفہ اور حساب وغیرہ نے بے مثل ترقی کی تھی جس سے دوسرے ممالک ایشیاء وافریقہ وغیرہ بھی فیضیاب ہوئے تھے، اس لیے کہ مسلمان بادشاہوں نے یہاں کی تجارت اور اخلاق و علوم میں چار چاند لگا دیے تھے اور دور دور سے بڑے بڑے نامور اساتذہ کو بلا کر بھاری بھاری تنخواہیں دے کر ان کی ہنر مندیاں اور کمالات وفضل ملک میں پھیلا دیے تھے، امور سلطنت انہیں کے ہاتھ میں تھے، فرقہ واریت کا نام نہ تھا، تمام ہندوستانی دنیا میں ایک قوم شمار کیے جاتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے آنے کے بعد شہنشاہیت مسلمانوں کی قائم ہو گئی تھی مگر مسلمان بادشاہ یہاں کے ہی باشندے بن کر یہاں کی قومیت میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے تعلقات اپنے اصلی وطنوں اور قوموں سے تقریباً منقطع کر لیے تھے اور ہندوستانی قومیت کے جزو لاینفک بن گئے تھے۔ امور حکومت میں یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح شریک کر لیا تھا جس طرح ایک قوم اور ایک خاندان آپس میں شریک ہوتے ہیں، شخصی سلطنت کا دار و مدار سراسر رعایا کی خوشنودی پر تھا اور پنچایتوں کے قیام کی وجہ سے عام طور پر عوام الناس کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور ادنی حکام سے لے کر بادشاہوں تک کے یہاں عام و خاص حاضر دربار ہوتے تھے جن میں ہر شخص کو اظہار رائے کا موقع ملتا تھا۔

برطانوی دور اقتدار سے پہلے ہندوستان میں ایک طویل زمانہ تک مسلمانوں کی حکمرانی رہی ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنے دور حکومت میں یہاں کے باشندوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اور اس ملک میں امن وامان کی فضا کو قائم کرنے اور مذہبی و علاقائی تعصبات سے اوپر اٹھ کر تمام باشندوں کے ساتھ جو مساویانہ برتاؤ کیا اس کا اعتراف جہاں مسلم مؤرخین نے کیا ہے وہیں دیگر انصاف پسند ہندؤوں اور انگریزوں نے بھی کیا ہے، ذیل میں اس کی کچھ

مثالیں ذکر کی جاتی ہیں، اس بارے میں سر بارٹل فریر کی اس تحریر سے مسلمان حکمرانوں کے طرز حکمرانی کا اندازہ ہوتا ہے:

> ایک دیسی شاہزادہ کا دربار بھی کونسل کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے حکمراں کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی ذریعہ ہے جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کر سکتا ہے اور وہ اس طرح بے چینی کو پہلے ہی معلوم کر لیتا ہے۔[1]

مسلم حکمرانوں نے یہاں آکر آپس میں رشتہ داریاں اور شادی بیاہ کے رشتے جاری کر لیے تھے، ہر قسم کے عہدے، وزارت عظمی اور سپہ سالاری سے لے کر ادنی انتظامی اور فوجی عہدوں تک بلالحاظ نسل ورنگت اور مذہب و وطنیت حسب قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے رہتے تھے، انہوں نے ہندؤوں کو مہاراجہ، راجہ اور تعلق دار بنایا، بڑی بڑی ریاستیں دیں، ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنج ہزاری اور دیگر بہت سے مناصب عطا کیے، مشہور بنگالی لیڈر سر بی سی رائے نے لکھا ہے:

> اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندؤوں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیے گئے، اورنگ زیب نے ہندؤوں کو گورنر بنایا، وائسرائے بنایا، یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا۔[2]

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۸

[2] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص، ۱۴

شہنشاہی درباروں سے لے کر عام سوسائٹیوں تک میں سب مخلوط تھے، اس لیے تمام ہندوستانی دنیا کی نظروں میں بھی اور آپس میں بھی عزت وشوکت اعلی پیمانے پر رکھتے تھے، یہی نہیں بلکہ اپنی بے مثل ثروت، بے مثل تجارت، بے مثل دستکاری، بے مثل تمدن، اور بے مثل طاقت کی بناپر اقوام عالم میں برتری اور فوقیت کا درجہ رکھتے تھے، کوئی ہندوستانی خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو غیر ممالک میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہی کوئی غیر قوم کا آدمی کسی ہندوستانی کو ذلیل دیکھ سکتا تھا، رعایا کے تعلق سے مسلم حکمرانوں کے رویہ کے بارے میں برنیبر فرانسیسی لکھتا ہے:

> رعایا کی حفاظت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح بادشاہ اپنے خاندان کے افراد اور اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ کسی طرح گوارہ نہیں کیا جاتا تھا کہ کوئی فوجی یا پولیس یا کوئی اجنبی رعیت پر کسی قسم کی دست درازی کرے۔[1]

حرفتی کمیشن جس کے تمام ممبر انگریز تھے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

> ایسے زمانہ میں جب کہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد ومنتہا ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے، ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور کاریگروں کی اعلی صنعت کے لیے مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جب کہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے، یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یورپین اقوام سے کسی طرح کم نہیں تھا۔[2]

---

1 حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۹

2 علم المعیشت ص ۳۳، بحوالہ برطانوی سماج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ حسین احمد مدنی، ص، ۱۹

سر تھامس منرو برطانوی قبضہ سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی، تہذیبی و تمدنی اور معیشتی و تجارتی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

> ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری، بے مثل صنعت و حرفت، ان کی صنعت و کاشتکاری کے معاملہ میں اعلی استعداد، ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں پڑھنے لکھنے اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو، ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو، اس کی عزت، عصمت اور عفت کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا ہو، یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کم تر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔[1]

لارڈ ولیم بنٹک (مشہور وائسرائے ہند و گورنر مدراس) ۱۸۸۲ء میں کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے جو کچھ کہتا ہے، اس سے مسلم دور حکومت اور انگریزی دور حکمرانی کا واضح فرق پتہ چلتا ہے:

> بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں، مسلمان اس ملک میں آباد ہوگئے جسے انہوں نے فتح کیا تھا، وہ ہندوستانی باشندوں میں گھل مل گئے، ان میں بیاہ شادی کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیے، فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی، کوئی فرقہ نہ تھا، بخلاف انگریزی پالیسی کے کہ وہ اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پرواہی ہے جس میں ایک طرف

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۹

حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔[1]

پنڈت سندری لال اپنی کتاب 'ہندوستان میں انگریزی راج' میں فرماتے ہیں:

اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے، دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کی خاطر کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی، ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔[2]

مسلمانوں نے بین الاقوامی سیاسی اور معاشی فکر اور عالمی سطح کا جو عملی نظام متعارف کرایا اس نے اس خطے میں آکر انسانیت دوستی کی اساس پر سیاسی اور معاشی ڈھانچوں کی ایسی تشکیل نو کی کہ عالمی تجارتی نظام کے فوائد سے ہندوستان پوری طرح مستفید ہوا، محمد بن قاسم سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک تقریباً ایک ہزار سالہ دور مسلمانوں کا کہلاتا ہے، اس پورے دور میں یہاں کے حکمرانوں نے پوری کوشش کی کہ یہاں بسنے والی اقوام ملک کے سیاسی اور معاشی نظام سے کچھ اس طرح مستفید ہوں کہ تمام افراد، قبائل، نسلیں اور مذاہب کے لوگوں کے حقوق پورے ہوتے رہیں۔ اس طرح گویا اتنے بڑے وسیع و عریض ہندوستان میں مختلف اقوام، قبائل، مذاہب کے باہمی ملاپ سے علاقائی سطح کے ہر ایک نظام نے بڑی عمدہ صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ ہندوستان کی اسی انسانیت نواز فکر، پرامن سیاسی نظام اور معاشی خوشحالی پر مبنی اقتصادی نظام کی وجہ سے اس خطہ کو دنیا بھر میں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔

---

[1] میجر باسو، ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت، جلد چہارم، ص، ۴۴۶

[2] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۲۰

جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندؤوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری کر دیا، محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے جو اس کی حمایت میں وسط ایشیا میں جا کر لڑے، اس کے ہندو فوجی کمانڈر تلک نے اس کے ایک مسلمان عہدیدار کی بغاوت فرو کی اور جب قطب الدین نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لئے ہندؤوں ہی کو مقرر کیا، ان کے بغیر سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ مسلمان ہندوستان میں محاسبوں اور محرروں کو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، ہندؤوں ہی نے ان کی عمارتیں بنائیں جن میں پرانی چیزیں نئے حالات کے مطابق شامل کی گئیں، ہندو سناروں ہی نے مسلمان حکمرانوں کے سکے ڈھالے اور ہندو محاسبوں نے ہی ان کا حساب کتاب درست کیا۔ پنڈتوں نے ہندو قوانین پر عمل درآمد کرانے میں ان سلاطین کو مشورے دیے اور برہمن نجومیوں کی رائے سے حکومت اور دربار کے مختلف کام انجام پاتے تھے، مسلمان ہندوستان آئے تو انہوں نے اسے اپنا وطن بنایا، وہ ہندؤوں کے ارد گرد رہتے تھے، اس لیے دائمی مخاصمت و عناد کے ساتھ ان کے لیے زندگی بسر کرنا ممکن نہ تھا۔ اس میل جول سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی، ہندو مسلمان دونوں نے ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہم سایہ کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے محمد شاہ تغلق کے دور حکومت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

> پورے نظام سلطنت کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی حکومت اب ایک مرتب شکل میں ہو گئی تھی، زندگی جب امن میں ہو گئی تو سیاسی فرائض کی نوعیت بھی بدل گئی اور ترقی پسند خیالات بھی پیدا ہونے لگے، ہندؤوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جانے لگا۔ حکمراں طبقہ کو رواداری اور معاشرتی یگانگت کا احساس پیدا ہونے لگا، ایک ترقی یافتہ سلطنت میں طرح طرح کے مسائل اٹھتے رہے جس کی وجہ سے ایک حکمراں کو ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑی کہ وہ خود بھی رہے اور دوسروں کو بھی رہنے دے۔ اسی لیے سلطان محمد تغلق نے

ہندؤوں کے ساتھ کوئی نازیبا روش نہیں اختیار کی۔ بلکہ اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا،
ان کو عہدے دیے۔اس نے ستی پر تھا کور کو ادیا جو اس کی روشن خیالی کی دلیل ہے۔[1]

سیاسی نظام کی اچھائی برائی کا انحصار غلبہ واقتدار کی قوت پر نہیں بلکہ ملک کے اچھے نظم ونسق پر ہے، لیکن ملک کا نظم ونسق ہر زمانے کے لیے یکساں نہیں ہو سکتا بلکہ زمانہ اور ماحول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے،اس لیے مغلوں سے پہلے سلاطین نے جو نظم ونسق قائم کیا اس کو اسی زمانے کے معیار کے مطابق پرکھنا چاہیے، یہ سلاطین فاتح بن کر ہندوستان میں ضرور داخل ہوئے لیکن مفتوحین سے ان کا میل جول جیسے جیسے بڑھتا گیا ان دونوں کے جنگ جوانہ جذبات مٹ کر خوشگوار تعلقات پیدا ہوتے گئے۔ معاشرتی اور ثقافتی امتزاج کے ساتھ سیاسی تعلقات کا بہتر ہونا ضروری تھا،اس لیے مسلم حکمراں سیاسی نظم ونسق کو جلد سے جلد بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہے۔ تمام فرماں رواؤں کی یہی کوشش رہی کہ سرحدوں کی توسیع کے ساتھ ملک کے عام نظم ونسق میں بہتری اور مثبت ترقی ہوتی رہے، چنانچہ فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے بارے میں ڈاکٹر ایشور ٹوپا لکھتے ہیں:

فیروز شاہ کی حکومت کی اسپرٹ میں رعایا کی حفاظت مضمر تھی، وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا،اس کے اس جذبہ کا ایک بین ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس نے رعایا کو دو کروڑ ٹکے کی معافی دی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ جب بڑی تباہی آئی تو رعایا کو دو کروڑ ٹکے دیے گئے۔ فیروز شاہ کے عہد میں جب اس قرض کی وصولی کا سوال اٹھا تو معلوم ہوا کہ اگر یہ قرض وصول کیا گیا تو رعایا کے بے چارگی اور بڑھ جائے گی،اس لیے یہ کل قرضہ معاف کر دیا گیا اور رعایا کے اطمینان کے لیے قرض کے سارے کاغذات ان کے سامنے شاہراہ عام پر جلا کر خاکستر کر دیے گئے۔ عوام کے ساتھ انتہائی ہمدردی کے مظاہرے کا یہ عجیب طریقہ تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ میں عوام کو مطمئن اور خوش حال

---

[1] محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص،۳۶

بنانے کا کتنا غیر معمولی جذبہ موجود تھا۔اس قسم کی شاہانہ نوازشوں سے رعایا کے دلوں میں بھی تشکر اور وفاداری کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا تھا، جس سے دونوں کے درمیان تعلقات استوار رہتے تھے۔[1]

ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت کے بارے میں مزید لکھا ہے:

فیاضی اور رحمدلی کا شاہانہ مظاہرہ زراعت اور لگان کے سلسلے میں بھی کیا جاتا تھا۔آبادی کی بدحالی اور مصیبت کم کرنے کے تمام غیر دانشمندانہ قوانین بالکل ختم کر دیے گئے، زراعت کی ترقی اور رعایا کی خوشحالی کے لیے نئے نئے قوانین بنائے گئے۔فیروز شاہی عہد میں عدل و انصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم وتعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں امن و سکون تھا، اعلی و ادنی ہر طبقے کے لوگ مطمئن اور مسرور زندگی بسر کرنے لگے، چیزوں کی فراوانی تھی، جو سستے داموں پر ملتی تھی۔اس لئے تمام رعایا قانع اور دولت مند ہو گئی۔فیروز شاہ کا یہ کارنامہ پیغمبر اسلام کے ان قوانین کی بدولت تھا جو اس نے اپنی ریاست اور بادشاہت کے لیے اختیار کیے تھے۔[2]

اے۔سی۔مہتا(آئی۔سی۔ایس)اپنی تصنیف 'ہندوستانی تہذیب اور اسلام' میں مسلم حکمرانوں کے عادلانہ نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی بت شکنی کو تو سب جانتے ہیں مگر میسور کے حیرت انگیز مندر ابھی تک ان بت شکنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے، اجنتا اور ایلورا کے برہمن اور بودھی آثار کے تحفظ میں مسلمانوں کا بھی ہاتھ ہے۔ہم کو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کیوں کہ

---

[1] محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص،۳۶

[2] ڈاکٹر ایشور ٹوپا، پولی ٹکس ان پری مغل ٹائمس، ص،۲۳۸

> اسلام یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا تھا جس نے زمانۂ قدیم میں جب کہ پرانا تمدن انحطاط پذیر ہو رہا تھا اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے، انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کر دیا۔[1]

پروفیسر ڈاکٹر پی۔ سرن سابق پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی اپنی معروف تصنیف 'دی پروونشیل گوورنمنٹ آف دی مغل' میں مؤرخانہ رواداری کے ساتھ مغل بادشاہوں کی عدل پسندی اور انصاف پروری کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> مغل بادشاہ منصفانہ فیصلہ کرنے میں بہت سخت تھے، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا بادشاہ کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا تو بھی اسے سخت سزا دینے میں تامل نہ کیا جاتا تھا، غلط قسم کے وقار اور رعب کو انصاف میں حائل ہونے نہیں دیا جاتا تھا، ہر عدالت میں حکومت کی نیک نامی کا لحاظ ہوتا تھا، مغل حکمراں عوام کا اعتماد حاصل کرنے کو اپنا وقار قائم کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ وہ بے جا رعب بٹھانے کے قائل نہ تھے۔ ان کو جب کبھی کسی حاکم کے ظلم اور غیر منصفانہ رویہ کی خبر ملتی تو اس کو سخت سزا دینے میں مطلق تامل نہ کرتے، تمام مغل شہنشاہوں کا یہ طریقۂ کار رہا۔ پادری مونسٹریٹ نے عہد اکبری کے حال میں لکھا ہے کہ جب کوئی حاکم غلطی یا بری مثال قائم کرتا تو بادشاہ اس سے پورا مواخذہ کرتا۔ جن باتوں سے عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ان کے انسداد میں بادشاہ کوئی رعایت نہ کرتا۔ بادشاہ کو انصاف اور عوام کے حقوق کا بڑا لحاظ تھا۔ اگرچہ جہانگیر اور شاہجہاں نے حکومت کے نظم و نسق میں اکبر جیسی مستعدی نہیں کی۔ لیکن عدل پرستی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ جب بھی نظم و نسق میں انتشار پیدا ہو جاتا تو اس

---

[1] اے، سی، مہتا، ہندوستانی تہذیب اور اسلام، ص، ۳۷

وقت بھی عوام کے مفاد کی پوری نگہداشت کی جاتی۔اس کی شہادت ملکی اور غیر ملکی اہل قلم کی تحریروں سے ملتی ہے۔[1]

ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ سابق استاد الہ آباد یونیورسٹی نے مغل دور حکومت اور خاص طور سے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ایک مؤرخ کی صداقت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

> شاندار اور باوقار مغل حکومت مندروں کو منہدم کر کے قائم نہیں ہوئی، یہ دلوں کی تسخیر ہی کے ذریعہ ممکن ہوئی جس میں سیاسی فراخ دلی، مذہبی رواداری اور وسیع النظری کو بڑا دخل ہے، اور اس کی جان کاری موجودہ دور میں جذباتی ہم آہنگی کے لئے اشد ضروری ہے۔[2]

شاہ جہاں کی پوری سلطنت کی اساس ایک مکمل اور پختہ نظام پر قائم تھی، اس کا اقتدار اعلی ہر شعبہ پر قائم تھا، اس کا حکم آخری حکم سمجھا جاتا تھا بشر طیکہ وہ اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو، بادشاہ وقت کو روایتی اور رسمی قوانین کا احترام کرنا ضروری تھا، لیکن اس سے ہر گز یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ بادشاہ وقت جابرانہ حکومت کیا کرتا تھا، کیوں کہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر مغل حکومت مستبدانہ اور ظالمانہ ہوتی تو اتنے دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، عوام بغاوت کر کے اس کو ختم کر دیتی، مغل بادشاہ مطلق العنان ضرور تھے، لیکن ان کی مطلق العنانی پر رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال حاوی رہا، اس کے علاوہ اپنی حکمرانی کے سلسلہ میں انگریزوں کی طرح وہ باہر سے حکم نہیں منگایا کرتے تھے، اس لیے ان کی سلطنت کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین میں مستحکم ہوتی رہی، اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغلوں نے ایسی تمام صورتیں پیدا کر دی تھیں جن سے امن وامان کی فضا قائم ہو سکی، اور اس لحاظ سے ان کی مطلق العنانی کو روشن خیال مطلق العنانی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ٹیورنیر سمیت کئی انگریز مؤرخین نے بھی لکھا ہے کہ شاہ جہاں لوگوں پر اس

---

[1] ڈاکٹر پی سرن، دی پروونشیل گورنمنٹ آف دی مغل، بحوالہ عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، محمود علی، ص،۳۸

[2] محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص،۳۹

طرح حکومت نہیں کرتا جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا پر کرتا ہے، بلکہ اس طرح جیسے ایک باپ اپنے خاندان پر کرتا ہے، اس کے پورے نظام میں ایک قوت اور زندگی محسوس ہوتی تھی، قندھار اور دکن میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں، لیکن سلطنت کے دوسرے حصوں میں امن اور استحکام بھی قائم رہا۔

مغلوں کے دو سو سالہ حکومت میں پورے شمالی ہند اور دکن کے بیشتر حصہ میں سرکاری زبان، نظام حکومت اور سکوں میں یکسانیت پیدا ہوئی، ایک مشترکہ زبان بھی پیدا ہوئی جس کو برہمنوں اور دیہاتیوں کے علاوہ ہر طبقہ کے لوگ بولتے تھے، مغلوں کے ملکی نظام، سرکاری خطبات، درباری آداب اور سکوں کے ضوابط کو ان ہندو راجاؤں نے بھی اختیار کیا جو مغلوں کے زیر اثر تھے، مغلوں کے زمانے میں بیس صوبے تھے، ہر صوبے میں ایک ہی قسم کا نظم و نسق تھا، ایک ہی قسم کے خطبات بھی تھے، سرکاری کاغذات میں ایک ہی زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، سرکاری عہدہ داروں اور فوجیوں کا تبادلہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے ایک شہر کا آدمی دوسرے صوبے میں اپنے کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا، تاجر اور مسافر آسانی سے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آیا جایا کرتے تھے اور اس آمد و رفت سے ان کو اس وسیع ملک کی سیاسی دولت کا احساس ہوتا تھا۔

مسلمانوں نے تعمیرات میں ایک نیا طرز ایجاد کیا، مسلم دور حکمرانی میں ہندوستان میں فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا، اسی طرح مسلمانوں نے مصوری میں ایک خاص اسکول قائم کیا۔ شروع میں مسلمانوں کی مصوری کے جو نمونے خراسان اور بخارا سے ہندوستان پہنچے ان میں خصوصاً چہروں، چٹانوں، اژدہوں اور پانی کی چادر تھی، مصوری میں چینی اثرات کا غلبہ نظر آتا تھا لیکن ہندوستان کے نامور بادشاہ اکبر کے دربار میں مسلم آرٹ میں چینی اور غیر ہندوستانی اثرات کے ساتھ ساتھ ہندو آرٹ کی بھی آمیزش ہونے لگی جس کی روایات میں اجنتا، بھارموت اور الور کی مصوری کے زمانہ سے اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں مسلم آرٹ میں پہلی دفعہ تغیر پیدا ہوا اور چینی آرٹ میں جو سختی پائی جاتی تھی اس میں نرمی پیدا ہو گئی اور اس آرٹ کی رسمی باتوں سے پرہیز کیا جانے لگا، چٹان، پانی اور آگ

کی مصوری میں ایک نیا طرز اختیار کیا گیا جس میں چینی اسکول کے اثرات تو باقی تھے لیکن وہ فطرت سے قریب تر تھے، پھر رفتہ رفتہ چینی اثرات زائل ہونے لگے اور مصوری کی خصوصیات اور مناظر بین طور پر ہندوستانی ہو گئے اور یہ ترقی اکبر کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے عہد میں چینی اثرات پر ہندوستانی اسٹائل غالب آگیا، پھر اس آرٹ نے نزاکت کی رنگ آمیزی، باریک مرصع کاری اور فطرت نگاری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ اس انڈو مسلم آرٹ کو فروغ مغلوں کے دربار میں ہی ہوا اور اس زمانہ میں ہندوستان کے مصوروں نے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے، یہ اسٹائل ہندوستانی آرٹ 'مغل مصوری' کے نام سے اب بھی متعارف ہے۔

جب اکبر نے شمالی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تو امن وامان اور اچھے نظام سلطنت کے خوشگوار نتائج پیدا ہونے لگے، امن کی وجہ سے دولت بڑھی اور دولت کے ساتھ ذہنی تعیشات کی جلوہ آرائی شروع ہوئی، تمام صوبوں کی زبانوں میں ترقی ہونے لگی۔ ہندی زبان میں محمد جائسی نے پدماوت، پھر تلسی داس نے رام چرت، مانس جائسی نے پدماوت سے پہلے ماری گاوت بھی لکھی، کبیر داس اور نانک نے بھی بہت سی مذہبی نظمیں لکھیں، شمالی ہند میں ۱۸ ویں صدی کے آخر میں اردو زبان علمی بن گئی۔ حقیقت میں مغلوں نے علوم وفنون کی بڑی سرپرستی کی، اسی زمانہ میں بنگال کی تاریخ سنسکرت زبان میں لکھی گئی، شاہ جہاں کے عہد میں چندر بھان برہمن کی فارسی تحریروں کو شہرت ہوئی، اسی زمانہ میں ہندی کی تصنیف مشر بندھو ونود مشہور ہوئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کوئی ایسی باضابطہ کتاب نہیں لکھی گئی جو صحیح معنوں میں تاریخ کہی جا سکتی ہے، عربوں کا دماغ مرتب اور حقیقت پسند ہوتا ہے، وہ واقعات کو تاریخ وار لکھنے کے عادی ہوتے ہیں، مسلمانوں کا تاریخی لٹریچر بہت ہی وسیع اور متنوع ہے اور اس میں سنہ و سال کی باضابطہ ترتیب رہتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ہر فرماں روا مسلمان خاندان کے زمانہ میں لکھی گئی، مغلوں کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد کی تاریخ لکھوائی، ان تاریخوں کا نہ صرف مطالعہ کیا گیا، بلکہ ہندو مصنفوں اور راجاؤں نے ان کے طرز کو نقل کرنے میں تساہل سے کام نہیں لیا۔ اس

طرح ہندوستانی لٹریچر میں ایک نئے اور بہت ہی مفید فن کا اضافہ کیا گیا، چنانچہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں تاریخوں، سوانح عمریوں اور خطوط کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

شکار خصوصا باز اور شکرا کھیلنے کے طریقوں کا اثر غالب ہوا، اس کے لیے ان ہی کی اصطلاحات استعمال ہوئیں۔ تمدن کے دوسرے شعبوں میں بھی فارسی، عربی اور ترکی الفاظ ہندی، بنگالی بلکہ مرہٹی زبان ہی میں استعمال کیے جانے لگے۔ مسلمانوں نے فنون جنگ میں بڑی ترقی کی تھی، انہوں نے یہ فن ترکوں سے سیکھا تھا۔ مغلوں کی فوج کے نظم و نسق کو ہندو راجاؤں نے بڑی رغبت سے اختیار کیا۔ تمدن جیسے جیسے بڑھتا گیا اور جنگ میں توپوں کے استعمال کی کثرت ہوئی تو مسلمانوں نے حصار بندی کو بڑی ترقی دی۔ مسلمانوں نے ہی یہاں بارود ایجاد کی۔

ملکی نظام اور دربار کے آداب، لباس پوشاک، اعلی طبقہ کے طرز زندگی، سامان تعیشات، فنون لطیفہ، تعمیرات اور فن باغبانی میں مسلمانوں کے اثرات بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔ مغلوں نے دربار کے مراسم، خطبات اور سرکاری عہدہ داروں کے آداب میں جن باتوں کو رائج کیا ان کو اکثر ہندؤوں نے فخریہ نقل کیا۔ محکمہ مالیات کے حساب کتاب کے طریقوں اور اس کے القاب مسلمانوں نے رائج کیے اور ان سے ہندؤوں نے لیا۔ مسلمانوں کی روزانہ زندگی میں ہندؤوں کے مقابلہ عیش زیادہ تھا، وہ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے، اس لیے ان کی وجہ سے صنعتیں اور فنون لطیفہ کو زیادہ فروغ ہوا، مسلمانوں نے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں رائج کیں۔ جمالیات، عطریات اور رقص و سرود میں مسلمان شاہی خاندان کا ذوق پوری سوسائٹی کی رہبری کرتا تھا، گو کہ رقص و سرود میں ان کا ذوق بہت کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا۔

کاغذ مسلمانوں ہی نے یہاں رائج کیا جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے۔ کاغذ کے رائج ہونے کے بعد پتوں پر کتابوں کے لکھنے کا رواج بند ہو گیا اور کتابیں ظاہری حسن کے ساتھ زیادہ تعداد میں ہاتھ آنے لگیں، مخطوطات کی کلا

کاری ایک خاص آرٹ ہے جو مغلوں کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اکبر اور اس کے بعد کے عہد میں ہندو راجاؤں کے لیے ہندی اور سنسکرت میں کتابیں نقل کی جانے لگیں اور ان کو مصوّر بھی کیا گیا۔ یہاں کی فارسی کتابوں کی کلا کاری اور خطاطی کی شہرت یورپ تک پھیلی جس کی وہ مستحق تھی۔ مسلمانوں کے اثر سے کتابیں عام طور سے نقل کی جاتیں، علوم و فنون کو پھیلایا جاتا تھا، ورنہ اس سے پہلے ہندو اپنی کتابوں اور علوم و فنون کو راز ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے۔

ہندوستان برطانوی نوآبادیات کی زد میں

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور پھر یہاں ان کے حصول اقتدار کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ الوالعزمی اور جہاز رانی میں پرتگال والے یورپ بھر میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کوئی دوسری قوم ان سے ہمسری کا دعوی نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان بحری راستہ سب سے پہلے ان ہی پرتگیزوں نے دریافت کیا، انہوں نے سمندر میں جہاز ڈال کر افریقہ کے ساحل کے برابر چلنا شروع کیا حتی کہ جنوب میں پہنچ کر جب مڑے تو بحر ہند کی طرف آنکلے، ہوتے ہوتے ایک مشہور پرتگیز کپتان 'واسکوڈی گاما' چند جہاز لے کر ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر آیا اور کیرلا کے شہر کالی کٹ میں وارد ہوا، وہاں کے راجہ نے واسکوڈی گاما کو شاہ پرتگال کے نام ایک خط دیا، جس میں تحریر تھا کہ میرے ملک میں دار چینی، لونگ، کالی مرچ اور ادرک کثرت سے ہوتے ہیں، جن کے بدلے میں تمہارے ملک سے سونا، چاندی، مونگا اور قرمزی مخمل چاہتا ہوں۔

اس وقت سے سو برس بعد تک یعنی ۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک ہندوستان کی بحری تجارت بالکل پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی، انہوں نے گوا میں ایک مضبوط قلعہ بنالیا تھا، یورپ کی باقی قوموں نے جو دیکھا کہ ہندوستان کی تجارت سے پرتگال والے مالا مال ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے ملک اور شہروں کو رشک جنت بنالیا ہے، تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور شوق پیدا ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیے، پس ہالینڈ، انگلستان، فرانس، ڈنمارک،

جرمنی اور سویڈن کے تاجروں نے اپنے اپنے جہاز بھیجنے شروع کیے، مگر ان سب میں کچھ کامیابی ہوئی تو صرف ہالینڈ، انگلستان اور فرانس والوں کو، باقی کو کچھ نفع نہ ہوا اور وہ یہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔

چنانچہ سولہویں صدی کے بالکل اختتام اور سترہویں صدی کے بالکل آغاز میں انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے، یہاں کی عوام اور حکام ہمیشہ سے مہمان نواز واقع ہوئے تھے، انہوں نے انگریزوں کے ساتھ ہمدردانہ طریقہ پر ہر قسم کی مراعتیں کیں۔ برطانوی عہد کی ابتداء بھی کیا ہی عجیب ہوئی کہ جو قوم محض تجارت کی غرض سے یہاں پہنچی تھی اگلے کچھ سالوں کے بعد وہی قوم یہاں کی حکومت واقتدار پر قابض ہو گئی، ۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء کو لندن کے چند تاجروں نے آپس میں مل کر طے کیا کہ مشرقی ممالک سے تجارت شروع کرنی چاہیے، چنانچہ اس غرض سے باقاعدہ ایک کمپنی قائم ہوئی جس میں لندن کے دو سو سے زیادہ تاجر اور امراء شریک تھے۔ ۲۱ دسمبر ۱۶۰۰ کو ملکہ الزبیتھ نے اس کمپنی کو شاہی منشور کے ذریعہ بلا شرکت غیرے مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے پورے حقوق عطا فرمائے، گویا کمپنی کو مشرقی تجارت کا باضابطہ اجارہ مل گیا، کوئی اور انگریزی کمپنی اس میں دخل نہیں پا سکتی تھی، سترہویں صدی کے شروع میں کمپنی کی طرف سے کچھ انگریز تاجر ہندوستان پہنچے۔ چنانچہ ۱۶۱۲ء میں اول مغربی ساحل پر بمقام سورت انہوں نے کاروبار شروع کیا، شہنشاہ جہانگیر کا زمانۂ بادشاہت تھا، نووارد تاجروں نے جن جن رعایات کی بارگاہ سلطانی میں استدعاء کی وہ سب بخوشی عطا ہوئیں۔

۱۶۱۶ء میں کمپنی نے مشرقی ساحل پر بمقام سولی پٹم کارخانہ کھولا، ۱۶۴۰ء میں مقامی راجہ سے مدراس کی زمین لگان پر حاصل کی اور اس کا کچھ حصہ خرید کر وہاں قلعہ تعمیر کیا، بنگال میں تجارت کرنے کی اجازت کمپنی نے شہنشاہ شاہ جہاں سے ۱۶۳۴ء میں حاصل کی، ۱۶۴۰ء میں بمقام ہگلی ایک کارخانہ قائم ہوا جو ۱۶۹۰ء میں بعض مصلحتوں کی وجہ سے کلکتہ کو منتقل ہو گیا اور اسی کے طفیل اس شہر کی بنیاد پڑی، جہاں آج بمبئی آباد ہے یہ جزیرہ کبھی پرتگال والوں کے قبضہ میں تھا، چارلس دوم نے جب ایک پرتگالی شہزادی سے شادی کی تو پرتگال کی طرف سے ۱۶۶۲ء میں یہ جزیرہ دلہن کے

جہیز میں ملا، چنانچہ چارلس نے آمدنی کے خیال سے ۱۶۶۸ء میں یہ آراضی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۰ پونڈ سالانہ لگان پر دے دی، اس طرح ہندوستان کی تینوں باموقع بندرگاہیں کلکتہ، بمبئی اور مدراس ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آگئے اور پھر ملک میں کمپنی جس طرح پھیلی وہ اظہر من الشمس ہے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور سلطنت مغلیہ برائے نام رہ گئی، حالانکہ اورنگ زیب کے بعد لگ بھگ ڈیڑھ سو سال تک مغل سلاطین یکے بعد دیگرے تخت نشیں ہوتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت شطرنج سے زیادہ نہ تھی اور وہ نظام حکومت جس کے متعلق مسٹر لیوک اسکرافٹن کی رائے "اس سے بہتر دنیا میں کوئی نظام نہ تھا" اب درباریوں کی گروہ بندی اور سازشوں، مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں کی بغاوتوں اور غیر ملکیوں کی ملک گیری کی پالیسی کے سبب درہم برہم ہو چکا تھا، اور اب حالت یہ تھی مغل سلطنت کے صوبہ دار خود مختار بن بیٹھے تھے۔ حیدرآباد دکن میں نظام الملک آصف جاہ اول نے ۱۷۲۴ء میں آزاد سلطنت قائم کرلی تھی۔ ۱۷۳۹ء میں علی وردی خان بنگال، بہار اور اڑیسہ کا خود مختار حکمراں بن چکا تھا، اسی طرح اودھ میں برہان الملک اور روہیل کھنڈ میں افغان سردار شاہان دہلی کی اطاعت سے منھ موڑ چکے تھے۔ غرض ہندوستان میں طوائف الملوکی اور بد نظمی کا دور دورہ تھا اور یہاں کے حکمراں آپس میں برسرپیکار تھے، پردیسیوں نے جو تجارت کی غرض سے آئے تھے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت اور اقتدار کو آہستہ آہستہ بڑھانا شروع کیا، ہندوستان کی ان خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تمام غیر ملکی تجار مثلاً پرتگالی، انگریز، ڈچ، فرانسیسی سیاست کے میدان میں کود پڑے اور اپنے تجارتی مطمح نظر کو پس پشت ڈال کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن انگریزوں نے اپنی بنیادی حکمت عملی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی پر عمل کر کے اس خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔

یہ وہ دور تھا جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سات سو سالہ حاکمانہ اقتدار عالم نزاع میں تھا اور آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مٹھی بھر فوج نے سارے ہندوستان میں زلزلہ ڈال رکھا تھا، ہندوستان کی چھ سو سے زائد

چھوٹی بڑی ریاستوں کے راجاؤں، مہاراجاؤں، نوابوں اور جاگیر داروں نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ کے حادثے کے بعد کالی گھٹاؤں میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کا سورج ہمیشہ کے لیے چھپ گیا اور دہلی میں مسلمانوں کی حکومت کی جو شمع جھلملا رہی تھی اس سرخ آندھی میں ہمیشہ کے لیے بجھ گئی اور لال قلعہ کی بلند و بالا فصلیں غیر معین مدت کے لیے تاریکیوں میں ڈوب گئیں۔ اس زمانہ کے حالات کو سعید احمد اکبر آبادی نے مختصر لفظوں میں اس طرح لکھا ہے:

> غرض یہ کہ اس وقت ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ سات سمندر پار کی رہنے والی قومیں اس ملک پر آہستہ آہستہ اپنے قدم جمارہی تھیں اور دوسری جانب مسلمان اندرونی بدنظمیوں اور شدید اختلال وانتشار کی وجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں۔ وہ سب اقتدار کے بھوکے اور غرض کے بندے تھے۔[1]

یورپی طاقتوں نے ایشیائی ملکوں میں نو آبادیات قائم کرنے اور ان نو آبادیات ملکوں کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا جو اندوہناک سلسلہ جاری کیا اسکے پیچھے ان کے جو مقاصد تھے اور اس کے نتیجے میں ان ملکوں میں جو اثرات مرتب ہوئے، ان کا حال اسرار احمد آزاد کی اس تحریر سے بخوبی ہوتا ہے:

> پرتگال اور اسپین جیسی مغربی یورپ کی طاقتوں اور ان کے بعد فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ نے سولہویں صدی عیسوی سے مشرق میں اپنی غارت گرانہ حکمت عملی کا آغاز کیا تھا، سرمایہ جمع کرنے کا سب سے بڑا ابتدائی اور وحشیانہ ذریعہ نو آبادیات کو غارت گرانہ طریقے پر لوٹنا ہی تھا

---

[1] سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج وزوال، ص، ۳۳۹

اور اسی ذریعے کی بدولت برطانیہ میں تیز رفتاری کے ساتھ، نیز فرانس اور ہالینڈ میں جزوی طور پر صنعتی ترقی رونما ہوئی تھی۔[1]

سترہویں صدی کے آغاز میں مغل شہنشاہ جہانگیر سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مانگی، کچھ عرصے کے بعد انھوں نے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا اور مدراس شہر کی بنیاد رکھی۔ ۱۶۶۲ء میں بمبئی کے جزیرے کو انگلینڈ کے چارلس دوم نے کمپنی کو دے دیا جسے چارلس دوم نے پرتگال سے جہیز میں حاصل کیا تھا۔ ۱۶۹۰ء میں کلکتہ شہر کی بنیاد پڑی۔ ۱۷ویں صدی کے آخر تک انگریز اپنے قدم جمانے کے لئے محض چند جگہیں حاصل کر سکے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی بھی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ جلد ہی انگریز ہندوستان میں ایک طاقت ور حکومت قائم کر لیں گے، کیوں کہ انگریزوں کے لئے تجارت بھی زیادہ منافع بخش نہیں تھی۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے ان کے قبضے میں پہلی مرتبہ ایک بہت بڑا علاقہ آگیا اور اس کے بعد چند سالوں میں بنگال، بہار اور اڑیسہ ان کے قبضے میں آگیا۔ بس یہیں سے انگریزوں کی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی شکست اور ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی شکست کے بعد پورا ملک برطانوی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت کی منظوری مل جانے کے بعد انگریز تجارت کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب بھی دیکھنے لگے تھے، اس خواب کی تعبیر جنگ پلاسی (۱۷۵۷) میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد ملنی شروع ہو گئی تھی، بنگال پر تسلط کے بعد ملک کے باقی حصے کے استحصال کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوستان کی دولت انگلستان منتقل ہونے لگی، اب ہندوستان ایک بڑی منڈی بن گیا۔ انگلستان سے تیار شدہ مال ہندوستان میں بڑی تعداد میں فروخت ہونے لگے، چنانچہ ہندوستان کی صنعت و حرفت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی اور ہندوستان صرف ایک

---

[1] اسرار احمد آزاد، ایشیاء میں آخری نو آبادیات، ص، ۷

زرعی ملک بن کر رہ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کی ناکامی کی صورت میں حکومت برطانیہ نے ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح ہندوستان برطانوی نوآبادیات کا حصہ بن گیا۔ قومی بغاوت کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت نے گرچہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مصلحتاً کئی وعدے کیے لیکن یہ سارے وعدے حکومت کے مفاد ہی میں تھے، ہندوستانیوں کے استحصال کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر انگریزی اقتدار تک ہندوستان میں مختلف غیر ملکی قوموں کی حکمرانی رہی ہے، ہندوستان میں باہر سے آنے والے حکمرانوں میں سب سے زیادہ دنوں تک مغلوں کی حکومت رہی، اور اس حکومت نے یہاں کی تہذیب اور رہن سہن میں چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اپنے آپ کو اسی طرز میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ باہر سے آنے والوں کے کچھ اثرات یہاں کے باشندوں نے قبول کیے اور یہاں کی کچھ تہذیب و تمدن کو آنے والے حکمرانوں نے اپنایا اور اس نتیجہ میں عظمت انسانی، تہذیب و شائستگی، علم و فن اور زبان و ادب کی بے کراں ترقی و اشاعت عمل میں آئی، ہندوستان اپنی تجارتی شناخت، زرعی پیداوار، اقتصادی ترقی اور صنعتی امتیاز کے سبب ہمیشہ مختلف ملکوں اور قوموں کی توجہ کا مرکز رہا ہے، اسی وجہ سے دیگر ممالک کے بہت سے لوگوں اور کمپنیوں نے تجارتی مقاصد کے پیش نظر یہاں کا رخ کیا اور یہاں کے لوگوں اور حکمرانوں نے ان سب آنے والوں کا استقبال کیا اور انہیں ہر طرح کی اعانتیں اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان ہی غیر ملکی کمپنیوں میں برطانیہ سے آنے والی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' بھی ہے، اس کمپنی سے منسلک انگریزوں کا مقصد اصلی تجارت کے پس پردہ یہاں کی حکومت پر قابض ہونا تھا، وہ اول دن سے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے خاکے اور منصوبے تیار کرنے لگے اور بالآخر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے، ہندوستان میں حصول اقتدار کے بعد انہوں نے اس ملک اور یہاں کے باشندوں کا ہر ہر محاذ پر استحصال کرنا شروع کر دیا۔

انگریزوں نے ہندوستانی باشندوں پر اپنی سماجی، سیاسی اور تہذیبی برتری قائم کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے، انہوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان مذہب کے نام پر ہندو مسلم میں تفریق پیدا کی تو دوسری طرف ایک ہی مذہب کے لوگوں کو مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا، کیوں کہ ہندوستانیوں کے متحد ہونے سے ان کی حکومت کو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، انہوں نے ہندوستانیوں کو کہیں ذات کے نام پر تو کہیں علاقے کے نام پر بھی لڑانے کی کامیاب کوشش کی، انگریز حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں اور ان کی تہذیب و تمدن کو غیر مہذب اور بد اخلاق و غیر شائستہ کہہ کر انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھا، مقامی باشندوں کے اوپر یورپ سے لائی گئی تہذیب و تمدن کو تھوپنے، اپنی نسلی، سماجی و سیاسی برتری کو قائم رکھنے اور اپنی عنان حکومت کو بنائے رکھنے کو نو آبادیات کا نام دیا۔ نو آبادیت پر حکومت کے زعم میں طرح طرح کی بندشیں عائد کیں اور نئے نئے قوانین نافذ کیے جن کی مدد سے ان کا برابر استحصال کیا جاتا رہا اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا گیا۔

ہندوستان کی ہزاروں سالوں کی سیاسی، معاشی اور انسانیت دوستی پر مبنی قومی روایات اس وقت جبر و دہشت اور غنڈہ گردی کا شکا ہو گئیں جب برطانوی سامراج نے اپنے خونی پنجے اس خطہ کے سرسبز و شاداب جسم پر گاڑ دیے اور ایک ایسا ظالمانہ، عالمی دہشت گردانہ، بدترین آمرانہ اور انسانیت دشمن نظام قائم کیا جس کی تاریخ انسانیت میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے لامحدود منافع کی ہوس میں وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جو مہذب دنیا کے منہ پر ایک طمانچہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مکر و فریب کی وہ کون سی سازش تھی جو نہ اختیار کی گئی ہو، جبر و دہشت پھیلانے کا وہ کون سا حربہ تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو، ہندوستان کی دولت لوٹنے کے لیے وہ کون سا ظالمانہ قانون تھا جو مسلط نہ کیا گیا ہو۔ اس ظالمانہ لوٹ کھسوٹ نے نہ صرف اس خطہ کا امن چھین لیا اور تحفظ کو ختم کر دیا، بلکہ معاشی خوش حالی کو بدحالی میں تبدیل کر کے بھوک، افلاس، خوف اور تباہی و بربادی پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، نہ صرف یہ بلکہ آگے بڑھ کر اس خطہ

کے اقوام و مذاہب میں نفرتوں اور عداوتوں کے بیج بو دیے اور فرقہ پرستی کی ایسی آگ جلائی جس کی بھڑکتی لپیٹوں نے انسانیت کو ایٹم بم کے جہنم کی طرف دھکیل دیا۔

یورپین اقوام نے ایشیائی اور افریقی ملکوں میں اپنی نوآبادیات کے تئیں جس طرح کی پالیسی اور حکمت عملی کو اپنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا، اس کے بارے میں اسرار احمد آزاد نے لکھا ہے:

> ایشیائی ملکوں میں نوآبادیات خواہوں کی حکمت عملی تبدیلیوں کے مختلف مرحلوں سے گذرتی رہی ہے۔ سولہویں اور اٹھارویں صدی کے درمیان مغربی یورپ کے ملکوں کے لیے ان کی نوآبادیات غارت گری کا میدان اور سرمایہ جمع کرنے کا ایک وحشیانہ وسیلہ بنتی رہی تھیں۔ اجارہ دارانہ سرمایہ داری کا دور شروع ہونے سے قبل مغربی یورپ کے ملکوں کی یہ نوآبادیات ان کے لیے آہستہ آہستہ زرعی استحصال کا ایک ایسا اضافی ذریعہ بن گئی تھی جو انہیں کچا مال بہم پہنچاتی، ان نوآبادیاتی طاقتوں کی مصنوعات کو خریدتی اور کام میں لاتی تھی۔ سامراج کے دور میں ایشیاء اور افریقہ کے یہ ملک سرمایہ کاری کا میدان بھی بننا شروع ہو گئے تھے۔ ان نوآبادیات میں غیر ملکی سرمایے کی درآمد کے باعث کروڑوں مزدوروں کے استحصال کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سٹی اور وال اسٹریٹ کے کروڑپتی کریڈٹ لایونز کے سرمایہ دار اور انڈوچائنیز بینک نیز تیل، ٹین، اور ربڑ کے اجارہ دار زبردست منافع حاصل کرتے تھے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ نوآبادیاتی نظام میں اگر کسی چیز کو ترقی حاصل ہوئی تو وہ تھی محتاجی اور پسماندگی، اس نظام حکومت نے ایک معاشرے کو اس کی آزادی، اس کی دولت اور اس کے بنیادی کردار سے محروم کر دیا اور اس کے نظام

---

[1] اسرار احمد آزاد، ایشیاء میں آخری نوآبادیات، ص، ۸

اخلاق اور دانشورانہ انداز فکر پر منفی اثرات مرتب کیے، الغرض کسی زندہ سماج کی تین بڑی بنیادوں یعنی انسانیت دوستی، پر امن سیاسی نظام اور خوش حال اقتصادی نظام کو برطانوی سامراج نے ہندوستان بھر میں مسمار کر کے رکھ دیا، جس سے اس معاشرہ کی ترقی رک گئی۔ بھوک وافلاس پیدا ہو گیا، بدامنی پھیل گئی اور یوں ترقی یافتہ ہندوستان بتدریج تنزل کی طرف بڑھتا گیا۔

برطانوی سامراج کی سب سے بڑی شیطنت یہ رہی کہ اس نے اس خطہ میں انسانیت دشمنی کی سوچ کو پیدا کیا، نفرتوں کے افکار کو جنم دیا، فرقہ پرستی، تشدد پسندی، آمریت اور غنڈہ گردی کو فروغ بخشا اور سیاسی حوالے سے ان ظالمانہ رویوں کی اساس پر ایسا بدامنی اور عدم تحفظ کا نظام مسلط کیا جس نے اس خطہ کی اقوام پر ہر وقت کے لیے خوف اور بزدلی طاری کر دی اور یوں بدامنی اور عدم تحفظ کا احساس بڑھتا گیا۔ اس طرح اس نے ایسے ظالمانہ معاشی نظام کا جال پورے خطہ میں پھیلا دیا کہ یہاں کی دولت سمٹ سمٹ کر ایک ایسے مرکز پر جمع ہو، جہاں سے سامراجی ممالک کے اسپنج سے اسے چوس لے جائیں۔

نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے سماجی اور معاشی ابتری کی صورت حال پیدا ہو گئی اور بے روزگاری کی مار نے ملک میں بے چینی کی کیفیت پیدا کر دی، خاص طور سے مسلمانوں کی بے روزگاری ناگفتہ بہ حد تک پہنچ چکی تھی، اس کے متعلق مشہور انگریز مؤرخ سر ولیم ہنٹر نے برطانوی حکمرانوں کی پالیسی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، چنانچہ اس نے اپنی کتاب Indian Musalmans : Are they found in conscience to rise against the queen میں (۱) فوجی خدمات (۲) حصول مالگزاری اور (۳) عدلیہ اور سر رشتہ سیاسیات کی خدمات کو سرکاری زندگی کی تین منصفانہ اور واضح اجارہ داریاں قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> جہاں تک پہلی قسم کی ملازمت کا سوال ہے ایسا کوئی مسلمان جو پیدائشی طور پر نجیب الطرفین ہو ہمارے فوجی دستوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ مسلمان کس مضحکہ خیز حد تک کم تعداد میں گورنر جنرل کے ہاتھوں فوجی کمیشن حاصل کر پاتے ہیں اور ملکہ کے ہاتھوں تو ایک مسلمان بھی یہ اعزاز حاصل نہ کر سکا۔[1]

دوسری قسم کی خدمت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنٹر نے لارڈ کارنواس اور سر جان شور کی اس پالیسی کو ہدف ملامت بنایا ہے جس کے ذریعے انھوں نے بنگال میں دوامی وراثت یا بندوبست کے طریقے کو ختم کر دیا تھا۔ یہ پالیسی مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنی، تیسری قسم کی سرکاری خدمات کے بارے میں ہنٹر پر زور طریقہ پر رقمطراز ہے: "ان دیسی شرفاء میں جو معہودہ دیوانی ملازمتوں یا عدالت عالیہ کی منصفی جیسے عہدوں تک پہنچ پائے ایک بھی مسلمان نہیں ہے"۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں اس نے حسب ذیل اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔

> (۱) اعلی ترین عہدوں پر اب تین ہندؤوں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان فائز ہے۔ (۲) دوسرے درجہ کے عہدوں پر اب دس ہندؤوں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان فائز ہے۔ (۳) تیسرے درجہ کے عہدوں پر اب ۲۴ ہندؤوں اور انگریزوں کے مقابلے میں صرف تین مسلمان فائز ہیں۔ (۴) ادنی درجہ کی ملازمتوں پر اب ۳۹ کے مقابلے میں صرف چار مسلمان فائز ہیں۔ (۵) ہنگامی اور عارضی اسامیوں پر اب ایک بھی مسلمان فائز نہیں ہے۔[2]

حکومت کے کم اہم محکمہ جات میں صورت حال اور بھی زیادہ ابتر تھی، تینوں درجے کے اسسٹنٹ گورنمنٹ انجنیروں میں ۱۴ ہندؤوں کے مقابلے میں ایک بھی مسلمان موجود نہیں تھا، امیدواروں میں چار ہندو اور دو انگریز تھے

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر رفیق زکریا، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ص، ۲۸

[2] ولیم ہنٹر، انڈین مسلمان، بحوالہ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ڈاکٹر رفیق زکریا، ص، ۲۹

جبکہ ایک بھی مسلمان امیدوار منتخب نہیں کیا گیا تھا، محکمہ تعمیرات عامہ کے سب انجینیروں اور سپر وائزروں کی فہرست میں ۲۴ ہندؤوں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان شامل تھا،اور سیر وں کے زمرے میں ۶۳ ہندؤوں کے مقابلے میں صرف دو مسلمان شامل تھے، دفتر محاسب میں ۵۳ ہندؤوں کے مقابلے میں ایک بھی مسلمان موجود نہیں تھا، اعلی درجے کے ماتحتین کے محکمے میں ۲۲ ہندو موجود تھے جب کہ مسلمان ایک بھی نہیں تھا۔

اوپر ذکر کی گئی مثالوں سے مسلمانوں کے روزگار کی حالت کا ایک واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، یہ مثالیں ہنٹر کی تحریر سے ماخوذ ہیں۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہنٹر ہر گز نہیں چاہتا تھا کہ ان صریح حقائق کی مثالوں کا انبار لگادے جو عہدیدارانِ دیوانی کی فہرست کے ہر صفحے پر اظہر من الشمس موجود تھے، تاہم اس نے گزیٹیڈ عہدوں کی ایک ایسی مبسوط فہرست تیار کی تھی جس کے لیے انگریز ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اہل قرار دیے گئے تھے اور ثابت کیا کہ ۱۸۷۱ میں بنگال میں سرکاری تقررات کچھ اس طرح کیے گیے کہ یورپین عہدیداروں کے مقابلے میں ہندو عہدیداروں کی تعداد نصف تھی جبکہ مسلمانوں اور یورپیوں کے درمیان 14/1 کا تناسب پایا جاتا تھا۔اس صورت حال پر بڑے ہی دکھ کے ساتھ تبصرہ کرتے ہوئے ہنٹر لکھتا ہے:

> آج کلکتہ میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ایسا ہو جہاں کوئی مسلمان دربان، قاصد یا قلم تراشنے اور دوات میں سیاہی بھرنے والے چپراسی سے بڑھ کر کسی خدمت پر مامور ہونے کی توقع کر سکے۔[1]

انگریزی دور حکومت میں ایک طرف تو سماجی، معاشی، تعلیمی اور روزگار کے مواقع کے اعتبار سے بے چینی اور نفسا نفسی کی حالت تھی اور دوسری طرف یہاں کے باشندوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور عداوت و دشمنی کے وہ سفاکانہ اور ظالمانہ طریقے اختیار کیے جارہے تھے جنہیں سن کر انسانیت شرمسار ہو جاتی ہے اور خود کو مہذب اور دانشور قوم

---

[1] ولیم ہنٹر، انڈین مسلمان، ص،۱۶۷

کہنے والوں کا درندہ صفت چہرہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کی طرف سے کیے جانے والے روح فرسا مظالم کے کچھ نمونے ہمیں ۱۸۵۷ کے ہنگامے کے بعد خاص طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں، باشندگان ہند کی طرف سے ظلم و تعدی کے خلاف، عدل و انصاف کے حصول اور اپنے بنیادی حق آزادی کو پانے کے لیے لڑی جانے والی اس جنگ کو بغاوت اور سرکشی کا نام دے کر ان ظالموں نے درندگی کا وہ ننگا ناچ رچا کہ جسے پڑھکر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ اور اس کے اثرات

۱۸۳۳ میں کمپنی کا حق تجارت سلب ہو جانے کی وجہ سے کمپنی کی پوری توجہ توسیع سلطنت کی طرف ہو گئی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کمپنی نے ہر جائز و ناجائز طریقے استعمال کرنا شروع کر دیے، لارڈ ہسٹینگز کے عہد میں کمپنی کی سلطنت دریائے ستلج، ریاست بہاولپور اور راجپوتانہ کے ریگستان تک پہنچ گئی تھی اور اب کمپنی کی للچائی ہوئی نظریں پنجاب، سندھ اور افغانستان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے کمپنی نے افغانستان کے خود مختار حکمراں دوست محمد بارک زئی کے جھگڑے میں دخل اندازی شروع کر دی اور سابق حکمراں شاہ شجاع کو سکھوں کی مدد سے تخت نشیں کرانا چاہا، لہذا انگریزی فوج نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور ۱۸۳۹ میں قندھار اور غزنی پر قبضہ کر کے شاہ شجاع کو حکمراں بنا دیا، لیکن یہ فتح زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی، افغانوں نے وہاں بغاوت کر کے اس فتح کو بدترین شکست میں تبدیل کر دیا۔

چونکہ اب انگریزوں کا مقصد توسیع سلطنت رہ گیا تھا، لہذا حکام وقت لڑنے کے حیلے اور بہانے ڈھونڈتے تھے، تاکہ ان کے مقصد کی تکمیل ہو۔ سکھ جو کسی زمانے میں کمپنی کے وفادار دوست تھے انگریزوں نے ان سے بھی بگاڑ پیدا کر لیا اور مارچ ۱۸۴۹ میں سکھوں کی قوت اور سلطنت کا خاتمہ کر کے ڈلہوزی نے پنجاب کو بھی انگریزی سلطنت میں

شامل کر لیا،اب کمپنی کے سامنے دیسی ریاستوں کا سوال تھا،تاکہ ایک وسیع اور عظیم الشان سلطنت قائم ہو سکے۔ چنانچہ مختلف بہانوں سے مختلف دیسی حکومتوں کا الحاق عمل میں آیا۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ڈلہوزی نے گود لینے یا متبنی کرنے کی رسم کو ختم کر کے ریاست ستارا ۱۸۴۸ء میں، جھانسی ۱۸۵۲ء میں اور ناگپور ۱۸۵۳ء میں انگریزی سلطنت میں شامل کر لیے۔ان کے علاوہ چار چھوٹی ریاستیں جیت پور، سمبھل پور، بگھاٹ اور اودے پور بھی اسی اصول کے مطابق انگریزی قلم رو میں ملائی گئیں، اور اسی زمانے میں برما کے راجہ کو شکست دے کر جنوبی برما اور رنگون کو بھی انگریزی احاطۂ سلطنت میں لے لیا گیا۔

ڈلہوزی کی الحاق عمل کی پالیسی سے پورے ہندوستان میں عام ناراضگی پھیل گئی۔ علاوہ اس کے کچھ اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ایسی حالت میں اودھ کی ریاست کا الحاق (فروری ۱۸۵۶ء) اونٹ پر آخری تنکا ثابت ہوا۔ لہذا ۱۸۵۷ء میں ملک میں ناراضگی اور بد دلی کی آگ جو آہستہ آہستہ سلگ چکی تھی ایک بغاوت کی صورت میں بھڑک اٹھی اور وقتی طور پر انگریزوں کے قدموں میں لغزش پیدا کر دی اور ان کی حکومت کو متزلزل کر دیا۔ لیکن یہ آگ جتنی تیزی سے بھڑکی تھی اتنی ہی جلدی اسے ٹھنڈا کر دیا گیا۔

اس آگ کی لپٹیں سب سے پہلے کلکتہ کے قریب بارکپور میں اٹھیں،اس کا وقتی اور فوری سبب یہ تھا کہ فوج کو جو نئے کارتوس دیے گئے ان کی بابت یہ مشہور ہو گیا کہ ان میں گائے اور سور کی چربی لگی ہے، جس سے ہندو اور مسلمان سپاہی بھڑک اٹھے اور انہوں نے اپنے مذہب کے دشمنوں کو تباہ کرنے کا مستحکم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے افسروں کو مار ڈالا اور عمارتوں کو جلا دیا۔انگریزی حکام نے بہت جلد بارکپور کے ان سپاہیوں کی بغاوت کو فرو کر دیا، لیکن وہ اس خبر کو پھیلنے سے نہیں روک سکے جس نے میرٹھ پہنچ کر ہندوستانی سپاہیوں کو بارکپور کی سپاہ سے زیادہ مشتعل کر دیا۔ چنانچہ ۱۰ مئی، ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ہندوستانی فوج بگڑ اٹھی اور یہاں بھی بارک پور کے سپاہیوں کا عمل

دہرایا گیا، لیکن ذرا اونچے پیمانے پر۔ انگریز افسروں کا قتل عام شروع کر دیا گیا، ان کے مکانوں نیز سرکاری عمارتوں کا جلا کر خاکستر کر دیا اور حوالات توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ اور پھر ان باغیوں نے مل کر ایک منظم فوج کی صورت اختیار کر لی اور پھر دہلی کی طرف کوچ کیا، دہلی کی فوج بھی ان باغیوں سے مل گئی، چنانچہ بغیر کسی حیل وحجت کے یہ فوج دہلی میں داخل ہو گئی اور انگریزی نظم ونسق کو وہاں سے خارج کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ تسلیم کر کے اس بغاوت کی عنان ان کے ہاتھوں میں تھما دی گئی، بغاوت کا یہ سلسلہ اب پھیلنا شروع ہوا اور نہایت قلیل عرصہ میں بریلی، لکھنؤ، باندہ، جھانسی، کالپی، چھوٹا ناگپور، کانپور، بہار وغیرہ سب ہی اس زد میں آ گئے اور چاروں طرف باغیوں کا دور دورہ ہو گیا اور ہر جگہ بارک پور، میرٹھ، اور دہلی کے واقعات عام ہو گئے۔ انگریز سراسیمہ اور خوف زدہ ہو گئے، انھیں اپنی حکومت کی بنیادیں صاف طور پر ہلتی نظر آنے لگیں، لیکن اس تحریک کی بنیادی خامیوں کی بدولت یہ حالات زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے اور انہوں نے ایسا رخ بدلا کہ باغیوں کی انگریزی فوج کو مسلسل شکست دینے والی قوت بہت جلد مدافعت کے بھی قابل نہ رہی۔

انگریزوں نے پھر سے ان تمام مقبوضات پر قبضہ کر لیا جو ان کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، اس کے بعد بے مثال انگریزی مظالم کا باب کھل گیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کے ایک ایک باغی شخص کو چن چن کر قتل کر ڈالا۔ ان کے انتقام کا جذبہ اتنے پر ہی پورا نہ ہوا، بلکہ سینکڑوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، ہزاروں معصوموں کو نئی نئی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچا کر ختم کیا گیا، مکانوں میں آگ لگا کر تسکین حاصل کی گئی، ہندوستانیوں کی دولت اور عزت سر بازار لوٹ کر قہقہہ لگائے گئے۔ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ کے ساتھ قیدیوں کا سلوک کیا گیا۔ اسے جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا وہیں اس کا انتقال ہوا۔ تحریک کے لیڈروں کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ الغرض ظلم کا کوئی طریقہ اور ذریعہ ایسا نہ رہا جو ہندوستانیوں پر استعمال نہ کیا گیا ہو اور اس طرح ۱۸۵۸ء کے آخر تک اس بغاوت کا بری طرح کچل کر خاتمہ کر دیا گیا۔

اس ہنگامہ کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا، اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس بغاوت میں شریک تھے لیکن انگریزوں کا طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ زیادہ خصومت آمیز ہو گیا، ان کے نزدیک مسلمان ہی اس ہنگامے کے ذمہ دار تھے جنہوں نے دوبارہ حکومت کرنے کے خیال سے فوج کی بددلی کو تاڑ لیا اور اپنی ریشہ دوانیوں سے اس چنگاری کو بھڑکا کر آگ لگا دی، چنانچہ انگریزی حکومت کا سارا عتاب مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ انگریزوں نے انہیں اپنے مذہب اور اپنی حکومت کا مخالف اور دشمن سمجھ کر سخت سے سخت انتقام لیا، انہیں ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ جان کر ہر طرح تباہ و برباد کیا گیا اور وہ قوم جس کے عزم و تعلیم اور ذہنی صلاحیت کا انگریز خود اعتراف کرتے تھے دن بہ دن روبہ زوال ہوتی چلی گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد مسلمانان ہند پر ذلت وادبار، پستی و حقارت، اور جسمانی وروحانی اذیتوں اور جانگداز کربناکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا، خوف وہراس مسلمانوں کا مقدر بن گیا، مظلومیت و بے چارگی اور احساس کمتری و بے بسی کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا، ظلم و جبر کے ایسے روح فرسا مناظر سامنے آئے کہ آنکھوں سے خون کے آنسو چھلک پڑے، مسلمانوں کی معزز و ممتاز ترین شخصیتوں، نوابوں، جاگیرداروں، زمین داروں، رؤسا و امراء، علماء و مشائخ کو دہلی کے چاندنی چوک میں گڑی ہوئی پھانسیوں پر لٹکتے ہوئے اور ذبح کیے ہوئے مرغ بسمل کی طرح تڑپتے اور پھڑکتے ہوئے دیکھا گیا اور ایسی عبرتناک انتقامی آگ کی بھٹی میں مسلمانوں کو جلتے بھنتے دیکھا گیا کہ آنکھیں کھول کر ان خوفناک نظاروں کو دیکھنا بھی ایک انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔

جب انگریز دہلی کی شاہراہوں کو عارضی حکومت واقتدار کے مالک طبقہ کے خون سے لالہ زار بنا چکے تو پھر ان لوگوں کی تلاش و جستجو شروع کی گئی جنہوں نے انگریزوں کے جابرانہ اقتدار کے خلاف ہونے والی بغاوت میں کچھ بھی تعاون کیا، لوگوں کو ورغلایا، انگریز پولیس سے مزاحمت کی، فتویٰ لکھا، زبان سے دو جملے کہے یا اپنی زندگی میں کبھی بھی انگریزی منصوبے کو ناکام بنانے میں عملی حصہ لیا تھا۔ انگریزی فوجوں کے گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز شہر بہ شہر قریہ بہ

قریہ گاؤں اور دیہاتوں تک میں سنی گئی۔ چھوٹے بڑے مسلمان رئیسوں، زمینداروں اور جاگیر داروں کے محلات و مکانات اور حویلیوں کو مسمار کر دیا، مخبروں کا جال پھیلا کر ہر علاقہ کے سر بر آوردہ اور ممتاز مسلمانوں کو گرفتار کر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر کالے پانی بھیج دیا اور ایسی عبرتناک زندگی گذارنے پر مجبور کیا جو موت سے کہیں بدتر تھیں۔

۱۸۵۷ کے ہنگامہ کے نتیجے میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ ظلم و بربریت اور سفاکی کا جو خونی کھیل کھیلا، اس سے انسانیت شرمسار ہو جاتی ہے، ذیل میں انگریزی مظالم کے چند واقعات ذکر کیے جاتے ہیں جن سے خود کو مہذب اور عدل پرور کہنے والی انگریز قوم کا حقیقی چہرہ سامنے آتا ہے، ان واقعات کی اہمیت اور صداقت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ واقعات ایک انگریز مصنف 'ایڈورڈ ٹامسن' کے قلم سے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، ایڈورڈ ٹامسن نے انگریزی زبان میں ایک کتاب 'The other side of the medal' کے نام سے لکھی، اس کتاب کا اردو میں شیخ حسام الدین نے 'انقلاب: ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ' کے نام سے ایک آزاد ترجمہ کر کے ۱۹۳۱ میں شائع کیا، ذیل میں ۱۸۵۷ کے حوالہ سے جن واقعات کو نقل کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر اسی ترجمہ شدہ کتاب سے ماخوذ ہیں۔

مسٹر نکلسن، مسٹر ایڈورز کو خط لکھتے ہوئے یوں رقمطراز ہوتا ہے کہ:

> دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ ہی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا

کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسب ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔[1]

جن اذیتوں کو دینے کے آرزو کا اظہار نکلسن نے نہایت بے چینی سے کیا تھا ان کے پورے ہونے میں کچھ زیادہ عرصہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر موبرے تھامسن نے بعض قیدیوں کی دردناک سرگذشت جن کو اس نے خود قید کیا تھا سر ہنری کارٹن کو ذیل کے الفاظ میں سنائی:

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا: آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ ہم نے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں قیدیوں کے ساتھ زیادتی نہ کی گئی ہو، میں فوراً لپک کر ان کے خیمے میں گیا جہاں پر میں نے ان بدبخت مسلمانوں کو عالم نزاع میں بے حال دیکھا، یعنی مشکیں باندھ کر برہنہ ان کو زمین پر لٹایا ہوا تھا اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا، اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔[2]

اسی دن ۲۳ باغیوں کو تو صرف کرنل لی ہے (Leahy) کے حکم سے فی الفور جان سے مار دیا گیا، اس کے علاوہ بے شمار انسانوں کو فوجی عدالت کے حکم سے قتل کیا گیا، مارشل لا یعنی فوجی قانون پورے پانچ مہینے تک نافذ رہا اور تقریباً دو سو آدمیوں پر مقدمات چلائے گئے، صرف ایک ماہ کی قلیل مدت کے اندر اندر ۴۷ مردوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا، جن میں سے بعض کی لاشوں کو زنجیروں میں جکڑ کر عام شاہراہوں میں لٹکا دیا اور

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن، انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ، مترجم، شیخ حسام الدین ص، ۴۲

[2] بحوالہ ایضاً، ص، ۴۵

بعض کے سر کاٹ کر بانسوں پر لٹکائے گئے، باقی ماندہ مجرموں کو نہایت بے دردی اور وحشیانہ طریق سے کوڑوں اور بیدوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین جو کہ آئرلینڈ کے رہنے والے تھے، انہوں نے ہندوستانیوں پر ظلم وزیادتی کے حوالے سے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا:

> زندہ مسلمانوں کو سوور کے کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سوور کے چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم اور ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔ اس قسم کی دردناک جسمانی اور دماغی سزاؤں کے دینے کا ہمیں مطلقاً کوئی حق نہیں اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔[1]

میجر ریناوڈ کو جب وہ ہراول فوج کا ایک دستہ لے کر کانپور کے محصورین کی امداد کے لیے روانہ ہو رہا تھا، جرنل نیل کی طرف سے ذیل کی ہدایات موصول ہوئیں:

> بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بناء پر عام تباہی کے لیے منتخب کر دیا گیا ہے، یہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرے میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے، کیوں کہ اس قصبہ نے بغاوت میں

[1] ایڈورڈ ٹامسن، انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ، مترجم، شیخ حسام الدین ص ۴۸،

> حصہ لیا ہے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں اور بالخصوص فتح پور کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اگر وہاں کا ڈپٹی کلکٹر قابو میں آجائے تو اسے وہیں پھانسی دے دی جائے اور اس کے سر کو کاٹ کر وہاں کی سب سے بڑی عمارت پر لٹکایا جائے۔[1]

جنرل نیل کے سپاہی ایک ایک گاؤں میں گھستے تھے، جتنے آدمی انہیں راستے میں ملتے تھے انہیں وہ بغیر کسی امتیاز کے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے یا گولی سے اڑا دیتے تھے اور یا پھانسی پر لٹکا دیتے تھے۔ جگہ جگہ پر پھانسی کے تختے کھڑے کیے گئے جن پر چوبیس چوبیس گھنٹے برابر کام جاری رہتا تھا۔ جب ان سے بھی کام نہ چلا تو انگریز افسروں نے درختوں کی شاخوں سے پھانسی کا کام لینا شروع کیا، جس آدمی کو پھانسی دینا ہوتی تھی اسے اکثر ہاتھی پر بیٹھا دیا جاتا تھا، ہاتھی کو کسی اونچی ڈال کے پاس لے جایا جاتا، اس آدمی کی گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر اسے ڈال کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا، پھر ہاتھی کو ہٹا لیا جاتا تھا اور لٹکتی ہوئی لاش کو اسی جگہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔

لارڈ کیننگ اپنے ایک مراسلہ میں جو ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، یورپین قوم کی طبائع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ہماری قوم کے دماغ میں ایک عالم گیر دیوانگی اور انتقام کا جذبہ موجزن ہے۔ چنانچہ اس میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن سے بہتر طرز عمل کی توقع تھی۔ ایسی گری ہوئی ذہنیت کو دیکھ کر ناممکن ہے کہ ان کے ہم قوم ساتھیوں کی گردنیں ندامت اور شرمندگی سے نہ جھک جائیں، کیونکہ ہر دس آدمیوں میں سے ایک بھی تو ایسا دکھائی نہیں دیتا جو چالیس یا پچاس ہزار انسانوں کے بے دریغ قتل و پھانسی کو ضروری اور صحیح نہ سمجھتا ہو۔[2]

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن، انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ، مترجم، شیخ حسام الدین ص، ۵۲

[2] بحوالہ ایضا، ص، ۵۴

ایک موقع سے ہندوستانیوں کو سزا دیتے وقت قیدیوں کو بازوؤں سے پیچھے کی طرف باندھ کر دس دس کی ٹولیوں میں میدان میں گولیوں سے اڑا دینے کے لیے باہر گھسیٹا گیا، جب تقریباً ڈیڑھ سو باغیوں کو اس طرح گولی سے اڑا دیا گیا تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا سپاہی تھا، اس لیے آرام کرنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا، چنانچہ اس کے بعد قتل کی کارروائی کو دوبارہ شروع کیا گیا اور جب تعداد ۲۳۷ تک پہنچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں کہ وہ چند گھنٹے پہلے عارضی طور پر بند کر دیے گئے تھے۔ اس پر برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت ہی دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا، یعنی ۴۵ انسانوں کی مردہ لاشیں باہر لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔

ٹائمز کا ایک نامہ نگار اس وقت کے حالات لکھتا ہے:

> میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے، کیونکہ کل ایک ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب ایک افسر بیس سپاہی کو لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہو لیا اور راستے میں ہم نے چودہ عورتوں کی نعشوں کو شالوں میں لپیٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کیے تھے۔ چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ ان مستورات کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریزی سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں تو وہ اس کی عصمت دری کر دیں گے۔ اس لیے بحالت

موجودہ اپنے ناموس کی تحفظ کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد انہوں نے خود بھی خود کشی کرلی۔ چنانچہ ہم نے ان کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔[1]

کے اور مالیسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ :

جو لوگ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے ان کو ہاتھوں اور پیروں کو تفریح کے لیے انگریزی کے آٹھ اور نو کے ہندسوں کی شکل میں باندھ دیا جاتا تھا۔ جب یہ ترکیبیں بھی کافی نہ دکھائی دیں تو انگریز افسروں نے گاؤں کے گاؤں جلانے شروع کر دیے۔ گاؤں کے باہر توپیں لگادی جاتی تھیں اور سب مردوں، عورتوں اور بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگادی جاتی تھی۔ کئی انگریز افسروں نے بڑے فخر کے ساتھ ان دردناک نظاروں کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے۔ آگ اتنی ہوشیاری سے لگائی جاتی تھی کہ ایک بھی گاؤں والا نہ بچ سکے۔ چارلس بال لکھتا ہے کہ مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے، بچھونوں کے اندر جلا کر خاک کر دیے گئے۔[2]

ایک انگریز اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ ہم نے ایک بڑے گاؤں کو آگ لگائی جس میں لوگ بھرے ہوئے تھے، ہم نے انہیں گھیر لیا اور جب وہ آگ کی لپٹوں میں سے نکل کر بھاگنے لگے تو ہم نے انہیں گولیوں سے اڑادیا، ایک اور انگریز افسر جو ان لوگوں کے توپ سے اڑائے جانے کے وقت موجود تھا اس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :

اس دن کے پریڈ کا منظر عجیب تھا، پریڈ پر تقریبا نو ہزار سپاہی تھے۔ ایک چورس میدان کے تین طرف فوج کھڑی کر دی گئی تھی۔ چوتھی طرف دس توپیں تھیں۔ پہلے دس قیدی توپوں کے منہ سے باندھ دیے گئے۔ اس کے بعد توپ خانے کے افسر نے اپنی تلوار ہلائی۔ فورا

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن، انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ، مترجم، شیخ حسام الدین ص، ۸۰

[2] پنڈت سندر لال، سن ستاون، ص، ۸۶

> توپوں کی گرج سنائی دی اور دھویں کے اوپر ہاتھ پیر اور سر چاروں طرف ہوا میں اڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ یہ منظر چار بار دہرایا گیا۔ ہر بار ساری فوج میں سے ایک زور کی گونج سنائی دیتی تھی جو نظارے کی ہیبت ناکی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں سے نکلتی تھی۔ اس وقت سے ہر ہفتے میں ایک یا دو بار اسی طرح سے جان لینے کی پریڈ ہوتی رہتی ہے اور ہمیں اس کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اب ہم پر اس کاروائی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔[1]

مانٹ مگری مارٹن لکھتا ہے

> جس وقت ہماری فوج شہر میں داخل ہوئی تو جتنے شہری شہر کی دیواروں کے اندر پائے گئے انہیں اسی جگہ سنگینوں سے مار ڈالا گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی تعداد کتنی زیادہ ہو گی۔ جب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ایک ایک مکان میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس آدمی چھپے ہوئے تھے یہ لوگ بلوائی نہ تھے، بلکہ شہر کے باشندے تھے جنہیں ہماری مشہور نرم دلی اور معافی پر بھروسہ تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انہیں مایوسی ہوئی۔[2]

مندرجہ بالا واقعات بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستانی باشندوں کے ساتھ ظلم و بربریت اور درندگی کا کیسا خونی کھیل کھیلا، ان مظلومین میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے ہنگامہ میں کسی طرح کا کوئی حصہ نہیں لیا، اور جن لوگوں نے حصہ لیا وہ بھی انگریز حکمرانوں کی ظلم و زیادتی اور متعصبانہ برتاؤ سے تنگ آکر، اس ہنگامہ کے ذریعہ وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنے ملک میں ایک آزادانہ زندگی گزارنا چاہتے تھے، لیکن اس کے بدلے انہیں عزت و آبرو اور جانوں کی وہ قربانی پیش کرنی پڑی جس کا خیال آج بھی انسانوں کو سہادیتا ہے، ۱۸۵۷ کے بعد کے واقعات نے انگریزوں کے ظالمانہ وسفاکانہ حقیقی چہروں سے ساری دنیا کو متعارف کرادیا۔

---

[1] پنڈت سندر لال، سن ستاون، ص، ۱۲۰

[2] بحوالہ ایضا، ص، ۱۶۲

اردو صحافت کا نو آبادیات مخالف رویہ

نو آبادیاتی ہندوستان میں انگریزوں کا یہی وہ طرز حکومت اور نظام عدالت تھا جس کا مختصر خاکہ ما قبل میں پیش کیا گیا۔ ہندوستانی عوام نے جب ملک کو اس خطرناک ڈگر پر چلتے اور خطرات کے ان مہیب بادلوں سے چھاتے ہوئے دیکھا تو ان میں اپنے وطن عزیز کی حفاظت کی فکر لاحق ہوئی، قومی آزادی کی تحریک نے جنم لیا، ہندوستانی باشندوں کے ہر طبقے نے اپنے مشترک مفاد یعنی انگریزی حکومت کے خاتمہ اور اپنی قومی وملکی حکومت کے قیام کے لئے تن من دھن کی بازی لگا کر اس تحریک میں حصہ لیا، سامراجیت کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنے میں بھی کوئی دریغ نہیں کیا۔ سامراجی حکومت نے جب دیکھا کہ یہاں کے باشندوں میں آزادی کی چنگاری تیز ہونے لگی ہے تو جبر و تشدد کے ساتھ اسے دبانے کی کوشش کرنے لگی، اسی کے ساتھ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کے فارمولے پر بھی عمل کرنے لگی، جس کی وجہ سے غلامی سے نجات حاصل کرنے کی یہ تحریک کمزور تو پڑی اور حصول آزادی میں تاخیر تو ہوئی لیکن باشندگان ہند نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر بالآخر اسے حاصل کر ہی لیا۔

اس پورے سفر میں ہندوستانی عوام کے ہر طبقے نے اپنے اپنے طور پر بساط بھر کوشش کی، صحافت اور خاص کر اردو صحافت کی خدمات کا باب بھی اس سلسلے میں تابناک اور روشن ہے، اردو اخبارات میں اودھ پنچ نے خاص کر نو آبادیاتی نظام حکومت اور مغربی تہذیب و معاشرت کے خلاف سینہ سپر ہو کر بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نمایاں کردار ادا کیا، اسی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے اودھ پنچ کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "انیسویں صدی کے آخر میں سیاسی بیداری نے دو بڑے ہنگاموں کی صورت میں اظہار پایا، پہلا ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، دوسرا ہنگامہ اودھ پنچ، یہاں جنگ آزادی قلم سے لڑی گئی۔"

انگریزوں نے اپنی شاطرانہ وعیارانہ چالوں کی بدولت ہندوستان پر جب مکمل اقتدار حاصل کر لیااور برطانوی حکمرانوں نے زمام اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو ہندوستانیوں کے ساتھ غلامانہ سلوک اور برتاؤ کرنا شروع کر دیا، ہندوستانیوں سے ملنا جلنا، انھیں اپنے قریب بیٹھانا اور ان کے ساتھ کھانا پینا گوارا نہیں کیا۔ ان چیزوں کو وہ لوگ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھنے لگے، ہندوستانیوں کو طرح طرح سے ذلیل ورسوا کیا گیا اور ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک روا رکھے گئے۔ عدل و انصاف میں بھی عدالتوں میں دوہرا معیار قائم رکھا گیا اور ہر معاملہ میں ہندوستانیوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو فوقیت دی گئی، چنانچہ ان بگڑتی ہوئی صورت حال کا اردو اخبارات نے نوٹس لیا اور اس طرح کے جانب دارانہ رویے اور توہین آمیز سلوک کے خلاف اخبارات نے لکھنا شروع کیا، اخباروں کے ذریعہ احتجاج کیا لیکن مغرور حکمرانوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

چنانچہ انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی ظلم وزیادتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی باشندوں میں قومی آزادی کی تحریک نے جنم لیا۔ ملک کے سارے طبقے کے لوگ اپنے مشترک مفاد یعنی برطانوی حکومت کے خاتمے اور اپنی قومی حکومت بنانے اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے میں متحد ہو کر اس تحریک میں حصہ لینے لگے، جیسے جیسے یہاں کے باشندوں پر مصیبت اور مفلوک الحالی بڑھتی گئی اسی قدر یہ آزادی کی تحریک زور پکڑتی گئی، اور اسی کے ساتھ انگریزی درندے اسی قدر جبر و تشدد سے اس کے دبانے کی کوشش میں لگے رہے، ظلم و ستم اور استحصال کا اضافہ بھی ہوتا رہا۔ بسا اوقات مکار حکمرانوں نے اس کو دبانے کے لیے زور و ظلم کے علاوہ دوسرے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے، مثال کے طور پر مقامی سرمایہ داروں کو رشوت کے طور پر کچھ مراعات دے دی گئیں تو کبھی متوسط طبقے کو حکومت کی مشینری میں کھینچا گیا، لیکن قومی آزادی کی تحریک کا سیلاب کسی طرح روکے سے نہیں رکتا۔ آخر کار ایک وقت ایسا آیا کہ یہاں کے باشندوں کے عزائم اور بے مثال قربانیوں کے آگے انہیں جھکنا پڑا اور مجبور ہو کر انہیں آزادی دینی پڑی۔

انیسویں صدی کے اردو اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے واقعات بتاتے ہیں کہ نو آبادیاتی ہندوستان میں خود کو مہذب اور تہذیب و ثقافت کے علمبردار کہے جانے والے جھوٹے انگریزوں نے کس طرح کے غیر مہذب اور انسانیت سوز برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ کئے ہیں، طاقت و قوت کے زعم میں کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر انسانی عزت و حرمت کی ساری حدوں کو پار کر جانے والے انگریزوں کی ان ملعون حرکتوں کے خلاف اردو اخبارات نے کھل کر لکھا، ہندوستان کے سماجی و معاشرتی معاملات میں انگریزوں کے ذریعہ کی جانے والی دخل اندازیوں کو قطعاً برداشت نہیں کیا اور اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت کو انگریزوں کے ذریعہ بگاڑے جانے کی ہر کوشش کو ناکام کرنے کی قابل ستائش کوشش کی۔ انگریزی حکام کی ملمع سازی اور تہذیب و تمدن کے جھوٹے لبادہ کا پردہ چاک کرنے میں ان اخبارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستانی عوام کو صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز قائم کر کے صحیح لائحۂ عمل مرتب کرنے کا سبق دیا۔

منشور محمدی جو بنگلور سے منشی محمد شریف کے ہاتھوں ۱۸۷۶ء میں جاری ہوا تھا، اس کا بنیادی مقصد تو انگریز مشنریوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے دینی و مذہبی عقائد پر حملہ کا دفاع تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ نو آبادیاتی ہندوستان میں باشندگان ہند کے ساتھ انگریزوں کے ذریعہ کئے جانے والے برتاؤ اور عوام مخالف پالیسیوں کا بھی پردہ فاش کرتا تھا، چنانچہ ۱۶/اگست ۱۸۸۶ء کے شمارہ میں اس اخبار نے انگریزوں کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کا حال بیان کیا ہے، اس وقت مصر کو بھی انگریزوں نے اپنی غلامی کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا، چنانچہ درج ذیل اقتباس سے اس وقت کے مصر اور ہندوستانی نو آبادیات کا حال ہمیں معلوم ہوتا ہے:

> مصر کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے مختلف عہدوں اور خدمتوں پر ممالک غیر کے ۷/۳/ہزار ۲ سو/۱۶/اشخاص مامور و فائز ہیں، ان میں زیادہ تر انگریز ہیں جن کی تعداد ۳/ ہزار ۴/ سو ۲۰/ ہے، ان کے بعد فرانس، آسٹریلیا، جرمنی، یونان، بلجیم، روس،

امریکہ، بلگیریا، ہالینڈ اور ڈنمارک وغیرہ ممالک کے باشندے ہیں، جس ملک کا خون ممالک غیر کی اس قدر جونکیں چوس رہی ہوں اس کی زندگی کا خدا حافظ ہے، ہندوستان کی بھی یہی حالت ہے، جس قدر بڑے اور منتخر عہدے ہیں، سب خوش قسمت انگریزوں ہی کو نصیب ہیں، ہندوستان کو بجز افلاس اور مصیبت کے کچھ نہیں ملتا، افسوس جو لوگ ہندوستان سے ہزاروں کوس دور اور سینکڑوں دریاپار اس کے نام نامی اور شکل وہیئت سے بھی ناواقف ہیں وہ تو اس کے روپیہ، پیداوار (جان مال) سے پرورش پاتے اور چین اڑاتے ہیں اور جنھوں نے آغوش ہند میں پرورش پائی، اس کے آب و گل سے بنے، جو اہل وطن و فرزندان ہند ہیں اور بیچارے مسافرت تو در کنار اپنے ہی وطن میں بھوکوں مرتے ہیں، کوئی نہیں پوچھتا۔ اگر پوچھے بھی گئے تو ٹکے کے دس دس، علاقہ ضبط، جائداد قرق، روزگار عنقا، ملازمت غائب، ملکیت سے بے دخل، صنعت کو کوئی نہیں پوچھتا، حرفت کا پتہ نہیں، کوئی مزدور البتہ پوچھا جاتا ہے وہ بھی صاحب بہادر کا پنکھا قلی، بیرا، خانساماں، حمال یا شملہ پر لیڈی صاحب لوگوں کی بگھی کھینچنے کے لئے گھوڑوں کی جگہ، بس اور مفلسی و فاقہ مستی کے حوالے، عبرت، افسوس، عبرت۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ خود کو مہذب کہلانے والے تعلیم یافتہ انگریزوں اور ہندوستان کی ترقی کا نعرہ دینے والے حکمرانوں کا ہندوستان اور اس کے باشندوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا، اپنے ہی ملک میں اہل ہند کے ساتھ کس طرح جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا تھا، اور ہندوستانیوں کو معاشی و تعلیمی ترقی سے دور رکھنے کے لئے انگریزوں نے کس طرح کی منظم ظالمانہ و شاطرانہ چالیں چلیں، ہندوستانی معیشت کو برباد کرنے اور ہندوستان سے مال و دولت کو اپنے ملک منتقل کرنے کے جو حربے انگریزوں نے استعمال کئے ان پر بھی اس اخبار نے مختصر روشنی ڈالی ہے:

---

[1] بحوالہ: امداد صابری، روح صحافت، ص ۴۱

> ہندوستان کا سولہ کروڑ روپیہ ۲۵/ہزار انگریزوں کی جیب میں بطور تنخواہ داخل ہوتا ہے، چار کروڑ بقدرے تجارت یہاں سے جاتا ہے، لیکن ۱۶/ کروڑ ہی نہیں ہے جو تنخواہوں کی صورت میں انگریزی جیبوں میں جاتا ہے، یہ تو وہ رقم ہے جو ۲۵/ہزار انگریز لیتے ہیں جن کی تنخواہیں ایک سو روپے سے زیادہ ہیں، حالانکہ ہزاروں اور یوریشین ایسے ہیں جو اس سے کم تنخواہ پاتے ہیں، علاوہ بریں ۷۵/ہزار انگریزی سپاہ ہندوستان کے روپیہ سے پیٹ پالتی ہے اور یہ حساب کیا گیا ہے کہ ایک سپاہی پر دو ہزار روپیہ سال صرف ہوتا ہے۔[1]

انگریز ہندوستانیوں کو اس قدر حقیر و ذلیل گردانتے تھے کہ انگریزوں کے مقابلے میں ہندی باشندوں کی توہین اور بے عزتی میں کسی بھی طرح کی کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے، حتی کہ انگریزی جوتے کے مقابلے میں ہندوستانی باشندے کی کوئی عزت نہیں تھی، چنانچہ ایک ہندوستانی کے ذریعہ انگریزی جوتا پہن کر انگریز کے سامنے آنے پر کس قدر اس کی بے عزتی کی گئی اور کیسا ہتک آمیز سلوک اس ہندوستانی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی ایک جھلک اودھ اخبار کے ۶/مارچ ۱۸۷۶ء کے شمارہ میں دیکھنے کو ملتی ہے:

> ممالک مغربی کے ایک حاکم صاحب بہادر نے ایک مختار کی جو جوتا پہن کر صاحب بہادر کی حضور میں حاضر ہوا تھا، یہاں تک تواضع کی کہ انھیں جوتوں کو جو وہ پہن کر آیا تھا، اس کے پاؤں سے نکلوا کر اس کے سر پر رکھوا کر اور عرصہ تک کھڑا رکھا اور فرمایا کہ اب تم سمجھا کہ ہم اس سے ناراض ہوتے ہیں، اگرچہ یہ خبر صحیح ہے اور قومی امید ہے کہ صحیح ہو گی کیوں کہ کئی تحریریں چند صاحبوں کی اس ضمن میں موصول ہوئیں، تو ہم انگریزی جوتے پہننے والے ہندوستانیوں پر سخت افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی عزت اس جوتے کی ہے جس کی ہم تعریف کرتے ہیں، فی الواقع جوتے کی عزت میں تو اب فرق نہیں آیا بلکہ اس کی عزت بدرجہا

[1] منشور محمدی، بنگلور، یکم جنوری ۱۸۸۶

> بڑھ گئی، گویا ایک انسان کی عزت و آبرو خاک میں ملی۔ بڑے شرم کی بات ہے اور کمال غیرت کا موجب ہے اگراب بھی اس وضع کے تمام رئیس اور وکیل اور مختار متفق ہو کر اس کا استغاثہ نہ کریں، پس جیسی عزت یا ذلت ایک شخص کی ہوئی ایسی ہی سب کی ہوئی۔[1]

اودھ اخبار جو اردو زبان وادب کی خدمت اور اسے فروغ دینے میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، وہ مغربی تہذیب کا ناقد بھی تھا۔ انگریز خود کو مہذب سمجھتے تھے اور ان کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے کچھ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں بھی ان کی تہذیبی برتری کا تصور تھا، اس اخبار نے ایک موقع سے انگریزی تہذیب کی اصلیت اور حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

> ولایت کا تو ہم ذکر نہیں کرتے کیوں کہ وہ مرکز تہذیب ہے، ہندوستان ہی میں ان کی تہذیب نے وہ غضب ڈھایا ہے کہ الامان والحفیظ۔ ہمارے کان میں ہر مہینہ یہ آواز پہنچتی ہے کہ فلاں صاحب کی میم صاحبہ کو فلاں صاحب لے کر بھاگ گئے، اور ان پر وہاں نالش ہوئی اور فلاں پہاڑ پر یا فلاں بنگلہ پر گرفتار ہوئے۔ میم صاحبہ نے بعد گرفتاری کے اقرار کیا کہ ہم خوشی سے چلا آیا، ہم اپنے صاحب سے راضی نہیں ہیں، یہ صاحب ہم کو پسند ہے اور یہ واقعات کچھ مزدوروں، قلیوں میں نہیں ہوئے، بلکہ کوئی فوج کا کپتان صاحب یا کرنل صاحب ہوتے ہیں۔ کوئی کسی محکمہ کے افسر ہوتے ہیں، کوئی کسی جگہ کے رئیس ہوتے ہیں، پس جب ایک مہذب قوم کے جنٹلمین اور شرفا کا یہ حال ہو کہ اغوائے عورت اور جرم زنا میں سزایاب ہوں اور پھر ہمیشہ اس کے ارتکاب میں ثابت قدم و پختہ دم رہیں تو اس قوم کے ارزال اور غیر مہذب لوگوں کا کیا حال ہوگا۔[2]

---

[1] بحوالہ: امداد صابری، روح صحافت، ص ۳۰۹

[2] بحوالہ: ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ۴۸۴

انگریز حکام ہندوستانیوں سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ باوجود دوستانہ تعلقات کے ان سے ملاقات تک نہیں کرتے تھے، اگر کبھی کوئی ہندوستانی انگریز کے گھر پہنچ جائے تو اسے نکال دینے یا بے توجہی کا اظہار کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے تھے، کسی معمولی قسم کے انگریز کے مقابلہ میں کسی معزز ہندوستانی کی بے عزتی اور تذلیل عام بات تھی، ریل میں سفر کرتے ہوئے بے شمار ایسے واقعات پیش آتے تھے جن میں ہندوستانیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ذلت ورسوائی کے معاملات ہوتے رہتے تھے، شکایت کے باوجود انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہندوستانیوں کو ہی مورد الزام ٹھہرادیا جاتا تھا، ایسے ہی ایک واقعہ کو اخبار مرقعۂ تہذیب لکھنؤ نے شائع کیا:

> پندرہ تاریخ اکتوبر سنہ حال کو اودھ روہیل کھنڈ ریلوے پر نیا ماجرا پیش آیا۔ ایک ہندوستانی رئیس سکنڈ کلاس میں سوار ہوئے تھے ایک بہادر صاحب بھی اسی گاڑی میں تشریف لائے اور ہندوستانی صاحب کے اسباب کو پھینکنا شروع کر دیا۔ آخر میں جب ہندوستانی صاحب نے اپنی خطا دریافت کی تو صاحب بہادر اس کے در جواب گھونسا اور لکڑی سے یہاں تک پیش آئے کہ اگر ٹرین روک کر کانسٹیبل اور لوگ بیچ بچاؤنہ کرتے تو اس کی جان بچنے میں کلام تھا، جزاک اللہ، واہ کیا تہذیب ہے، کیا علم، کیا ادب، کیا حکمت پیشگی کا برتاؤ ہے، شائستگی کا خوب نام روشن ہوا۔[1]

اودھ پنچ جسے ۱۶/ جنوری ۱۸۷۷ء کو منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے ہفت روزہ اخبار کی شکل میں جاری کیا تھا، اس کا بنیادی مقصد مغربی تہذیب و معاشرت کی کورانہ تقلید کی مخالفت تھا، اس اخبار نے جہاں انگریزوں کو ہدف تنقید و ملامت بنایا، وہیں ان لوگوں پر بھی سخت تنقید کی جو مغربی تہذیب کی چمک دمک سے مسحور ہو کر اپنی تہذیب و تمدن کے بارے میں احساس کمتری کا شکار تھے، اس اخبار نے اپنے جدید طرز نگارش کو اپناتے ہوئے طنز و مزاح کے پیرایۂ اظہار

---

[1] مرقع تہذیب، یکم نومبر ۱۸۷۳

میں نو آبادیاتی ہندوستان میں مغربی تہذیب و کلچر کو فروغ دینے اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے خاتمہ کے لئے انگریزوں کے ذریعہ کی جانے والی منظم کوششوں کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے اس کا دفاع کیا،اور اس حوالہ سے اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین اور دیگر معاونین اور قلم کاروں نے جو صحافتی خدمات پیش کیں وہ تاریخ کے صفحات کا زریں باب ہے۔

انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی ظلم وزیادتی سے دل برداشتہ ہو کر اودھ پنچ نے لکھا:

> دنیا میں ان حکام کو جو بندۂ طمع اور غلام حرص ہیں گرم گرم سنہری روپہلی نوالے کھلا کر شرابیں پلا کر رضامندی کر لیں، بعض بے گناہوں کو گولیوں سے اڑائیں، پھانسیاں دیں، کسی کے ہاتھوں میں بچھو سے ڈنک لگوائیں، مرچوں کے توبڑے ان کے منہ پر چڑھائیں، کولھو میں ڈال کر پیسیں ان کے خون کا گارا بنایا جائے، ان کی ہڈیوں کی دیواریں چنوائی جائیں، لیکن دنیا فانی ہے۔ان سختیوں کا زمانہ عنقریب ختم ہو جائے گا۔ مگر عقبی کے وبال کا پنسارہ ان کے کاندھے پر ہوگا،اور اس عذاب میں وہ گرفتار ہونگے کہ دنیا بھر کے عذابات جو یوم ظلم سے قیامت تک جمع کیے جائیں وہ اس کی گرد کو چھو نہیں سکتے۔ پرائی جان بلکہ جانوں کا لینا کسی نا بالغ کی دولت کا لینا نہیں ہے، خون ناحق کا عوض ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔[1]

ایک جگہ اور انگریزی مظالم کے خلاف لکھتا ہے:

> دنیا میں بڑے بڑے ستم گاروں کی نوبتیں بج چکی ہیں۔ مگر پیشرؤوں نے دنیا ہی میں اس وبال کی جھلک دیکھ لی جو قیامت میں ان کے سر پر ٹپکا۔ یزید، مروان، چنگیز، میراں، نادر، ہلاکو خان تغلق میرن گلام قادر اور ان کے سوا سینکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں ظالم کیا ہوئے

[1] اودھ پنچ، جلد شانزدہم، ۲۸جولائی، ۱۸۹۲ء

نادر نے دہلی کو قتل کیا۔ دہلی آج تک آباد ہے۔ نادر کی اولاد کا نام صفحۂ عالم سے مٹ گیا۔ فرعون نے بنی اسرائیل کا استحصال کرنا چاہا تھا مگر انجام کیا ہوا فرعون اور۔۔۔ کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ بنی اسرائیل ہٹے کٹے دندنا رہے ہیں۔ گونا ممکن سہی لیکن بالفرض اگر کسی ظالم نے ایک شہر کے آدمیوں کو کشتنی اور گردن زدنی سمجھ لیا ہے اور فرعون بے سامان بن کر قتل پر بالفرض کمر باندھے اور اس کی سنہری رنگت کی شوخی حکام کی آنکھوں پر موتیا بند کا بھوت سوار کر دے تو کیا نا بے گناہوں کے خون ناحق واہں قیامت کے دن اس دوزخ کا کندہ نہ بنائیے گا۔اور ضرور بنائیے گا دنیا میں بھی ایک نہ ایک دن حقیقت کھل جائے گی۔[1]

اس طرح اودھ پنچ نے انگریزوں کی ظالمانہ روشوں کے خلاف بہت کچھ لکھا اور ہندوستانی باشندوں کی سیاسی، تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کی پاسداری میں نمایاں کردار ادا کیا، مذکورہ بالا اخباروں سے ماخوذ اقتباسات کے علاوہ بھی انیسویں صدی کے بہت سے اخبارات ہیں جنھوں نے اردو صحافت کی تاریخ میں نو آبادیات مخالف کردار ادا کیا ہے، انگریزی حکام کے ذریعہ کئے جانے والے تہذیبی، معاشرتی اور معیشتی حملوں سے ہندوستانی عوام کو باخبر کیا اور انگریزی تہذیب و کلچر کی حقیقی اور مہلک خرابیوں اور گندگیوں سے باشندگان ہند کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جو کہ اردو صحافت کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

[1] اودھ پنچ، جلد شانزدہم، ۲۸ جولائی، ۱۸۹۲ء

باب دوم

اودھ پنچ کا اجرا، اس کے نمائندہ قلم کار اور ہندوستان کا سماجی، سیاسی و معاشی پس منظر

- اودھ پنچ کا اجرا: ایک تعارف
- اودھ پنچ کے نمائندہ قلم کار اور ان کی تحریریں
- اودھ پنچ کا صحافتی دور اور ملک کا سیاسی، سماجی و معاشی پس منظر

اودھ پنچ کا اجرا، اس کے نمائندہ قلم کار اور ہندوستان کا سماجی، سیاسی و معاشی پس منظر

اودھ پنچ کا اجرا: ایک تعارف

اردو صحافت میں جدید طرز نگارش کا بانی، ہندوستانی تہذیب و تمدن کا علمبردار اور نوآبادیاتی نظام حکومت کا مخالف اودھ پنچ کا اجرا ۱۶/ جنوری ۱۸۷۷ء بروز منگل عظیم صحافی منشی سجاد حسین کے ہاتھوں عمل میں آیا، منشی جی نے انگریزی اخبار لندن پنچ (۱۸۴۱- ۲۰۰۲) کے طرز پر منشی محفوظ علی کے مشورہ سے لکھنؤ سے یہ اخبار جاری کیا۔ یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا جس کے مالک اور ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ ابتدا میں یہ اخبار مطبع کایستھ سماچار میں طبع ہوتا تھا، لیکن آغاز کے تقریباً دو مہینوں کے بعد ہی اخبار کا اپنا ذاتی مطبع لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں شام اودھ کے نام سے قائم ہو گیا، اس کے بعد سے اخبار کا دفتر اور مطبع یہی قرار پایا اور یہیں سے شائع ہونے لگا۔ ۱۶/ جنوری ۱۸۷۷ء کو جاری ہو کر بہت ہی قلیل عرصے میں عہد طفلی سے گذر کر منزل شباب میں جا پہنچا اور ملک کے طول و عرض میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ منشی سجاد حسین کی طویل علالت اور اخبار کی مالی تنگی نے اس کی ترقی کی رفتار کو دھیما کر دیا اور یہ زوال پذیر ہو گیا۔ بالآخر منشی جی کے انتقال سے تین سال قبل ان کی ادارت میں ۳۶/ سال تک پورے آب و تاب کے ساتھ جاری رہ کر ۱۹۱۲ء میں اس کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اودھ پنچ کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے قارئین کے مسلسل اصرار اور مطالبے پر حکیم محمد ممتاز حسین عثمانی نے جسٹس کرامت حسین کے مشورہ سے ۲۶/اکتوبر ۱۹۱۶ء کو اودھ پنچ کو دوبارہ جاری کیا۔ پہلے جیسی بات تو اب نہیں رہی، لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی وہ اپنے وقت کے تمام اخباروں سے ممتاز تھا اور اب بھی اسے قارئین میں قدر و منزلت حاصل تھی۔ اپنے دور ثانی میں ۱۷/ سالوں تک جاری رہنے کے بعد حکیم صاحب کے انتقال کی وجہ سے ۱۹۳۳ء میں دوبارہ اس کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے ظہیر حیدر نے ایک بار پھر اس کے اجرا کی کوشش کی اور ایک سال تک موت و زیست کی زبردست کشمکش

میں مبتلا رہ کر ۱۹۳۴ء میں نوجوان ایڈیٹر کی اچانک موت کی وجہ سے اودھ پنچ کی اشاعت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

جس وقت اودھ پنچ منظر عام پر آیا اس وقت تک اردو صحافت تقریباً نصف صدی کا سفر طے کر چکی تھی، اپنے آغاز سے لے کر اب تک اردو صحافت بہت سے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے ترقی کے درخشاں دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اودھ پنچ کے اجراسے پہلے کئی معیاری اور رجحان ساز اخبارات منظر عام پر آ چکے تھے اور میدان صحافت میں ان کی نمایاں حیثیت اور قابل قدر کارناموں کے لوگ قائل تھے اور اردو اخبارات کے قارئین کا ایک وسیع حلقہ ملک کے مختلف علاقوں میں قائم ہو چکا تھا، ماضی میں وجود پذیر ہونے والے اخبارات میں چند اخبارات نے تو انقلاب ۱۸۵۷ء میں ملکی اور قومی خدمات کے حوالے سے تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا تھا، لیکن ان تمام خصوصیات و کمالات کے باوجود اودھ پنچ کی اشاعت ہندوستانی صحافت اور خاص کر اردو صحافت کی تاریخ کا ایک یادگار کارنامہ اور زریں باب ہے۔

جس دور میں اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا، ہندوستانی تاریخ کے اس دور میں مختلف رجحانات آپس میں دست و گریباں تھے، ہندوستان کی قدیم تہذیب و معاشرت کے مقابلے میں مغربی تہذیب و تمدن کو تفوق و برتری حاصل ہو رہی تھی۔ ہندوستانی باشندوں کا ایک طبقہ اپنی قدیم روایات اور تہذیب و معاشرت کو کسی قیمت پر ختم ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا، دوسرا طبقہ وہ تھا جسے انگریزی تہذیب اور کلچر میں صرف خوبیاں ہی نظر آ رہی تھیں اور وہ آنکھیں بند کر کے مشرقی اقدار کو ختم کر کے مغربی طرز زندگی کو اپنائے جانے کا حامی و علمبردار تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو اعتدال و توازن کی راہ اپنانے کے حق میں تھا اور جدید و قدیم دونوں تہذیبوں میں پائی جانے والی خوبیوں سے استفادہ کر کے ایک مخلوط نئی تہذیب کو وجود میں لانا چاہتا تھا۔ لہٰذا ہندوستانی تاریخ کا وہ دور سماجی اعتبار سے ایک ہنگامی دور تھا اور اسی زمانہ میں اودھ پنچ نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد انگریزی تہذیب اور نو آبادیاتی ہندوستان میں سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی بے راہ روی اور حکومتی تعصب و جانب داری کی مخالفت تھا اور اس نے اس مقصد کے حصول کے لئے قدیم صحافتی طرز

نگارش سے ہٹ کر طنز و ظرافت کا ایک جدید طریقہ اختیار کیا، اس جدید طرز نگارش کی علت اور اس عہد میں طنز و ظرافت کے پیرایہ کو اختیار کرنے کے اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر نے لکھا ہے:

> ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں مختلف رجحانات ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے، اودھ پنچ نے اسی ہنگامی دور میں جنم لیا، جو حقیقت میں طنز و ظرافت کے فروغ کے لئے ایک نہایت مناسب دور تھا، کیوں کہ تضادات اور تصادمات کا یہ زمانہ اپنے اندر خود طنز و ظرافت کا بہترین مواد رکھتا تھا، کیوں کہ طنز ظرافت کے لئے سب سے زیادہ مناسب وہ زمانہ ہوتا ہے جب سماج ذہنی طور پر مختلف گروہوں میں بٹ جاتا ہے، بنیادی اقدار میں کش مکش شروع ہو جاتی ہے اور اکثریت کسی خاص روش کی مخالف ہوتی ہے، سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی زندگی میں بے چینیاں پیدا ہونے لگتی ہیں، نئی تہذیب اور نئے کلچر کی آمد سے قدیم و جدید کے ردوبدل اور مفاہمت و موافقت و مخالفت کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پرانا نظام تنزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور نئی قدریں اس کی جگہ لے لیتی ہیں، عوام و خواص کے رہن سہن اور طریقے، اخلاق و عادات، سوچ بچار کے انداز بدلنے لگتے ہیں، اعتدال و توازن معدوم ہو جاتا ہے، یہ عدم تناسب اور عدم توازن ناپسندیدگی اور نارضامندی کا محرک ہوتا ہے اور ناپسندیدگی اور نارضامندی طنز و ظرافت کو جنم دیتی ہے۔[1]

اودھ پنچ کا خدوخال

اودھ پنچ 12×9.5 کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، ہر صفحہ پر عموماً تین کالم ہوا کرتے تھے اور کبھی کبھی دو کالمی بھی ہوتا تھا، ہر کالم میں عموماً ۳۵/سطریں ہوتی تھیں، آگے چل کر یہ چار صفحات کے اضافہ کے ساتھ بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، ہر ہفتہ منگل کے دن شائع ہوتا تھا، اخبار کا سرورق مختلف اوقات میں بدلتا رہتا تھا، سرورق پر بھی کبھی

[1] ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، معاونین اودھ پنچ، ص ۸-۹

کبھی دواؤں کے اشتہارات شائع ہوتے تھے، اخبار کا ایک پرچہ بطور نمونہ درخواست کرنے پر بھیج دیا جاتا تھا اور اخبار کا چندہ پیشگی ہی وصول کر لیا جاتا تھا، جو کہ عوام سے سالانہ بارہ روپے، رؤساء سے پندرہ روپے اور والیان ملک سے بیس روپے لیا جاتا تھا۔ رقم بعد میں دینے پر کچھ رقم اور بھی بڑھا دی جاتی تھی۔ جو کوئی نامہ نگاری کا خواہشمند ہوتا اس سے پہلے کوئی مضمون منگوا لیا جاتا اور مضمون معیاری ہونے کی صورت میں اسے نامہ نگار کے طور پر متعین کر لیا جاتا تھا، پہلے شمارہ سے لے کر ابتدائی چند شماروں تک سرورق پر ایک مضحکہ خیز تصویر بنی ہوتی تھی جس میں ایک شخص کی زبان ہنسی کی وجہ سے باہر نکلی ہوئی ہے، اس کے دونوں ہاتھوں میں کاغذ کے دو بینر ہیں، داہنے ہاتھ میں لئے ہوئے بینر پر اخبار کی شرح قیمت درج ہے اور بائیں ہاتھ والے بینر میں اخبار کا اشتہار ہے، اشتہار کی عبارت اس طرح ہے:

> (۱) اودھ پنچ ہفتہ وار نکلتا ہے۔ (۲) بلا درخواست جن کی خدمت میں مرسل ہے دو پرچوں تک نامنظوری سے مطلع فرمائیں ورنہ خریداروں میں شمار کئے جائیں گے۔ (۳) ششماہی اور سالانہ کے خریدار جون یا دسمبر میں اطلاع موقوفی دیں۔ (۴) میعاد پیشگی، سالانہ: ۲ ماہ، ششماہی: ۲ ماہ، ماہواری: ۲ ہفتہ (۵) ہمعصروں کی خدمت میں بغرض تبادلہ، کارسپانڈنٹوں کو منت (۶) محصول ڈاک ۱۔۱۰ آنہ سالانہ بذمہ خریدار بیرونجات
>
> العبد سجاد حسین مہتمم

اس کے علاوہ اس تصویر میں بنے شخص کی ایک آنکھ میں 'اودھ 'اور دوسری آنکھ میں 'پنچ 'لکھا ہے، اس کے سر پر ایک پھندنے والی ٹوپی ہے جس پر اخبار کی تاریخ اشاعت اور ٹوپی کی پٹی پر انگریزی میں "OUDH PUNCH" درج ہے۔ اس شخص کی کمر پر ایک پٹی ہے جس پر انگریزی میں "LIFE IS PLEASURE" تحریر ہے، اس شخص کے دونوں جانب دو لوگوں نے تختیاں اٹھا رکھی ہیں جن میں سے ایک میں جلد نمبر اور دوسرے میں شمارہ نمبر درج ہے۔

اودھ پنچ کے مشتملات اور مخصوص کالم

اودھ پنچ کے پہلے شمارہ میں منشی سجاد حسین نے 'سرمۂ بینش' کے عنوان سے صفحہ ۸/پر ایک مضمون شائع کیا جو ایک طرح سے 'اودھ پنچ کی صحافتی پالیسی کا اعلان نامہ' تھا۔ اس عنوان کے تحت انہوں نے ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو لوگ خوش باش زندگی بسر کرتے ہیں اور خوشی و غم کے ہر واقعے میں کوئی نہ کوئی ہنسی اور خوشی کا پہلو نکال لیتے ہیں، خوشی اور مسرت ان ہی کو ملتی ہے، اس مضمون کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اودھ پنچ نے اپنے دور کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے اثر کو زائل کرنے کے لئے طنز و ظرافت کا دلکش منظر پیش کیا اور شوخی و شگفتگی کو اخبار کا لازمہ بنادیا۔ مضمون کی اہمیت اور الفاظ کی ساخت کے پیش نظر اس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> خوش رہنا اور خوش رکھنا اور خوش مزاجوں کی صحبت رکھنا کیا ہی نعمت ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت کم ایسے ہیں جن کو اس نعمت عظمیٰ کا کوئی حصہ میسر ہو، بڑے بڑے حکماء نے اس میں سر مارا، بڑے بڑے عقلمندوں نے اس کوچہ کی خاک چھانی، کسی نے آزادی کی کف دست میدان میں اس کا مسکن سمجھا، کوئی خلوت کے سنسان جنگل میں اس کی تلاش کرتا رہا، کوئی علم کے اونچے پہاڑ، ناہموار پہاڑیوں اور دوروں پر سرگرداں پھرا، مگر کسی کو ایسا وسیلہ نہ ملا جس سے خوشی کے رفیع الشان قصر تک رسائی ہوتی، ہاں اگر کچھ پایا تو ان لوگوں نے پایا جو یہ سمجھتے رہے کہ خوشی ہم میں نہ اون چیزوں میں ہے جو ہم کو خوشی کے واسطے عطا ہوئی ہوں اور سچ یہ ہے کہ ہمارا جی خوش، طبیعت بشاش، مزاج درست ہے تو سب چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں، چاروں طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی ہے، اور اگر ذرا بھی رنجیدہ خاطر ہوئے تو انتہا درجہ کی خوش آئند بات سخت ناگوار گذرتی ہے۔[1]

[1] اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد اول، شمارہ اول، ۱۶ جنوری ۱۸۷۷

اودھ پنچ میں شائع ہونے والے بعض مضامین بے حد طویل ہوتے تھے جو کہ ایک طرح کا نقص تھا اور طنز ظرافت کے منافی بھی، چنانچہ اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین کو اس کا احساس جلد ہی ہو گیا اور انہوں نے 'التماس بہ خدمت نامہ نگاران' کے عنوان سے نامہ نگاروں کو درج ذیل ہدایات اخبار کے صفحات کے ذریعہ لکھیں:

ا۔ بے ضرورت محاورات بازاری کا استعمال نہ ہو، ہاں کسی کی زبان لکھنی ہو تو مضائقہ نہیں۔

۲۔ مضامین میں حتی المقدور تعمیم ہو۔

۳۔ مضامین میں اخلاقی، روز مرہ کے طریق معاشرت، ناقص خیالات کے نقصانات پر توجہ ضروری ہے۔

۴۔ اگرچہ اس رنگ میں تفصیلی بحث ذرا مشکل ہے، مگر صرف ہنس ڈالنا اور ہنسا ڈالنا کسی کا، کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ لکھا جائے پر مغز ہو، ایک ایک صفحہ سیاہ کرنا، کاغذ کی قیمت گھٹانا ہے، مختصر مضامین کے لئے مختصر لطائف کی حاجت ہے۔[1]

ان ہدایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس اخبار کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا اور پھکڑ پن، ابتذال اور فحش نگاری نہیں تھا، بلکہ عظیم مقاصد کے حصول کے لئے اس کا اجرا عمل میں آیا تھا اور اس نے جدید طرز نگارش کو اختیار کیا اور طنز و ظرافت کے پیرایۂ اظہار کو اردو صحافت میں رواج دیا۔

لوکل

اخبار کے دوسرے صفحہ پر 'لوکل' کے عنوان سے ملکی خبروں پر تبصرے شائع ہوتے تھے اور اداریہ بھی لکھا جاتا تھا۔

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد اول، ۲۲ اکتوبر ۱۸۷۷

سرمۂ بینش

اس عنوان کے تحت ہر پرچے میں ایک مستقل کالم ہوا کرتا تھا۔ یہ کالم خصوصیت کے ساتھ اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین لکھا کرتے تھے جس میں اس وقت کے حالات و واقعات پر زبردست طنز و مزاح آمیز تبصرے ہوا کرتے تھے۔ پیش آمدہ حالات کی روشنی میں قارئین کے لیے نیک اور مفید مشورے ہوا کرتے تھے۔

کارسپانڈنٹ

اس کالم کے تحت ملک کے مختلف حصوں کی مختصر خبریں ہوا کرتی تھیں اور مختلف نامہ نگاروں کے ذریعے اپنے اپنے علاقے کے اعتبار سے اس میں خبریں لکھی جاتی تھیں۔ خاص طور سے انگریز حکمرانوں سے متعلق خبریں ہوا کرتی تھیں۔ برطانوی حکمرانوں کی پالیسی اور ہندوستانی باشندوں کے بارے میں ان کی تجاویز سے متعلق خبریں اس میں جگہ پاتی تھیں۔

لطائف

اخبار کے ہر شمارے میں عمدہ لطائف درج ہوتے تھے۔ اکثر ان لطیفوں کے بیان سے کسی نہ کسی پر کوئی طنز ہوتی جس میں اصلاحی پہلو موجود ہوتا تھا۔ لطیفے کا انداز تحریر طنزیہ اور مزاحیہ دونوں طرح کا ہوا کرتا تھا۔

معمہ

اخبار کے ہر شمارے میں کچھ معمہ اور پہیلیاں ہوا کرتی تھیں جو اکثر شعری انداز میں ہوتے تھے اور کبھی کبھی نثری انداز بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ ان پہیلیوں کا جواب دو ہفتے میں قارئین کو دینا ہوتا تھا۔ لائق توجہ جوابات اخبار میں جگہ پاتے تھے۔ ان کا صحیح جواب دو ہفتے کے بعد اسی عنوان کے تحت شائع کیا جاتا تھا۔

انتخاب اخبارات انگریزی

اس کالم کے تحت مختلف انگریزی اخباروں سے منتخب خبروں کا ترجمہ کر کے انہیں شائع کیا جاتا تھا۔ اس میں قومی بین الاقوامی دونوں خبریں ہوا کرتی تھیں۔

خلاصہ اخبارات اردو

اس کے تحت اس وقت کے دیگر اردو اخبارات کا مطالعہ کر کے اہم اور منتخب خبروں کا خلاصہ اور ان خبروں پر تجزیہ پیش کیا جاتا تھا۔

اشتہار

اس عنوان کے تحت اخبار کے شماروں میں مختلف اشیاء، کمپنیوں اور اداروں کے اشتہارات بھی جگہ پاتے تھے۔

التماس اودھ پنچ

اس کالم کے تحت دیگر اخبارات میں شائع شدہ خبروں کا جائزہ لے کر اگر اس میں کوئی غلط بیانی ہوتی یا پھر تاریخی اعتبار سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کی اصلاح کی جاتی اور اس غلطی پر متنبہ کیا جاتا۔

تار برقیاں

تار برقیاں کے عنوان سے بین الاقوامی خبریں شائع ہوتی تھیں، اس کالم کے تحت ہندوستان سے باہر کی وہ خبریں ہوا کرتی تھیں جن کا تعلق کسی بھی انداز میں ہندوستان، یہاں کے باشندے یا پھر انگریزوں سے ہوا کرتا تھا۔

دیگر صفحات میں نظمیں اور اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ پر لطف اور دلچسپ لطیفے بھی اس اخبار میں شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار میں مختلف پیغام دینے کے لئے کارٹون بھی شائع ہوتے تھے، مختلف واقعات اور حادثات کو بتانے کے

لئے الگ الگ انداز کے کارٹون شائع کئے جاتے تھے۔اردو اخبارات میں 'کارٹون' کی اشاعت کو متعارف کرانے کا سہرا اسی اخبار کے سر جاتا ہے۔اودھ پنچ میں شائع ہونے والے بعض کارٹون اپنی ندرت اور جامعیت کے اعتبار سے یورپین اخبار کے بعض بہترین کارٹونوں کے مقابل ہوا کرتے تھے۔اس اخبار کے مصوروں اور سرورق کے تزئین کاروں میں لال بہادر، وزیر علی اور شوق جیسے ماہرین فن شامل تھے۔اس اخبار میں خبریں معروضی نہیں بلکہ تبصرے کے انداز میں لکھی جاتی تھیں۔

اودھ پنچ: چند غلط فہمیاں اور ان کا ازالہ

اودھ پنچ کے سلسلے میں محققین کے درمیان چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے یہاں ان کا ازالہ ضروری ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی غلط فہمی اس کی تاریخ اشاعت کے بارے میں ہے۔ چنانچہ اردو صحافت کے چند محققین نے اس کے اجرا کی تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۷ء لکھی ہے جو کہ سراسر غلط ہے، دراصل اس تاریخی غلطی کی ابتدا اردو کی تاریخ صحافت کے مرتب اور اختر شہنشاہی کے مصنف محمد اشرف نقوی سے ہوئی اور اس کے بعد دیگر بہت سے محققین نے انہیں کا اتباع کرتے ہوئے اس کے اجرا کی تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو مان لیا، جب کہ اودھ پنچ کی موجودہ فائلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اجرا ۱۶/ جنوری ۱۸۷۷ء کو عمل میں آیا۔اس اخبار کا پہلا شمارہ چند کتب خانوں اور تحقیقی مراکز میں موجود ہے۔ میں نے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں پہلے شمارہ کا مطالعہ کیا ہے، اس میں اس کے اجرا کی تاریخ ۱۶/ جنوی ۱۸۷۷ء درج ہے، اس کے علاوہ دیگر محققین پنڈت برج نرائن چکبست، امداد صابری، محمد عتیق صدیقی، ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، عبدالرزاق فاروقی اور ڈاکٹر طاہر مسعود وغیرہ نے اس کے اجرا کی تاریخ تحقیق کے ساتھ ۱۶/ جنوری ۱۸۷۷ء کو مانا ہے۔

دوسری غلط فہمی اودھ پنچ کے اولین طنزیہ ومزاحیہ اردو اخبار ہونے کے سلسلے میں ہے، چنانچہ نادم سیتاپوری، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر احراز نقوی اور شفقت رضوی وغیرہ کا ماننا یہ ہے کہ اودھ پنچ اردو کا پہلا طنزیہ ومزاحیہ اخبار

نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے دیگر کئی اخبارات جیسے مذاق رام پور، طلسم حیرت مدراس، فرحت الاحباب بمبئی، روہیل کھنڈ پنچ مراد آباد اور بہار پنچ پٹنہ وہ اخبارات ہیں جو مزاحیہ اخبار کے طور پر شائع ہو رہے تھے، دراصل یہاں بھی غلط فہمی کی بنیاد اختر شہنشاہی ہے جس میں مذکورہ اخبارات کو مزاحیہ اخبار لکھا گیا ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر نے بڑی تحقیقی بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> پنچ اخبارات پر تحقیق کرنے والوں نے مذکورہ اخبارات (مذاق، طلسم حیرت، فرحت الاحباب، روہیل کھنڈ پنچ، بہار پنچ) کے بارے میں یہ رائے 'اختر شہنشاہی' کے اندراجات سے اخذ کی ہے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر اخبارات اختر شہنشاہی کی اشاعت سے (۱۸۸۸) سے بہت پہلے عام سیاسی و سماجی اخبارات کی حیثیت سے نکل رہے تھے اور انہوں نے بعد میں پنچ اخبارات کی مقبولیت سے متاثر ہو کر خود بھی مزاحیہ اخباروں کا روپ دھار لیا تھا یا پھر مزاحیہ ضمیمے شائع کرنے لگے تھے، محمد اشرف نقوی نے ان کا سال اجرا درج کرنے کے ساتھ انہیں مزاحیہ اخبار قرار دیا تو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ گویا یہ اپنی اشاعت کے روز اول سے ہی مزاحیہ اخبارات تھے، حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔[1]

ڈاکٹر قیصر نے مختلف حوالوں اور جائزوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اودھ پنچ ہی اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا اور اسی نے اردو صحافت میں طنز و ظرافت کے پیرایۂ بیان کو جنم دیا۔ انہوں نے بال مکند گپتا کے ایک ہندی مضمون کا حوالہ بھی پیش کیا ہے جو کہ ہندی سے ترجمہ ہو کر زمانہ کان پور میں قسط وار ستمبر-اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اصل ہندی مضمون اودھ پنچ کے اجرا کے چند دنوں بعد ہی لکھا گیا تھا، اس کا ترجمہ اردو میں کئی سالوں کے بعد شائع ہوا۔ مضمون کا اقتباس یہ ہے۔:

---

[1] ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ۹۴۰

پنجاب میں اس وقت اردو کے کئی اخبار جاری ہو چکے تھے، اور لکھنؤ میں بھی کئی ایک جاری ہوئے مگر ظریف اخبار اس وقت تک کوئی نہ تھا، اس نے (اودھ پنچ) جاری ہو کر اردو زبان کو ظرافت کے چٹخارے بھر وائے، اردو کے پنچ اخباروں میں وہی پہلا اخبار ہے اور وہی اب تک سلامت ہے۔[1]

اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ پنچ اردو کا پہلا طنزیہ و مزاحیہ اخبار تھا، پنڈت برج نرائن چکبست نے بھی بال مکند گپتا کی اس شہادت کو بنیاد بنا کر اودھ پنچ کو پہلا مزاحیہ اخبار قرار دیا ہے۔

اودھ پنچ اگرچہ ظریف پرچہ تھا مگر سیاسی ادبی معاملہ بھی سر کرتا تھا۔ قدیم خیالات کا حامی تھا اور نئی روشنی کے مقلدوں کی مکروہ حرکتوں کا پردہ فاش کرتا تھا۔ ابتدا ہی سے عوام کے خیالات کی ترجمانی کرنی شروع کر دی تھی۔ اور حکومت برطانیہ کے خلاف اپنے مخصوص انداز میں لکھتا تھا اور عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ الحاق اودھ، انکم ٹیکس اور البرٹ بل وغیرہ کی زبردست مخالفت کی۔ اس کی مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں سے جھڑپیں ہوئیں اور کتابوں اور کلام پر آزادانہ تبصرے کیے۔

اودھ پنچ کے نمائندہ قلم کار اور ان کی تحریریں

کسی بھی دور کے سیاسی و سماجی حالات ہی اس دور کے ادب اور صحافت کا رخ متعین کرتے ہیں، ایک کامیاب صحافی اور ادیب ان سیاسی و سماجی عناصر کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا ہے جن سے ملک اور افراد ملک دوچار ہوتے ہیں، ملک اور وہاں کے باشندوں کے لئے مضر اور نقصاندہ عناصر کی نشاندہی کر کے اس کی خرابیوں اور نقصانات سے انہیں با خبر کرتے ہیں، ساتھ ہی ان امور کی طرف راہنمائی کرتے ہیں جو ملک اور سماج دونوں کے لئے مفید اور بہتر ہوں، چنانچہ اودھ پنچ جس دور میں وجود میں آیا اس وقت ملک کے سیاسی و سماجی حالات کیا تھے اور یہاں کے رہنے والوں پر کیا گزر

---

[1] ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص 941

رہی تھی، ملک کو کیسے حالات در پیش تھے اور ملک کی معاشی صورت حال کس طرح بگڑتی جارہی تھی، ان سب کے بارے میں پچھلے اوراق میں ہم نے کچھ دیکھا ہے اور تیسرے باب میں باضابطہ اس پر روشنی ڈالی جائیگی، یہاں اس کی ایک مختصر جھلک پیش کی جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے اس دور میں ہندوستانی باشندے تاریخ کے بڑے نازک دور سے گذر رہے تھے، ہندوستانی اقدار روایات کو مٹانے اور مغربی کلچر کو فروغ دینے کی منظم کوششیں چل رہی تھیں، ہندستانیوں کو اپنے مذاہب بدلنے، مذہی شناخت ختم کرنے اور مذاہب کی حقیقی روح اور اصل شکل کو مسخ کرنے کی بڑے منظم انداز میں خفیہ اور اعلانیہ کوششیں چل رہی تھیں، عیسائیت کو فروغ دینے اور ہندوستان میں عیسائیت کے اثرات کو پھیلانے اور راسخ کرنے کے لئے عیسائی مشنریوں اور پادریوں کو حکومت کی سرپرستی اور ہر طرح کا تعاون حاصل تھا، ہندوستان کے مال و زر کو بے دریغ خرچ کر کے یہاں کے مال و متاع سے برطانیہ کی ترقی کی راہیں ہموار کی جارہی تھیں۔ مختلف چالوں سے ہندوستانی املاک کو برطانیہ منتقل کیا جارہا تھااور ہندوستان کو معاشی اعتبار سے کنگال اور تنگدست بنایا جارہا تھا، ان حالات میں ملک کے وفادار اور وطن عزیز سے محبت رکھنے والے عوام وخواص کی جو بھی کیفیت ہو گی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ان حالات میں جب اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا جس کا بنیادی مقصد ہی ملک اور قوم کی خیر خواہی و طرفداری اور ملک و سماج مخالف طاقتوں کی کھلم کھلا مخالفت تھا، تو اس دور کے ان ادیبوں اور انشاپردازوں کی ایک جماعت اس اخبار سے جڑ گئی جن کے ادبی نظریات اور صحافیانہ افکار اس سے میل کھاتے تھے، صحافیوں کی اس جماعت نے نتائج کے خوف سے بے پرواہ ہو کر حکومت کی بدعنوانیوں، زیادتیوں، تعصب و جانبداری اور ظلم و بربریت کے خلاف زبردست انداز میں مضامین اور نظمیں لکھنا شروع کیا۔ نوآبادیاتی ہندوستان میں حکومت کی غلط پالیسیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، حکمراں طبقہ کے سماج مخالف رویوں کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا، ملکی حالات و واقعات، سماجی اتار چڑھاؤ،

سیاسی اتھل پتھل اور معاشرتی تبدیلیوں کا دیانتداری، بے باکی اور گہرائی سے تجزیہ کرنے کے بعد مثبت نتائج اخذ کر کے عوام کو صحیح راستے کی راہنمائی کی، قارئین اور باشندگان ہند کو گمراہ ہونے سے بچانے اور طالع آزما اور ابن الوقت افراد کے ہاتھوں آلہ کار بننے سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا اور ملک میں تہذیبی، سیاسی اور معاشی اصلاح کی بھرپور کوشش کی۔

اس دور میں اخبارات میں بغیر کسی نام کے یا فرضی ناموں سے تنقیدی مضامین اور طنزیہ نظمیں لکھنے کا عام رواج تھا، چوں کہ انگریزی حکمرانوں کی ظلم و زیادتی اور قہر و عتاب کا بہت سے صحافی اس سے پہلے شکار ہو چکے تھے، چنانچہ اودھ پنچ میں بھی بہت سے بیش قیمت مضامین فرضی ناموں سے لکھے گئے، اس اخبار کے مطالعہ سے بہت سی ایسی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جن کے لکھنے والوں کی تشخیص و تعیین آج مشکل ہے اور دیگر ذرائع سے بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، ناموں کے اخفا کی وجہ سے وہ مضامین اور تحریریں بھی تاریخی اور ادبی میدانوں میں باقی نہ رہ سکیں اور مؤرخین و ادیبوں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی، خود اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے بہت سے مضامین فرضی ناموں سے تحریر کئے، نادم سیتاپوری نے اودھ پنچ کی حوالے سے اپنے ایک مضمون 'اودھ پنچ کے ایک گم نام مزاح نگار' میں لکھا ہے:

> اودھ پنچ ہی میں منشی سجاد حسین نے فرضی نام سے بے شمار مضامین تحریر کئے، پھر بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اودھ پنچ کے دونوں ادوار میں تشنہ کام، لالہ پاگل داس، جوئندہ پائندہ، مرزالابالی، مقروض شاعر، قاضی بٹو، انا الخفاش، منطق آرا بیگم، خیالی پنچ، قابوچی، ان نیچرل شاعر، حق ماردی، ظ، ح، فساد سخن، ٹیسو پرشاد، سیاسی خاتون، جاسوس فضائی وغیرہ کے فرضی ناموں کے پیچھے اصل مضمون نگار کون تھے۔[1]

---

[1] نادم سیتاپوری، اودھ پنچ کے ایک گمنام مزاح نگار، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، اگست ۱۹۶۸، ص ۳۱

ان فرضی ناموں سے لکھے گئے مضامین میں سامراج کے خلاف طنزیہ ومزاحیہ انداز میں بیش قیمت تحریریں موجود ہیں، گرچہ مذکورہ بالا فرضی ناموں میں سے چند ناموں سے لکھنے والوں کی دیگر قرائن سے تعیین ہو چکی ہے، در اصل ناموں کے پوشیدہ رکھنے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ مضامین عام طور پر کسی بڑے آدمی یا حکومت کے خلاف ہوتے تھے اور اس زمانہ میں ہتک عزت کا قانون بھی موئثر تھا، اس لئے رد عمل سے بچنے کا یہ محفوظ طریقہ تھا، اس کے علاوہ ان لکھنے والوں میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے جو سرکاری محکموں میں ملازم تھے اور یہ بھی وجہ تھی کہ ایک ہی مضمون نگار کے کئی کئی مضامین ہوتے تھے۔

اودھ پنچ میں لکھے گئے بے شمار مضامین کے حقیقی مضمون نگاروں کے نام معلوم نہ ہونے کے باوجود بھی اخبار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس جدید طرز نگارش کے حامل اخبار کو اس دور کے نمایاں انشاپردازوں اور مسلم ادیبوں کی ایک جماعت کا تعاون حاصل تھا جس کی وجہ سے اسے اپنے معاصر اخباروں پر سبقت اور تفوق حاصل تھا، جن ادیبوں کی سرپرستی اور قلمی تعاون کی وجہ سے اس اخبار نے بڑی سرعت کے ساتھ روزافزوں ترقی کی اور ملک کے طو ل وعرض میں قارئین کا ایک بڑا حلقہ پیدا کر لیا۔ ان میں چند نمایاں اور مشہور حضرات یہ ہیں: منشی سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، نواب سید محمد آزاد، اکبر حسین اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی کسمنڈوی، مولوی عبدالغفور شہباز، قاضی عزیزالدین، سید مقبول حسین ظریف، یہ وہ ادبا اور قلم کار ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے جہاں اودھ پنچ کو مقبولیت کے بام عروج پر پہنچادیا وہیں اردو ادب اور صحافت میں طنزومزاح کے جدید انداز بیان کو رواج دے کر اردو ادب اور صحافت میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔

اودھ پنچ کے تمام قلم کاروں کا بحیثیت مجموعی اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ تمام کے تمام ایک ہی کارواں کے مسافر تھے اور ان سب کی منزل بھی ایک ہی تھی، مقصد بھی یکساں تھا اور سب کے

سب ایک ہی جگہ جمع ہو گئے تھے، یہ سب حصول مقصد کے لئے اپنے اپنے راستوں پر اس شان اور خوبی سے گامزن ہو ئے کہ اپنے بہت سے صحافی ساتھیوں کو غبار راہ کی بھول بھلیوں میں راستے تلاش کرتے ہوئے چھوڑ دیا اور خود منزل پر پہنچ کر سانس لیا اور کسی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل کر لی جس کے لئے انہوں نے عزم سفر کیا تھا، اگرچہ یہ کارواں مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پورے طور پر نہ روک سکا تاہم اس نے مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں باندھ باندھ کر اس کی روانی میں رکاوٹیں ضرور پیدا کر دیں، اس وقت کے ملکی، سیاسی و سماجی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بڑی ہمت و جرأت کا کام تھا، لیکن دیوانوں اور سر مستوں کی اس جماعت نے اس کام کو بڑی دلیری اور جواں مردی سے سر انجام دیا اور ان کی یہ کوشش قابل صد آفریں ہے۔ یوں تو اودھ پنچ سے جڑے معاونین قلم کاروں اور ادیبوں کی ایک بڑی جماعت ہے اور اس جماعت کا ہر فرد اس بات کا مستحق ہے کہ ان پر باضابطہ کتابیں لکھی جائیں، لیکن اختصار کے پیش نظر ذیل میں چند نمائندہ ادیبوں اور قلم کاروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کی تحریروں کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کی ذہنی رویے، ادیبانہ خوبیوں اور صحافیانہ کمالات کا اندازہ ہو سکے۔

منشی سجاد حسین

اودھ پنچ کے روح رواں اور اردو صحافت میں جدید طرز نگارش کو جنم دینے والے منشی سید محمد سجاد حسین کی ولادت ۱۸۵۶ء میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہوئی، سجاد حسین کے والد سید منصور علی انگریزی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور اس سے ریٹائر ہو کر حیدر آباد میں سول جج کے ممتاز عہدہ پر مامور ہو گئے، منشی جی کی تعلیم و تربیت میں ان کے ماموں نواب فدا حسین کا بڑا دخل ہے، نواب صاحب لکھنؤ کے صاحب ثروت اور بارسوخ وکیل تھے اور بعد میں چل کر حیدر آباد کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سجاد حسین نے ماموں کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کیا، اردو، فارسی اور کسی قدر عربی کی تحصیل کی اور ۱۸۷۳ء میں انٹرنس امتحان پاس کیا، رشتہ داروں کے اصرار پر کینگ کالج لکھنؤ میں ایف۔اے میں داخلہ لیا لیکن انگریزی تعلیم سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ

سے تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر تلاش معاش میں لگ گئے، کچھ دنوں تک مختلف ملازمتیں کرتے ہوئے فیض آباد میں فوجی نوجوانوں کو اردو پڑھانے پر مامور ہو گئے، لیکن اس پیشہ سے بھی طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ کر لکھنؤ واپس آ گئے اور چند مہینوں کے بعد اپنے مخلص دوست منشی محفوظ علی بدایونی کے مشورہ سے ۱۶/ جنوری ۱۸۷۷ء کو ہفت روزہ اودھ پنچ کو جاری کیا اور اپنی زندگی کے آخری وقت تک اسی کو مقصد زندگی بنا کر اس کے نوک پلک کو سنوارتے رہے۔

اودھ پنچ کی اشاعت عمل میں آتے ہی منشی سجاد حسین کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، ان کی صحافتی عظمت اور ادبی صلاحیت کا چرچا دور دور تک پورے ملک میں ہونے لگا، جب کہ اس اخبار کی اشاعت سے پہلے منشی جی کی کوئی خاص شہرت اور پہچان لوگوں میں نہ تھی۔ لیکن اس اخبار کی اشاعت نے انھیں عوامی مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اخبار کی اشاعت کے چند ہی دنوں میں منشی سجاد حسین اور ان کے دیگر رفقاء کار کی صلاحیتوں اور کاوشوں کی بدولت اودھ پنچ اپنے عہد کا نہایت مقبول اخبار ہو گیا۔ عوام و خواص میں اسے خوب پذیرائی حاصل ہونے لگی اور بہت ہی قلیل عرصے میں عہد طفلی سے نکل کر منزل شباب میں جا پہنچا اور اس اخبار کے مالک و مدیر کا شمار ملک کے اعلٰی صحافیوں میں ہونے لگا۔ منشی جی نے اس اخبار کے ذریعہ انگریزی حکومت کی ملک مخالف پالیسیوں اور ہندوستانیوں پر کئے جانے والے ظلم و زیادتی کے خلاف جس ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تنقیدی مضامین اور تبصرے شائع کئے، اس نے انھیں ہیرو بنا دیا۔ عوام نے اس اخبار اور اس کے مدیر کو اپنا مسیحا سمجھ کر اس میں شائع ہونے والی تحریروں کی روشنی میں ملک کا مستقبل طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اودھ پنچ کی اشاعت کے ذریعے منشی سجاد حسین نے نہ صرف اردو صحافت بلکہ اردو ادب میں بھی مغربی طنز و مزاح کی شعوری طور پر ابتدا کی، اس دور کے دیگر اخبارات کے طرز نگارش سے انحراف کرتے ہوئے طنز و مزاح کی طرف فطری میلان اور کچھ تقاضائے وقت نے انھیں اس انداز کے اپنانے کی طرف مائل کیا، اس دور میں مغربیت کے

سیلاب نے مشرقی تہذیب و تمدن کو اپنی چپیٹ میں لے لیا تھا، پرانے اقدار و روایات پر حملے ہو رہے تھے اور ہندوستان کو مکمل طور پر سیاسی و سماجی اعتبار سے مغرب زدگی کے بھنور میں ڈھکیل ڈالنے کی خفیہ و منظم سازشیں چل رہی تھیں۔ اودھ پنچ کا مقصد اس بے راہ روی کی مخالفت اور مشرقی تہذیب و تمدن کی پاسداری و علمبرداری تھا، اس دور کی فضا اور ملک کے حالات ایسے تھے جو طنز و ظرافت کے لئے سازگار تھے اور اسی طرز نگارش میں لکھنا مؤثر اور محفوظ طریقہ تھا، اس لئے اودھ پنچ کے صاحب شعور ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے اپنے اخبار کے لئے یہ جدید طریقہ اپنایا اور اودھ پنچ کے پلیٹ فارم سے ان کے ہم فکر دیگر ادباء اور قلم کاروں نے بھی جڑ کر بلا قید مذہب و ملت مغربی تہذیب و تمدن اور سامراجی سیاست کی خامیوں کو طشت از بام کرنے کے لئے نظم و نثر میں ایسی معرکۃ الآراء تحریریں پیش کیں جو یادگار زمانہ بن گئیں۔

منشی سجاد حسین اس اخبار کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے اور اخبار کے اجرا کے وقت انہوں نے اپنا جو مقصد اور مطمح نظر طے کیا تھا زندگی کے آخری مرحلہ پر بھی انہوں نے اس سے سرِ مو انحراف نہیں کیا، ۳۶/ سالوں تک وہ اس اخبار کے ایڈیٹر رہے اور اس دران انہوں نے بے شمار قیمتی تحریریں لکھ کر گلشن اودھ پنچ کی آبیاری کرتے رہے۔ ۱۹۰۱ء میں منشی سجاد حسین پر پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا اور چند ماہ کی علالت کے بعد وہ شفایاب ہو گئے، ۱۹۰۴ء میں ان پر دوبارہ فالج کا حملہ ہوا، اس بار مرض کی شدت نے انہیں کمزور کر دیا اور یہ حملہ ان کی صحت و تندرستی کے لئے تباہ کن ثابت ہوا، علاج و معالجہ کے باوجود طبیعت بگڑتی رہی اور قوت گویائی مفقود ہوتی چلی گئی، اپنے مرض کے دوران بھی وہ اودھ پنچ کو نکالتے رہے، کلفت جسمانی ان کی ہمت مردانہ اور شگفتگی طبع کو مضمحل نہ کر سکی، لیکن مسلسل علالت اور مالی دشواریوں نے ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ کو بند کرنے پر مجبور کر دیا، اس بیماری کے دوران بھی ان کی ظرافت طبع سے لوگ محظوظ ہوتے تھے، اپنے ملنے والوں سے کہتے کہ دواؤں کا سلسلہ اس لئے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ اس

طرح اپنے محبوب اخبار کے بند ہو جانے کے صدمے اور مسلسل شدت مرض کی پریشانیوں کی تاب نہ لا کر ۲۲/ جنوری ۱۹۱۵ء کو وفات پا گئے۔

منشی سجاد حسین کی ذاتی صفات اور ان کی صحافتی دیانتداری وایمانداری کا اعتراف ان کے ہم عصر ادیبوں اور بعد کے محققوں اور ناقدوں نے بھی کیا ہے، منشی سجاد ایک باعمل انسان تھے، وہ جو حق اور سچ سمجھتے تھے اسے لکھتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی بھی طرح کی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیتے تھے، چنانچہ پنڈت برج نرائن چکبست نے ان کی ذاتی صفات کے بارے میں لکھا ہے:

> آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن شہرت، مذہبی تعصبات سے خواہ پالٹکس ہو یا لٹریچر ہمیشہ صاف پاک رکھا اور آزادی وایمانداری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جو وضع اختیار کی اس کو مرتے دم تک نبھایا، کسی حالت میں اصول سے منھ نہیں موڑا، بلا کی شوخ طبیعت پائی تھی، بذلہ سنجی، ظرافت تو گویا مزاج کا خمیر تھا، نہایت پریشانی و تنگی کے زمانہ میں بھی کسی نے ان کے چہرے پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی، بیماری کے زمانے میں اگر کوئی مزاج پوچھتا تو کہتے زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کا حال اس طرح بیان کرتے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی، علاج سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے یہ سلسلہ اس لئے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔[1]

اردو ادب میں منشی سجاد حسین کا نام اودھ پنچ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک صاحب طرز ادیب، بلند رتبہ انشاپرداز اور معزز قلم کار کی حیثیت سے بھی قائم ہے، وہ صحافت کے راستے طنز و مزاح کی دنیا میں وارد ہوئے، انہوں نے مزاح کا رخ شخصیت سے بڑھا کر اجتماعیت کی طرف پھیر دیا، اردو صحافت میں پہلی بار اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور قومی مسائل کو طنز و ظرافت کے پیرائے میں بڑی متانت اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا، عمومی طور پر افراد

[1] دیباچہ گلدستہ پنچ از چکبست، بحوالہ اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، مصباح الحسن قیصر، ص ۱۰۶

کے بجائے انہوں نے اقدار، مسائل اور موضوعات کو اپنا نشانہؑ ہدف بنایا، اخباروں کے سلسلہ میں پریس ایکٹ کے باوجود الحاق اودھ، انکم ٹیکس، البرٹ بل اور انگریز حکمرانوں کے کالے قانون جیسے سینکڑوں سلگتے مسائل پر انہوں نے سخت تنقید کی اور زبردست تبصرے شائع کئے، مغرب کی کورانہ تقلید کا خاکہ اڑا کر فضا میں اعتدال و اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہندوستان جیسے ملک میں مشترکہ تہذیب کی ترجمانی کے لیے ہولی، دیوالی، بسنت، محرم، عید اور شب برأت کے موقع پر پتنگ والے سرخ و زعفرانی کاغذ پر اودھ پنچ کے رنگین نمبرات بھی نکالتے تھے جن میں ساقی نامے اور ترانے ہوتے تھے۔

منشی سجاد حسین کی تحریر اور ان کی ادیبانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر لکھتے ہیں:

> منشی سجاد حسین شگفتہ اور بامحاورہ نثر لکھنے میں مشاق ہیں ان کی تحریریں معلومات عامہ، ضرب الامثال اور مخصوص اصطلاحات سے پُر ہوتی ہیں، زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے جس پر انہیں کامل عبور حاصل ہے، وہ جوانی ہی میں لکھنؤ کے زبردست محقق اور زبان داں تسلیم کئے جا چکے تھے، لہذا وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے مستند سمجھا جاتا تھا، چوں کہ انہوں نے اپنے مزاج کے نقوش لکھنوی ماحول کے پس منظر میں ابھارے ہیں، اس لئے ان کی تحریریں لکھنؤ کی بولی ٹھولی سے مالا مال ہوتی ہیں، بلاغت، شستگی، نفاست، بے ساختگی کے ساتھ ساتھ ان میں محاورہ بندی، لطائف و ظرائف اور ضلع جگت کا بر محل استعمال ہوتا ہے، ان کی تحریروں میں ایک اور چیز جو نمایاں طور سے نظر آتی ہے وہ انگریزی اور ہندی الفاظ کا آزادانہ استعمال ہے، وہ اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے کبھی کبھی انگریزی یا ہندی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی انگریزی و ہندی الفاظ میں فارسی و عربی کے عطف و اضافت لگا کر نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔[1]

---

[1] مصباح الحسن قیصر، اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، ص ۲۰۱

منشی سجاد حسین اردو صحافت کی دنیا میں وہ پہلے صحافی ہیں جنہوں نے اس دور کے سیاسی مسائل کو طنز ومزاح کا موضوع بنایا، یہ ان کے قلم کا ہی اثر تھا کہ عوام جو سیاست کو بے مزہ اور خشک سمجھتے تھے اور سیاست سے کسی طرح کی کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے وہ غیر معمولی طور پر سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ سیاسی اعتبار سے منشی سجاد حسین کانگریس کے طرفدار اور اس کے رکن تھے، انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب و تمدن کے سخت مخالف اور ناقد تھے۔ ان کے بیشتر مضامین ان کے اسی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اودھ پنچ میں 'موافقت زمانہ' کے عنوان سے مضامین کا جو سلسلہ منشی سجاد حسین نے جاری کر رکھا تھا اس میں سیاست دانوں، حکمرانوں اور نوابوں وراجاؤں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی بڑی ظریفانہ انداز میں پول کھولتے اور چٹکلوں اور لطیفوں کے امتزاج سے مضمون میں وہ دلچسپی پیدا کر دیتے تھے کہ لوگ اگلے شمارہ کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے، اسی طرح انہوں نے 'کھلے خط اور سربستہ مضامین' کے عنوان سے فرضی خطوط کا ایک سلسلہ جاری کیا تھا، یہ خطوط ملکہ، وزیر اعظم، دیسی راجاؤں، نوابوں، وائسرائے، اور گورنروں کے نام ہوتے جن میں ان حضرات کے مکر و فریب اور تعصب و طرفداری کو طنزیہ و ظریفانہ انداز میں پیش کر کے ان کی توجہ اصلاح کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی ادیبانہ خوبیوں اور صحافیانہ بے باکیوں کا بہت سے لوگوں نے اعتراف کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ مصیبت و پریشانی کی حالت میں بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کو ملتی۔ ان کی ان خوبیوں کا ذکر علامہ امداد صابری نے اس طرح کیا ہے:

> منشی سجاد حسین صاحب میں عجیب و غریب خوبیاں تھیں، خلیق وذہین و فہیم ہونے کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں بھی کسی نے ان کے چہرے پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی و مایوسی کی شکن نہیں دیکھی، بیماری کے زمانہ میں اگر کوئی مزاج پرسی کرتا تو کہتے تھے زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ ہنسی آجاتی تھی، دوادارو سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض

اس لیے جاری کرر کھا کہ باضابطہ موت ہو۔ بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ کہتے تھے۔ اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھے۔[1]

اودھ پنچ سے منشی جی کو بے حد لگاؤ تھا، اس چمن کی ۳۶/ سالوں تک انہوں نے آبیاری کی تھی اور اسے وہ اپنی زندگی کا قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے، بڑی جانکاہی کے ساتھ اسے پروان چڑھایا تھا، لہٰذا باوجود مرض کی شدت کے انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کی زندگی میں اودھ پنچ کی اشاعت بند ہو جائے۔ مرض کے اس عالم میں جب بولنے کی طاقت قریب قریب ختم ہو گئی تھی لیکن چلنا پھرنا جاری تھا اور دماغ پوری طرح کام کرتا تھا، انہوں نے ایک خط کے جواب میں منشی بالمکند گپتا کو خط لکھا جس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اودھ پنچ سے کتنا لگاؤ تھا۔ خط کا مضمون اس طرح ہے:

مکرمی تسلیم! خط پہنچا، بہت بجا ہے، اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں، دو ایک سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں، نہ منھ سے بول سکتا ہوں، کچھ نوکر ہمت کر کے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے، اخبار صرف اس لئے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا، ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں ؏ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو، ہاں گذشتہ زمانہ میں کچھ تھا۔[2]

منشی سجاد حسین نے ہزاروں کی تعداد میں سیاسی و سماجی موضوعات پر مضامین لکھے ہیں، لیکن ان مضامین کے علاوہ انہوں نے ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کیا اور اپنے مخصوص انداز تحریر اور رنگ میں چند اچھے اور ادبی ناول لکھ کر ناول نگاری کی تاریخ میں اعلیٰ مقام حاصل کیا، یوں تو انہوں نے کل سات ناول لکھے جن میں چھ تو طبع زاد ہیں اور ایک انگریزی سے ترجمہ ہے، ان کے ناولوں کے نام یہ ہیں: حاجی بغلول، احمق الذین، پیاری دنیا یعنی افسانۂ گیتی بیگم و

---

[1] امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، ص ۱۲۳

[2] امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد سوم، ص ۱۲۵

طالب، دھوکا یا طلسمی فانوس (ترجمہ) طرحدار لونڈی یا آستین کا سانپ، میٹھی چھری، کایاپلٹ، لیکن ان تمام ناولوں میں ان کے دو ناول حاجی بغلول اور احمق الذین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے دیگر ناولوں کو نصیب نہ ہو سکی، ان دونوں ناولوں کا شمار ان کے شاہ کار ناولوں میں ہوتا ہے، اردو ادب اور اردو ناول نگاری میں بھی ان دونوں ناولوں کو اہمیت حاصل ہے۔

منشی سجاد حسین نے اپنے ۳۶/ سالہ دور صحافت میں ہزاروں کی تعداد میں سیاسی، سماجی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان تمام مضامین میں خواہ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع ہو یا پھر عام موضوعات، عمومی طور پر انہوں نے طنز و ظرافت کے پیرایہ کو ہی اپنایا ہے، ان کی تحریریں اکثر اوقات طنزیہ رنگ میں ہی دکھائی دیتی ہیں گرچہ بعض اوقات وہ ظرافت کا بھی پہلو لے لیتی ہیں، ان کی ظرافت سطحی اور غیر معیاری نہیں ہے بلکہ ظرافت کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے، منشی جی نے اودھ پنچ کے صفحات میں جتنے بھی مضامین لکھے کوئی بھی مضمون ان کے اصل نام سے شائع نہیں ہوا، لیکن اپنے طرز تحریر کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ کہیں وہ ارسطو ہیں، تو کہیں 'نیاز مند قدیم'، کبھی وہ 'نظر باز' ہیں تو کبھی 'صلاح کار' اور 'مدبر'، کہیں فاقہ کش ہندوستانی اور 'دیوالیہ' کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کہیں 'اللہ کا بندہ'، بگڑے دل' یا 'کوئی ہوگا' کے روپ میں موجود ہیں۔ اکثر مضامین تو بغیر نام کے ہیں یا پھر راقم لکھ کر مضمون یا عنوان کی مناسبت سے نہایت دلچسپ اور معنی خیز فقرہ لکھ دیتے ہیں، مثلا 'حلوائی کی دوکان پر دادا کا فاتحہ'، 'پہچاننے پہ ہے ناز پہچان جائیے۔'، 'تہذیب کے سبب زباں اپنی بند ہے۔ 'انگریزی دودھ کا جلا۔'، یا پھر کبھی کوئی مصرعہ یا شعر لکھ دیتے تھے، مثلاً 'نہ من شہرت تمنائے دارم۔'، ساتھ لے دے کے اپنے یاروں کو: مینڈکی بھی چلی اپنے مداروں کو۔' وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں ہم ان کی تحریروں کے چند نمونے درج کرتے ہیں جن کے مطالعے سے ان کی ادبی، صحافتی اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ سیاسی مسائل اور سماجی حالات پر ان کی نگاہ کتنی گہری

ہوتی تھی، اور وہ ان مسائل کا کتنی باریک بینی سے مشاہدہ کرتے تھے، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ منشی جی سیاسی اعتبار سے کانگریس کے حامی اور طرفدار تھے، قیام کانگریس کے دو سال بعد وہ اس سیاسی جماعت کے باضابطہ رکن بن گئے تھے، چوں کہ منشی جی کو اپنے خیالات و نظریات اور مقاصد نیز کانگریس کے مقاصد میں مماثلت نظر آتی تھی اس لئے دو سالوں تک اس جماعت کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس میں عملی طور پر شامل ہو گئے۔ کانگریس کی حمایت میں بہت سے مضامین لکھے اور مخالفین کانگریس کا اس انداز میں جواب دیتے تھے کہ مخالفین حواس باختہ ہو جاتے تھے، ما قبل میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ منشی جی نے حکام وقت اور والیان ریاست کے نام 'کھلے خط سربستہ مضامین' کے نام سے فرضی خطوط کا سلسلہ جاری کیا تھا، یہاں ایک ایسے ہی خط کا اقتباس پیش ہے جس میں نظام حیدر آباد کو حکومتی امور میں مشورہ دیتے ہوئے ان کے مصاحبین پر زبردست طنز کا وار کیا ہے:

> ... جب گدہوں کی کافی تعداد بن چکی اور بہت سا تخم باقی رہا تو ملائکہ نے خداوند تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا اس کو کیا کرنا چاہیے، حکم ہوا ان کو صورت انسانی میں لا کر اور کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر زمین پر برسا دو، چنانچہ چار مینار سے ان حضرات کی بارش ہوئی غالباً انہیں میں سے دو چار تمہاری مصاحبت میں آ گئے ہیں۔۔۔ تم کو یہ بات ہر وقت ملحوظ رکھنی چاہیے کہ رئیس ریاست کے واسطے بنا ہے، نہ عیش و آرام، لہو لعب کے واسطے، کسی سے ناچاقی، عداوت، شکر رنجی کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی وجہ نہیں انتظام ریاست کی باگ ڈور چھوڑ دی جائے، ملک کی رونق رعایا کے دل سے فرحت اس طرح فرار ہو، جیسے تمہارے دیوان کے دماغ سے تمھاری عظمت، تم خفا ہو، خوش ہو، لڑو، جھگڑو، جو چاہو کرو، مگر ملک کی جانب سے غفلت نہ کرو اور خدا کے یہاں گنہ گار نہ ہو، مردم شناسی کرو۔ قدر دانی میں مشق بڑھاؤ، ملک کے رنج و راحت کو اپنا رنج و راحت بناؤ تب حق سے ادا ہو گے۔[1]

---

[1] "کھلے خط سربستہ مضامین بحضرت نظام دکن"، اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و سوم، ۷ ستمبر ۱۸۹۹

وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کے نام ایک ایسے ہی خط میں لکھتے ہیں:

میں نے تمھاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی، رفاہ و فلاح، آرائش و زیبائش، ظاہری ٹیم ٹام، اوپری لیپ پوت کے واسطے تمھاری ذات مخصوص ہے۔ مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم ہو جیسے ہندوستانی جودت سے، تم پولیٹیکل دستر خوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو، پکا پکایا کھانے طیار (تیار) ہانڈی سے تم خوبی سے چن سکتے ہو مگر ہانڈی پکانے اور چیز طیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول، تم نہیں جانتے کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون مصالح کیونکر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے، کبابوں میں کس چیز سے گلاوٹ آتی ہے، پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں، فارن پالیسی کا مزعفر اور تنجن کیوں کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے، کہتے ہیں جو کوئی چھچھوندر مار ڈالتا ہے اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے، شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ مگر اب یہ ضرورت بیشک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی اور رکاب دار سب تیار کرے پھر دستر خوان لگانے اور خاصہ چننے کو تم بلائے جاؤ۔[1]

آزادئ نسواں اور بے پردگی، عورتوں میں انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے حامیوں اور علمبرداروں کی تحریکوں اور کوششوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہوئے انہوں نے ایک مضمون 'سہل لٹکہ' کے عنوان سے لکھا، مضمون سے ایک اقتباس پیش ہے:

آج کل بعض خواہ مخواہ کے روشن خیال گروہ میں اس بات کی سخت کوشش ہو رہی ہے کہ جس طرح ہو عورتوں کا پردہ اٹھا دیا جائے، ساری برکتیں اس میں مخفی ہیں اور مسلمانوں کی یہ ردی حالت اسی کی بدولت پہنچی ہے۔ بی صاحب نے پردہ اٹھایا، چہرہ بے نقاب کا جلوہ دکھایا اور دنیا کی بہبود و ترقی گدا گد آسمان سے گرنا شروع ہوئی، مردوں کا پڑھنا، لکھنا، کام کاجی ہونا،

[1] " کھلے خط سربستہ مضامین بنام گلیڈ اسٹون "، بحوالہ اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، مصباح الحسن قیصر، ص ۱۳۲

کچھ ضروری نہیں، صرف عورتوں کو پردے سے نکالیں، درشتی ہنڈیاں بھنانا شروع کریں، چنانچہ اس گروہ کے ٹنڈیل ہمارے میاں محب حسین صاحب حیدر آبادی اٹھ کھڑے ہوئے اور لگے کوشش کرنے، آپ جانیئے مدتہا مدت کی پرانی زنگ خوردہ رسم کو اٹھانا کوئی ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں، ایک ذری سا قفل ہوتا ہے اس کے کھولنے میں لوہے لگ جاتے ہیں اور یہ تو آہنی دیوار ہے، کٹتے کٹتے کٹے گی۔ پس این جناب نے آسانی کے خیال سے ایک ایسا نسخہ تجویز کر دیا ہے اگر محب حسین صاحب بجائے اس جھگڑے فساد کے جاری کر دیں تو پردہ آپ سے آپ پھٹ کے جگر عاشق یا چھوٹی ہوئی مہتاب یا چاندی مارا کتاں ہو جائے، پھر نہ مردوں کو غیرت، نہ عورتوں کو حجاب، تہذیب و ترقی کا مرغا آٹھوں پہر ککڑوں کوں بولا کرے۔ [1]

اسی طرح ایک فرضی خط بنام ملکہ وکٹوریہ (قیصر ہند) میں ملکہ کو نظام حکومت کی باریکیوں سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آج کل معاملات کا قوام بہت کچھ بگڑا معلوم ہوتا ہے، اگر فعالہٗ اولوالعزمی کی چاشنی اندازہ اعتدال سے بڑھ کر حلاوت ملکداری میں زیادہ ترشی دکھائے تو چنداں ناگوار نہیں گذرتا، کیا وجہ ہے کہ وہ تو ایک باطنی جنگ ہے جو کاسۂ دماغ میں گھٹ گھٹ کر اثر پیدا کرتی اور موجیں دکھاتی ہے مگر صلح اور امن کی حالت منفعلہ کا شربت بزوری معتدل ادنی سی کمی بیشی میں بگڑ جاتا اور خدا جانے کیسی الٹی پلٹی تاثیرات پیدا کرتا ہے، جب کوئی فعل درجہ لازم سے گذر کر متعدی ہو جاتا ہے تو ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتا، ممکن ہے بہت سے امور کا وقوع ایک کو ناپسند ہو مگر ضرور نہیں کہ دوسرا بھی اسی قدر کراہت کرے، پس لامحالہ انسان چارو ناچار طوعاً و کرہاً بہت سے افعال اسی وجہ سے کرتا ہے، تم بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنی نہیں

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و چہارم، ۱۱/اکتوبر ۱۹۰۰

ہو، سب سے اہم اور ضروری کام عموماً حاکموں اور خصوصاً تمھارے واسطے زمانے اور قوم کی

رفتار پر نظر رکھنا ہے۔[1]

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی ۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء کو قصبہ بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے، اکبر کے والد سید تفضل حسین ابتداءً نائب تحصیلدار تھے، لیکن جلد ہی ترک ملازمت کر کے اپنے بڑے بھائی سید وارث علی کے ساتھ مع اہل و عیال کے رہنے لگے، اکبر کی پرورش و پرداخت انہیں کے سایۂ شفقت میں ہوئی، اکبر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی اور کم عمری میں ہی عربی، فارسی اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے مشن اسکول میں داخل ہوئے لیکن اگلے ہی سال ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن انہوں نے اپنے شوق اور مطالعہ کی بدولت انگریزی زبان میں کافی استعداد پیدا کر لی اور پھر نوکری کی تلاش میں لگ گئے، منصفی کیٹ گنج، الہ آباد میں 'اقبال دعوی نویسی' سے ملازمت شروع کر کے الہ آباد کے زیر تعمیر جمنا پل میں پتھروں کی پیمائش، کچہری میں نقل نویسی جیسی یکے بعد دیگر ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ۱۸۷۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور عدالت خفیفہ میں وکالت شروع کر دی، نائب تحصیلدار کے عہدے سے شروع کر کے چیف جسٹس کے مسل خواں مقرر ہوئے، پھر ہائی کورٹ کا امتحان پاس کر کے الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے، اس کے بعد قائم مقام منصف ہو گئے۔ خورجہ اور علی گڑھ میں منصف درجہ اول بنے اور علی گڑھ میں ہی ترقی کر کے سب جج کے عہدہ پر پہنچے، غازی پور میں چند دنوں تک قائم مقام سب جج رہ کر مستقل سب جج ہو گئے، غازی پور سے کان پور تبادلہ ہو گیا اور پانچ سال تک وہاں جج رہ کر قائم مقام جج خفیفہ مقرر ہو گئے، اس کے بعد مستقل جج خفیفہ ہو کر الہ آباد آ گئے اور ترقی کر کے سیشن جج مقرر ہوئے، ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے حسن خدمات کے بدلے خان بہادر کا خطاب عطا کیا، ۱۹۰۲ء میں

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و ہفتم، ۸ فروری ۱۹۰۳

الہ آباد میں سیشن جج ہو کر ایک سال تک نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے کر ۱۹۰۳ء میں پنشن لے لی اور مابقیہ زندگی کے ایام 'عشرت منزل' الہ آباد میں گذار کر ۹/ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اکبر الہ ابادی کی یہ مختصر سوانح اس امر پر شاہد ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیت اور انتہائی ذہانت کے مالک تھے، ایک ادنٰی ملازمت سے شروع کر کے ترقی کی منزلوں کو عبور کرتے ہوئے منصف اور جج کے عہدے تک پہنچے اور عزت و شہرت سب کچھ حاصل کیا، باضابطہ کالج میں نہ پڑھنے کے باوجود ذاتی محنت اور مسلسل جد وجہد کی بدولت اس مقام تک پہنچے، یہاں یہ واضح رہے کہ ان کو عزت و شہرت ان عہدوں کی وجہ سے نہیں ملی، بلکہ ان کی شہرت وعظمت اور عزت وافتخار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر، بلند پایہ ادیب، عظیم مزاحیہ نثر نگار، مشرقی اقدار وروایات کے علمبردار اور مغربی کلچر کے زبردست ناقد اور مخالف تھے، اردو ادب کے محققین وناقدین نے اکبر کو غزل گو، ہجو نگار، ظریف، مصلح، پیامبر، معلم، رہبر، فلسفی اور سچے وطن پرست کی حیثیتوں سے جانچا اور پرکھا ہے اور مختلف میدانوں میں ان کی بلند خیالی اور ان کے کلام میں متانت وسنجیدگی کی معنی آفرینی کے قائل ہوئے ہیں۔

اکبر کو شعر وسخن سے لگاؤ صرف دس برس کی عمر سے ہی ہو گیا تھا اور چودہ پندرہ برس کی عمر میں تو وہ اچھا خاصا کلام کہنے لگے تھے۔ اکبر کی اس کامیابی میں جہاں ان کی خداداد ذہانت وصلاحیت کا جلوہ کرم فرما تھا وہیں اس وقت کے وہاں کے ماحول نے بھی ان کی طبیعت کو شعری سانچے میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا، شاعری کے ابتدائی ایام میں قدیم رنگ تغزل اختیار کیا اور مولوی وحید الدین وحید کی شاگردی اختیار کر لی، شروع میں عام شعراء کی طرح وہ بھی حسن وعشق کی شاعری میں طبع آزمائی کرتے رہے، اب تک وہ عام شہرت ومقبولیت حاصل نہیں کر سکے تھے مگر رفتہ رفتہ کلام کا نیا رنگ ڈھونڈ نکالا اور عوامی پذیرائی سے حوصلہ پا کر اپنی شاعری کا چولا ہی بدل ڈالا اور بقول سید احتشام حسین 'یہ تبدیلی ان کے لئے آب حیات بن گئی۔

اکبر الہ آبادی نے جس دور میں اپنی شاعری کو طنز و ظرافت کا جامہ پہنا کر ایک نیا رخ دیا اسی دور میں اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے گوشے گوشے میں اودھ پنچ کا طوطی بولنے لگا۔ اس شہرت اور عوامی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس دور کے بڑے بڑے طنز و ظرافت نگار، مشرقی تہذیب و تمدن کے حامی اور مغربی کلچر کے مخالف قلم کار اس کے اخبار کے دائرۂ صحافت میں شامل ہوتے چلے گئے، سیاسی، تہذیبی اور تحریری اعتبار سے اکبر کے خیالات و نظریات بھی اودھ پنچ سے میل کھاتے تھے، لہٰذا وہ بھی بلا تاخیر اودھ پنچ کے مذاق و رجحان کے گرویدہ ہو گئے، ۱۸۷۷ء میں انہوں نے 'نامہ بنام اودھ پنچ' کے عنوان سے اس اخبار کا ایک منظوم تعارف پیش کیا جس میں اودھ پنچ کی تعریف و توصیف کرے ہوئے لندن پنچ سے اس کا موازنہ کر کے اس کی شوخی و ظرافت کا بڑی خوش اسلوبی سے ذکر کیا، اودھ پنچ سے جڑنے کے بعد ان کی شہرت و مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دور کے وہ ہر دل عزیز شاعر بن گئے۔ اودھ پنچ کے دیگر قلم کاروں کی طرح اکبر نے بھی اپنے نام سے کوئی مضمون یا شعر نہیں لکھا۔ عموما ا۔ح کے عنوان سے یا بعض مرتبہ ا۔ح کے بعد مضمون کے عنوان یا مواد کی مناسبت سے کچھ اضافہ کر دیتے تھے۔

جن ادیبوں اور شاعروں نے برطانوی نظام کے خلاف جاری موقف کی تائید کی ان میں سب سے اہم نام عظیم اردو شاعر لسان العصر اکبر الہ آبادی کا ہے، جنھوں نے اپنے طنز و مزاح کے ذریعے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ ہندوستان میں رائج ہونے والے نئے رجحانات اور نئی تحریکوں کا مذاق اڑایا ہے، وہ اپنی ایک نظم میں ہندوستان میں لائی جانے والی نئی سماجی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

روشنی جن میں نئی ہے وہ مری سنتے نہیں
لاکھ سمجھاؤ کہ صاحب ہے یہ فانی روشنی
انجم و شمس و قمر لیکن ہیں میرے ہم طریق
وضع پر قائم ہیں ان میں ہے پرانی روشنی

اکبر نظام نو پر ہنستے رہے بھپتیاں کستے رہے کیونکہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس نظام میں نہ تو خلوص ہے اور نہ ہی سچائی، انھوں نے خاص طور پر مسلمانوں میں عہد رفتہ کی عظمت کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی، انھوں نے مکمل جاہ و جلال کے ساتھ ماضی کی رنگارنگ تصویر کشی کی، انھوں نے تہذیب جدید کی سطحیت کو خوب خوب اجاگر کیا اور اس کا مقابلہ اعلی مشرقی قدروں کے ساتھ کیا، اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اکبر نے اردو ادب کو عظیم ترین طنزیہ نظموں کا خزینہ عطا کیا، انھوں نے اپنی مخصوص نظموں میں مغرب زدہ ہندوستانیوں کا مذاق اس طرح اڑایا:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی!
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

اکبر یوں تو ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے ہی عموماً جانے اور پہچانے جاتے ہیں، لیکن طنز و ظرافت آمیز شاعری کے علاوہ انہوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کیا ہے اور اس میدان میں بھی اپنی ظریفانہ صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔ ان کی کائنات نثر میں کچھ انگریزی کے ترجمے، ذاتی خطوط اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ اکبر کی شاعری اور ان کے مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شوخی، زندہ دلی اور حق گوئی و بے باکی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کے کلام میں ظرافت و نکتہ سنجی اور طنز کے عناصر نے ان ہی چیزوں کو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز بنا دیا اور اسی خوبی نے ان کے کلام اور نام دونوں کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا، اکبر کے ذریعہ اردو شاعری میں طنز و ظرافت کی آمیزش کی بدولت طنز و مزاح نے اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی ایک جگہ بنا لی اور حسب استطاعت اردو کے متعدد شعراء اس طنزیہ شاعری کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔

اکبر کی شاعری اور خاص کر ان کی ظریفانہ شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

حیوان ظریف کا صحیح اطلاق اکبر الہ آبادی پر ہوتا ہے، وہ اردو کے تنہا شاعر ہیں جن کی شاعری ظرافت کے جملہ اقسام پر محیط ہے، طنز و مزاح، ہجو ملیح، کنایہ، رمز، بذلہ سنجی، لطیفہ، چٹکلہ اور

> پیروڈی، غرض کہ ظرافت نگاری کی جتنی ممکن صورتیں ہو سکتی ہیں، سب ان کے یہاں ملتی ہیں اور اس درجہ مؤثر و دلکش پیرائے میں کہ اردو کی شاعری میں نہ ان سے پہلے اس کی نظیر ملتی ہے اور نہ ان کے بعد۔ اکبر کی یہ ہمہ گیری ظرافت کی مختلف نوعیتوں کو خوش اسلوبی سے برتنے تک محدود نہیں ہے بلکہ مواد کی کثرت اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے بھی اس میدان میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ معاشرت، مذہب، سیاست، قیادت، تعلیم، حکومت، تہذیب اور اخلاق کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ شیخ، واعظ، مرزا، جمن، کلو، بدھ، رمضانی، مولوی مدن، ہرچرن داس، گاندھی جی اور کرزن مہاراج، سبھی ان کے دائرۂ ظرافت میں داخل ہیں۔[1]

اکبر الہ آبادی نے اپنے کلام کو جس طرح ظریفانہ رنگ میں عوام کے سامنے پیش کیا اس کا مقصد ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ اس پیرایہ کو اپنانے کے درپردہ ایک عظیم مقصد کارفرما تھا، چنانچہ ایک موقع سے انہوں نے ظریفانہ طرز تحریر کو اختیار کرنے کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ہماری قوم اس قدر غافل اور مجہول ہو چکی ہے کہ اگر میں مسلمانوں کو دو روپے کی تمدنی یا مذہبی کتاب پڑھنے کو دوں اور اس کتاب کے مفید ہونے کا یقین بھی دلا دوں، تب بھی وہ پڑھنے پر تیار نہ ہوگا اور یہی سبب ہے کہ میں اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے مرغوب بنا دیتا ہوں تاکہ لوگ ہنس کر متوجہ ہوں اور پھر غور کریں۔[2]

وزیر آغا نے اکبر الہ آبادی کی شاعری کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے علامہ عبداللہ یوسف علی کے پیش کردہ ان تین نکات کو قابل توجہ قرار دیا ہے جو انہوں نے اکبر الہ آبادی کی شاعری کی خصوصیات کے حوالے سے بیان کیا ہے، چنانچہ وزیر آغا لکھتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، ص ۱۵

[2] علی گڑھ میگزین، اکبر الہ آبادی نمبر بحوالہ اردو کی ظریفانہ شاعری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ص ۸۸

بحیثیت مجموعی اکبر الہ آبادی کی شاعری کے متعلق علامہ عبداللہ یوسف علی کے پیش کردہ تین اہم نکات قابل توجہ ہیں، پہلا یہ کہ اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف پر زور الفاظ میں مشرق کی آواز بلند کی، دوسرے انہوں نے ہندوستان میں مذہب کے زوال پر دلی رنج کا اظہار کیا، تیسرے انہوں نے مکاری، ریاکاری اور بے ہودگی کے خلاف اپنے جذبات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔[1]

رشید احمد صدیقی نے اکبر الہ آبادی کے شاعرانہ کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت سے اہم نکات بیان کئے ہیں، چنانچہ وہ اکبر کے خیالات وافکار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اکبر مشرقیت کے دلدادہ اور مولویت سے بیزار ہیں، وہ باطن کو ظاہر پر فوقیت دیتے ہیں، وہ مغرب کی مادیت کو مذہب اور اخلاق کا دشمن سمجھتے ہیں، وہ ہندوستان کی قومی تحریکوں کے حامی تھے، لیکن ہڑبونگ سے قطعا بیزار تھے، وہ شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند لیڈی پر ترجیح دیتے ہیں، غرض کہ وہ ان تمام باتوں کے خلاف جنگ آزما تھے جن کا تعلق بدمذاقی، کورانہ تقلید، بے تمیزی اور تنگ نظری سے تھا۔[2]

مشرقی تہذیب وتمدن کے لیے مستقبل میں جو حالات پیدا ہو سکتے تھے اس کی تفصیل اکبر الہ آبادی نے اپنی غزل میں اس طور پر بیان کیا ہے:

یہ موجودہ طریقے راہیٔ مُلک عدم ہوں گے

نئی تہذیب ہو گی اور نئے سامان ہوں گے

---

[1] وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص۱۱۸

[2] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص۹۸

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی

نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ غم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی

نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے

نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل ملت سے

نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنی نغمہ تقلید مغرب کے

مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سر ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوں گی

لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں

زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہو گا نہ غم ہو گا

ہوئے جس ساز سے پیدا اسی سے زیر و بم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے

کتابوں میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر

بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

ذیل میں ہم اکبر کے چند اور متفرق اشعار درج کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں اکبر کی شاعری کے رنگ و آہنگ اور ان کے خیالات و افکار کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں   قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور یہ آوارہ ہیں   بیبیاں اسکول میں، شیخ جی دربار میں

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر   شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ   رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

باپ سے، ماں سے، شیخ سے، اللہ سے کیا ان کو کام   ڈاکٹر جنوا گئے، تعلیم دی سرکار نے

طفل سے بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی   دودھ ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا   شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور   ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر　　　گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے　　　کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاءاللہ　　　مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو　　　جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندہ عاجز کی رہے یاد　　　اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اس ستمگر نے بگڑنے کو ہی جب بننا کہا　　　رفع شر کے واسطے ہم نے بھی آمنا کہا

نواب سید محمد آزاد

نواب سید محمد آزاد کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں ہوئی، اصل نام سید محمد تھا، آزاد کے قلمی نام سے شہرت پائی، آزاد کے والد سید اسلام الدین مشرقی بنگال کے ایک سر برآوردہ اور معزز رئیس تھے۔ آزاد کی ابتدائی فارسی اور اردو کی تعلیم مشہور اور قابل معلم آغا احمد علی اصفہانی کی نگرانی میں ہوئی، خداداد فطری ذہانت اور کامل استاذ کی تربیت کے باعث کم عمری ہی میں آزاد کو فارسی اور اردو پر دسترس حاصل ہو گئی۔ اگرچہ آزاد نے باضابطہ کالج میں داخل ہو کر انگریزی کی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن ذاتی محنت اور لگن کی وجہ سے انگریزی زبان میں انہوں نے اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ انگریزی اخبار رئیس اینڈ رعیت اور کلکتہ انگریزی اخبار میں مضامین لکھا کرتے تھے، جو ان کی انگریزی صلاحیت اور اہلیت کے شاہد ہیں۔ آزاد نے 'سب رجسٹرار' کے عہدہ سے اپنی ملازمت کا آغاز کر کے بہت کم

عرصے میں ذاتی محنت ولیاقت کی بدولت 'انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن' کے عہدے تک پہنچ گئے۔ عوامی مقبولیت کی وجہ سے دو دفعہ کلکتہ کونسل کے ممبر نامزد ہوئے، کلکتہ پریسیڈنسی کے مجسٹریٹ بھی رہے اور اپنی نمایاں خدمات کے بدلے آئی، ایس، او (امپیریل سروس آڈر) کا خطاب بھی پایا، سرکاری ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر وقت کلکتہ میں ہی گذرا۔ ۱۹۱۲ء میں ملازمت سے پنشن لے کر کلکتہ ہی میں زندگی کے باقی ایام گزارنے لگے اور یہیں ۱۱/دسمبر ۱۹۱۶ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

آزاد کو بچپن سے ہی ادب وانشا سے دلچسپی تھی، چنانچہ انہوں نے فارسی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں بیش قیمت مضامین لکھے ہیں۔ انہوں نے مضمون نویسی کا آغاز فارسی زبان سے کیا، ان کی سب سے پہلی تحریر دوربین میں شائع ہوئی جو کہ فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا اور 'محمڈن لٹریری سوسائٹی' کا ترجمان تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اردو مضمون نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس وقت کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔ اودھ پنچ سے پہلے وہ اودھ اخبار، مشیر قیصر، آگرہ اخبار، سفیر لدھیانہ، اکمل الاخبار اور اخبار الاخبار جیسے رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے، لیکن ۱۸۷۷ء میں جب اودھ پنچ کی اشاعت عمل میں آئی تو اس اخبار کے انداز اور مقاصد سے آزاد کو اپنے خیالات و نظریات ملتے جلتے نظر آئے، چنانچہ انہوں نے اودھ پنچ کے لئے لکھنا شروع کر دیا اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ درمیان میں کبھی منقطع نہیں ہوا بلکہ زندگی کے آخری وقت تک آزاد کا تحریری و قلمی تعلق اودھ پنچ سے قائم رہا، اس اخبار سے جڑنے کے بعد انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی اور ان کی تحریروں کو عوام میں کافی مقبولیت بھی اسی اخبار کے ذریعے حاصل ہوئی۔

نواب سید محمد آزاد خالص نثر نگار تھے۔ ان کی ساری تحریریں صرف نثر ہی میں ہیں اور انہوں نے اپنی نثر سے وہی کام لیا جو ان کے ہم عصر اکبر الہ آبادی نظم سے لے رہے تھے، آزاد بلند پایہ نثر نگار تھے اور ان کی نثر نگاری میں بھی دیگر بلند پایہ معاونین اودھ پنچ کی طرح طنز و ظرافت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ آزاد مغربی کلچر اور مغربی بود و باش کے

سخت مخالف تھے اور ہندوستانی باشندوں کو مغرب کی کورانہ تقلید اور مغرب پرستی سے باز رکھنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے اپنی تحریروں کو طنز کا رنگ دیا، جہاں انہوں نے اپنی طنز کا نشانہ انگریز، انگریزی حکومت اور انگریزی معاشرت کو بنایا، وہیں انہوں نے مشرقی سماج میں پائی جانے والی باعث ننگ وعار خرابیوں اور مخرب اخلاق پہلوؤں کو بھی ہدف طنز بنا کر اپنی وسعت نظری کا ثبوت دیا، ان کے متعلق رشید احمد صدیقی کی رائے ہے:

> مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دل نشین پیرایہ میں طنز کی ہے، اس کا جواب بہ حیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے، آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے، کینہ پروری اور زہر ناکی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے، اس اعتبار سے ان کو اردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات پر نہایت جامع طریقے سے اظہار خیال کیا ہے، ان کی طنز و ظرافت اتنی صحیح اور جامع اور ادب وانشا کے صحیح معیار کی اس درجہ حامل ہیں کہ ان کے بقائے دوام پر دو رائے ہونا تقریباً ناممکن ہے۔[1]

اودھ پنچ کے تمام قلم کاروں اور انشاپردازوں میں آزاد کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، وہ واحد شخص ہیں جو تبسم زیر لب کے قائل ہیں۔ان کا اپنا ایک مخصوص اور جداگانہ طرز نگارش ہے، جس کی قابل ذکر خصوصیت سنجیدگی ہے۔ وہ اپنی طنزیہ یا ظریفانہ تحریروں میں کبھی بھی متانت و سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لیکن پھر بھی اس سنجیدگی میں بھی ظرافت کے سارے حربے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ آزاد نے مزاح اور سنجیدگی کی آمیزش اس فن کاری کے ساتھ کی ہے کہ دونوں کے بیچ خط امتیاز قائم کرنا مشکل ہے، ان کا یہی انداز تحریر انہیں اپنے دیگر معاصرین سے ممتاز کرتا ہے، آزاد کی تحریروں میں موجود طنز کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر نے لکھا ہے:

---

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص ٦٧

> گرمی، تیزی اور تلخی طنز کے تین عناصر ہیں اور مقصد اس کی روح، طنز کے اس معیار پر آزاد کی طنزیہ تحریں اس درجہ پوری اترتی ہیں کہ اودھ پنچ کے عہد میں اگر کسی شخص کو بجا طور پر طنز نگار کہا جا سکتا ہے تو وہ نواب سید محمد آزاد ہیں، ان کی طنز رکاکت، ابتذال، نفرت، ہجو، تنگ نظری اور عصبیت سے یکسر پاک وصاف اور بلاواسطہ ہے۔[1]

نواب سید محمد آزاد ذہین اور اختراع پسند طبیعت کے مالک تھے، انہوں نے اپنی مضمون نگاری اور طرز تحریر میں خود جدید ایجاد اور اختراع سے کام لیا اور ان کی اسی خوبی اور نمایاں صلاحیت نے اردو طنز و ظرافت کو ایک نیا آب و رنگ بخشا، ان کی تحریروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف مغربی طنز و ظرافت کے مختلف حربوں سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی اختراع و ایجاد کی صلاحیت کو کام میں لا کر قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ چنانچہ متعدد ادیبوں، محققوں اور نقادوں نے ان کی اس صلاحیت کا برملا اعتراف کیا ہے۔ اودھ پنچ کے ہی ایک قلم کار عبد الغفور شہباز نے آزاد کی تحریری خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> جدت پسندی سے مضمون آفرینی کا جو راستہ نکالا، ایسا نکالا کہ جس پر لوگ قدم بھی بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، منزل مقصود کو پہنچنا تو بڑی بات ہے اور ساتھ اس مشکل پسندی کے عام پسندی اس قدر کہ ہر شخص اس پر والہ و شیدا ہے، سب سے پہلے ڈکشنری کی ایجاد کی، اس رنگ نے وہ عام مقبولیت حاصل کی کہ اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے اور اکثروں نے جوش پسندیدگی میں اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن آخر وہی مثل ہوئی کہ ع بھاری پتھر تھا چوم کر رکھ دیا۔[2]

آزاد نے یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو اودھ پنچ میں 'نئی ڈکشنری' کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ اور ظرافت آمیز سلسلہ کی شروعات کی جو اپنی دلچسپ تشریحات کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو یہ عنوان مختلف سالوں میں

---

[1] ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، معاونین اودھ پنچ، ص ۵۳

[2] عبد الغفور شہباز، دیباچہ خیالات آزاد، بحوالہ معاونین اودھ پنچ، مصباح الحسن قیصر، ص ۵۶

مختلف ناموں سے بدلتا رہا لیکن ان میں شاع ہونے والے الفاظ کے معنی، تشریح و تفصیل کے ساتھ جس طرح قارئین کو سمجھائے جاتے تھے وہ طنز و ظرافت سے بھرپور عام دلچسپی کا سبب بن جاتے تھے، الفاظ کی تشریح و توضیح میں اس دور کے سماجی و سیاسی حالات اور بدلتے ہوئے تہذیبی افکار و نظریات پر نشتر زنی کی جاتی تھی۔ لیکن اس مقصد کے حصول میں اس فن کاری سے کام لیا جاتا تھا کہ عوام کی دلچسپی اس سے قائم رہتی، یہ سلسلہ پورے دس سالوں تک جاری رہنے بعد ۱۸۸۷ء میں بند ہو گیا، اس سلسلہ میں آزاد نے الیکشن زادہ، پارلیمنٹ، پالیسی، آنر، انٹرسٹ، پارٹی فیلنگ، سویلزیشن، جیسے متعدد الفاظ کی جو تشریح و تفصیل ظریفانہ انداز میں پیش کی ہے اسے پڑھ کر عام قاری بھی محظوظ ہوتا ہے، اس کے علاوہ آزاد نے 'نوابی دربار' کے نام سے ایک ڈرامہ اودھ پنچ میں قسط وار شائع کیا جس میں اودھ کے دربار پر شگفتہ انداز میں طنز کیا ہے۔ نوابی دربار سید محمد آزاد کا بہترین نثری کارنامہ ہے اور اسے معاصرین نے بھی سراہا ہے۔ ۱۶/اپریل ۱۸۷۷ء میں جاری ہو کر چار مہینہ مسلسل قسط وار اشاعت کے بعد مکمل ہوا۔

آزاد چوں کہ برطانوی حکومت میں ملازم تھے، سرکاری ملازمت میں زبان و قلم کی پابندیاں کسی سے مخفی نہیں اور خاص کر انگریزی حکومت میں یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین تھا، اسی لئے آزاد کو اپنے جذبات واحساسات کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف قلمی ناموں کا سہارا لینا پڑا، وہ اپنی تحریر کے لئے قلمی نام کا انتخاب کرنے میں ماہر تھے، ہمیشہ موضوع کی مناسبت سے ناموں کا انتخاب کر لیتے تھے، ان کے اکثر مضامین تو 'آزاد' یا 'مولانا آزاد' کے نام سے شائع ہوئے ہیں، لیکن ان کے دیگر قلمی نام جن سے ان کے مضامین شائع ہوئے یہ ہیں۔ سعید ازلی، تیغ بے نیام، سوز چراغ، نئی روشنی کا ہستی، کوئی نہیں، لیٹی خروس، محمد بصر اللہ خان، ایک اسی سالہ مجرد، فطرت، تمدنی سوئیپر، صوفیہ، شہاب ثاقب، تہذیب افروز بیگم، خاص رپورٹر وغیرہ۔

آزاد کے مضامین، نوابی دربار کی قسط وار اشاعت اور نئی ڈکشنری کی اشاعت کے علاوہ ان کی اصل شہرت و بلندی کی اساس ان فرضی خطوط پر ہے جو ہندوستان میں بیٹھ کر لندن سے تحریر کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ وضاحت

ضروری ہے کہ نواب آزاد کبھی بھی لندن نہیں گئے بلکہ وہ یہیں ہندوستان میں بیٹھ کر خود کو لندن میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک طالب علم کی حیثیت سے پیش کر کے یہ خطوط لکھے ہیں۔ آزاد کے یہ خطوط جہاں ان کی ذہنی اپج اور قوت تخیل کی بہترین مثالیں ہیں وہیں لطیف طنز وظرافت کے ادبی نمونے بھی ہیں۔ یہ خطوط لندن کی تہذیب و معاشرت، حالات وکوائف، ماحول اور فضا کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان خطوط کی اشاعت کا سبب یہ بنا کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے راجاؤں، نوابوں، رئیسوں اور مالداروں کے لڑکے لندن جاتے، وہاں کے طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کو دیکھ کر تعلیم سے زیادہ تہذیب مغرب میں غرق ہو جاتے اور بعض مرتبہ وہیں شادی بھی کر لیتے۔ ہندوستانی نوجوانوں کو ان مضر اثرات سے دور رکھنے کے لئے انہوں نے فرضی خطوط کا سہارا لیا اور حقیقت میں مغربی معاشرت کی کمزوریوں اور خامیوں کو بے نقاب کرنے کا اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں تھا۔

آزاد کی طنز کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ سماج اور زندگی کے معمولی سے معمولی مسائل بھی ان کے طنزیہ حملوں کی زد سے بچ نہیں سکے ہیں۔ ان کی عمیق نظر نے ہر روش زندگی کے حقائق اور ان کی ناہمواریوں تک رسائی پائی ہے، چنانچہ ایک طرف وہ مغرب کے مسموم اثرات کو نشانۂ طنز بناتے ہیں تو دوسری طرف اپنے ماحول اور سماج کے ان رستے ہوئے ناسوروں پر بھی متوجہ ہوتے ہیں جو معاشرے کی رگ وپے میں فساد پھیلا رہے تھے۔ پھر لطف یہ کہ تہذیبی مغربی رجحانات ہوں یا سیاسی و سماجی بد عنوانیاں، طنز اس قدر فطری ہے کہ کہیں بھی تصنع یا تکلف کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ سماج کی جملہ ناہمواریوں کو اپنے مخصوص انداز تحریر میں اس خوبی سے طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ اس کی نشتریت بھی قابل برداشت ہو جاتی ہے، ذیل میں ہم ان کی تحریروں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جو ان کی تحریروں کی خوبی، طنز و ظرافت کے ادبی نمونے اور ان کے خیال کی بلند پروازی کی بہترین مثالیں ہیں۔ نواب سید محمد آزاد نے فرضی خطوط کا جو سلسلہ جاری کیا تھا، اسی سے ماخوذ ایک خط کا اقتباس پیش ہے۔ اس خط میں ڈیر پاپا (والد بزرگوار) کو خطاب کر کے لندن کی تہذیب و معاشرت کا جس طنزیہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ... یہاں کے ہوٹلوں اور مکانات عام میں اکثر نوکروں کی جگہ خوبصورت، طرح دار، تربیت یافتہ، چست اور چالاک کم سن عورتیں ہیں اور یہی لوگ ہر قسم کا کام، دن کو اور رات کو دیتی اور کرتی ہیں، اور اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش کرتی ہیں کہ آدمی ان پر جان دینے لگتا ہے۔ حضور کے سر مبارک کی قسم، میری تو یہ کیفیت ہے کہ بے اختیار ان کو مارے محبت اور اخلاق کے گلے سے لگانے کو جی چاہتا ہے، حضور اگر دس ہزار روپیے سے میری تائید کریں تو میں یہیں شادی کر سکتا ہوں اور ایک بڑی قابل، حسین اور صاحب جائداد دلہن کو لے کر وہاں آسکتا ہوں، اس کی طرف سے کورٹ شپ کے لیے اصرار ہے مگر میں نے چونکہ حضور کی مرضی اس بارے میں دریافت نہیں کی، اس لیے مجھ کو اب تک انکار ہے، اگر میری شادی میری پسند کے موافق ہو جائے اور میں اپنی بی بی کو لے کر وہاں آؤں اور چورنگی میں بر لب میدان ایک ہوادار اور پر شوکت ایوان میں رہوں تو اس وقت حضور دیکھ سکتے ہیں کہ میری ولایتی بی بی اپنی لیاقت اور اخلاق سے کلکتہ کی اعلی درجہ کی صحبتوں میں کیسی رسائی پیدا کر سکتی ہے، روز کتنے دیسی، سویلین اور ملٹری، جن کو خداوند کہتے کہتے آپ کی زبان خشک ہوتی ہے، میری میز پر صبح و شام کھاتے پیتے اور ناچتے گاتے ہیں، اور ہم لوگوں سے اور یورپین لوگوں سے کیسی بے تکلفی اور دوستی رہتی اور ہوتی ہے۔[1]

اسی طرح ایک اور خط 'مائی ڈیر عفت بیگم' کے نام لکھتے ہیں اور اس میں مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز تحریر میں مغربی کلچر پر طنز کا وار کرتے ہیں، خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> میرا پہلے پہل بسم اللہ مجریہا و مرسیہا کہہ کر دریائے فراق میں کشتی ڈالنا اور بندرگاہ بمبئی سے جہاز دخانی پر چڑھنا کہ تمھاری فرقت مجھ پر سوار ہوئی، اکثر راتوں کو جہاز میں تمھارے

---

[1] ''مائی ڈیر پاپا''، آزاد، بحوالہ طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی، ص ۷۷-۷۸

گیسوئے مشکیں، موباف سرخ اور گرمیٔ ململجے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا مگر جب سے اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا ہے، روز بروز صدمہ مفارقت گھٹتا گیا اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی، اب بخدا تمھاری محبت اسی قدر اور اسی طرح کی مجھے ہے کہ جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا یا کسی پیارے جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے، اس کے معنی یہ نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمھاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمھاری حالت کا جب کہ میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو تم بالکل ایک نیم وحشی چارپایہ بن کر میرے دیدۂ تصور میں آتی ہو اور میں نہایت اس سے پچھتاتا ہوں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی، کیوں نیم وحشی گوشت کے ایک ملنے ڈولنے والی چیز کو میرا باپ بنایا گیا اور کیوں تم سی معصوم نیم وحشی آدمی کے دائمی عیش و آرام کا میں ضامن ٹھہرا، کوہ قاف، سبز پری، لال پری، زرد پری، نیلم پری، سٹر پٹر پری کے قصے لڑکپن سے سنا کرتا تھا اور ان قصوں کو خیالی باتیں جانتا تھا مگر تمھاری جان کی قسم پریوں کا ملک یہی ہے۔ یہاں کی عورتیں آزادی کی ہوا کھا کر جیتی ہیں، ہر قسم کی تعلیم پاتی ہیں، ہر مجلس و محفل میں بے تکلف جاتی ہیں، گاتی ہیں، بجاتی ہیں، ناچتی ہیں، ہر قسم کے مردوں کو خوش کرتی ہیں، عمدہ سے عمدہ شرابیں پیتی ہیں، سواریوں پر سیر کو نکلتی ہیں، میں تو یہاں پڑھنے کو آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں، کوئی آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینۂ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا، جب کسی فرنگی کی واٹر سلک گون پر آنکھیں پڑ جاتی ہے مجھے تمھارا گرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے، جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلف ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمھاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے، جب ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار اور ذہانت جودت سے بیس بیس جنٹل مین یعنی شریف

مردوں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت اس کا تاسف ہوتا ہے کہ تم میرے عزیز مردوں کو دیکھ
کر اس طرح سے مرجھا جاتی تھیں جس طرح سے لجالو۔[1]

آزاد کی تحریریں اس درجہ پُر کشش ہوتی ہیں کہ طنز کے تیز نشتر کے باوجود انہیں پڑھنے اور سننے کی طرف میلان ہوتا ہے، آزاد کی ایک ایسی ہی تحریر سے ایک اقتباس پیش ہے، آزاد نے 'سوانح عمری مولانا آزاد' کے نام سے اودھ پنچ میں ایک کام شروع کیا بعد میں مارچ ۱۸۹۱ء میں یہ باضابطہ کتاب شکل میں شائع ہوئی، آزاد کی یہ سوانح عمری نہ تو خود نوشت حالات ہیں اور نہ ہی کسی کی سوانح یا کارنامے، بلکہ اپنی آڑ میں ایک ایسے فرضی اور خیالی شخص کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے جو انتہائی خود غرض اور مطلب پرست ہے، اسی سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

جب ہمارا رنگ ان معتقدین رؤسا میں جم لیا تو ہم نے اس مضمون پر غور کیا کہ ان کو یکایک انقلاب عقائد، انقلاب لباس اور انقلاب اخلاق کی ایسی کون سی ضرورت پڑی تھی کہ یہ جھٹ پٹ اپنے آباءواجداد کے قدیم طریقے سے پلٹ گئے، ان میں جو جوان تھے ان کی نسبت تو خیر کچھ وجوہات بہ مشکل ذہن میں آتے تھے مگر چالیس کے پہلے سن والوں کی اس خیام خیالی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، چند روز کی سمجھ میں یہ عقدہ حل ہوا اور معلوم ہوا کہ کچھ نہیں بس ان کو بھی اسی چیز کی تلاش ہے جس کے لیے پیر طریقت نے یہ سارا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ دیکھا تو یہ خیال ان لوگوں کا نہایت انصاف مندانہ بھی تھا، کیونکہ نیک نیتانہ آزادانہ کاروائی سے یہ حضرات دنیوی عافیت و آرام اور نام و نشان کے خواہاں تھے، کسی کو خلعت کی ضرورت تھی، کوئی خطاب مانگتا تھا، کوئی لاٹ صاحب سے صرف تھینکس کا خواہاں تھا، ان ہی پاک اغراض ذاتی حاصل کرنے کے لیے عقائد اسلام کی ترمیم اور اخلاق و عادات و معتقدات کی تبدیلی کی ضرورت ان بزرگوں کو لاحق ہوئی تھی جس میں ہماری تائید اکسیر تاثیر تھی۔[2]

---

[1] "مائی ڈیر عفت بیگم" آزاد، اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد دوم، ۳۰ جولائی ۱۸۷۸

[2] سوانح عمری مولانا آزاد، آزاد، بحوالہ معاونین اودھ پنچ، مصباح الحسن قیصر، ص ۹۷

آزاد نے جو فرضی خطوط لکھے ہیں ان میں ایک خط 'ڈیر پاپا' میں اخلاقیات کا سبق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ... حضور کے سرفراز ناموں کو اس طرح چھپاتا ہوں جیسے عورت عمر، مبروص داغ، کیونکہ خدانخواستہ اگر حضور کا غیر مہذب مراسلہ یہاں کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو پھر لندن میں میرا رہنا مشکل ہو جائے، اور شاید فرط غیرت سے میں خود کشی کر لوں، حضور برابر تاکید فرماتے ہیں کہ یہ ہیچ میرز بھی چھوٹی بیگم کی شادی کے بارے میں رائے دے، افسوس ہزار افسوس اب خیال شریف میں یہ موٹی بات بھی نہیں آئی کہ جب تک آدمی انگریزی نہ پڑھے کبھی زیور علم واخلاق سے واقف اور نسواں کے فرشتہ سیرت اور حور نزاد فرقے کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہو سکتا، للہ ایک بار تشریف لائیے اور خاندان کی ساری مستورات کو لیتے آیئے، پھر دیکھیے عورتیں کس طرح رہتی اور مردوں کی جودت کی کل کو اپنی گرما گرمی اور با ضابطہ اور پاک ناز نخرے سے کس طرح گرماتی رہتی ہیں، میرے رائے میں چھ برس شادی کا ذکر ہی نہ کریں، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، صرف ۱۷/ برس، اور یہ عمر شادی کے واسطے مہذبوں میں نہیں ہے، چھ سال بعد اس کو دولہا پسند کرنے کا موقع دینا چاہیے۔[1]

مچھو بیگ ستم ظریف

مچھو بیگ ستم ظریف کا اصلی نام مرزا محمد مرتضیٰ عاشق، عرفی نام مچھو بیگ ہے، ستم ظریف کے فرضی نام سے نظم و نثر لکھتے تھے۔ ان کے والد مرزا اصغر علی شرفاء لکھنؤ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ یہ لوگ اصلاً اٹک کے باشندے تھے لیکن ستم ظریف کے دادا مرزا عطاء اللہ نے ترک وطن کر کے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کر لی تھی، یہیں ۱۸۳۱ء میں ستم ظریف کی ولادت ہوئی، ان کی پرورش و پرداخت ان کے نانا مرزا اسد علی بیگ کے زیر سایہ ہوئی جو

---

[1] نامہ بنام ڈیر پاپا، آزاد، بحوالہ طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی، ص ۷۹

تاجدار اودھ کی فوج میں عہدہ کمیدان پر فائز تھے۔ زمین داروں سے مال گذاری وصول کرنے کے لئے اکثر مواضعات میں ان کا جانا ہوتا تھا جس میں عموماً ستم ظریف بھی ساتھ ساتھ ہوتے تھے، بائیس سال کی عمر تک فن سپہ گری سیکھنے اور کسرت کرنے کا شوق رہا اور عمر کے اس مرحلہ تک تعلیمی اعتبار سے معمولی درسیات اور قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر پائے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انہوں نے تعلیم کی طرف خاص توجہ دی اور بطور خاص محنت و ریاضت کی بدولت کافی علمی لیاقت پیدا کر لی اور شعر و سخن کی جانب مائل ہوئے۔ ذاتی مطالعہ اور خداداد ذہانت کی بدولت شعر و ادب اور علم عروض میں مہارت حاصل کر لی۔ ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

مرزا مچھو بیگ نے کچھ دنوں تک شاہی توپ خانہ میں ملازمت کی، لیکن اپنی دوسری شادی نواب حسینی بیگم سے کرنے کے بعد ملازمت ترک کر دی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیوی ایک صاحب ثروت خاتون تھیں اور مال و دولت اور خدم و حشم ان کے پاس پہلے ہی سے تھے، مال و سائل کی فراوانی اور اقتصادی تفکرات سے آزادی کے حصول کے بعد ستم ظریف نے پوری زندگی علم و ادب کی خدمت اور شکار کے شوق میں گزار دیا۔ سیاسی اعتبار سے وہ 'انڈین نیشنل کانگریس' کے حامی و طرفدار تھے۔ اس کے جلسوں میں بحیثیت ڈیلی گیٹ شرکت کرتے تھے۔ ہندستانی سماج میں نشو و نما پانے والی سماجی برائیوں کو ناپسند کرتے تھے اور مغربی تہذیب و تمدن کے مخالف اور مشرقی اقدار روایات کے علمبردار تھے۔ انہوں نے نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی اور بہترین مضامین لکھے۔ شاعری میں مرزا اصغر علی نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ طبیعت میں بلا کی روانی اور موزونیت تھی۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے اور فن عروض میں کافی مہارت حاصل تھی۔ شاعری میں ان کی کئی تصانیف جیسے گلزار نجات، میلاد شریف منظوم، مثنوی نیرنگ خیال اور آفتاب قیامت منظر عام پر آئیں۔

ستم ظریف گرچہ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے لیکن ادبی دنیا اور عوامی حلقوں میں اپنی نثر کی بدولت انہوں نے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اودھ پنچ میں انہوں نے مسلسل ۳۳/ سالوں تک مضامین لکھے۔ وہ اسم بامسمّٰی

تھے جس طرح ظریف ان کے نام کا حصہ تھا اسی طرح وہ عملی زندگی میں بھی فطرتاً ظریف تھے۔ ان کی تحریریں شوخی اور بذلہ سنجی سے معمور ہوتی تھیں جو عوام و خواص میں بڑی مقبول تھیں۔ ستم ظریف عموماً لکھنؤ کے ہی حالات و کوائف اور ماحول کی ترجمانی اپنے مضامین میں کرتے تھے۔ موضوعات کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے، وہ عام اور معمولی باتوں ہی میں دلچسپ پہلو نکال لیتے ہیں اور انہیں اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ مضامین میں جدت اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی ادبی خدمات اور طرز تحریر کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے معروف صحافی حسرت موہانی لکھتے ہیں:

> آپ کی نظم و نثر کے تمام کارنامے ہنگامہ ۵۷ء کے بعد کے ہیں، مرزا نسیم مرحوم بھی اسی زمانہ میں دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے، ان کی صحبت اور شاگردی نے سمند ناز پر تازیانے کا کام کیا اور آپ کے ادبی مذاق کی خوبیوں نے روز افزوں ترقی کے ساتھ پایان کار وہ مرتبہ حاصل کیا کہ آپ نثر نگاری میں یکتائے روزگار اور سخن سنجی میں استاذ قرار پائے، لکھنؤ کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ میں اس کی ابتدا سے لے کر اپنی اخیر عمر تک ۳۳/ سالوں تک برابر ستم ظریف کے فرضی نام سے ایسے دل چسپ مضامین لکھتے رہے جن کا ادبی اور تنقیدی حیثیت سے بے مثل و بے نظیر ہونا آج تک اہل قلم کے حلقہ میں مسلم سمجھا جاتا ہے۔[1]

ستم ظریف کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر نے ان کے مضامین میں پائی جانے والی خصوصیات اور ان کے قلم کے کمالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> طنز کی بہ نسبت ستم ظریف کے یہاں ظرافت کی فراوانی ہے جس کا زیادہ تر تعلق زبان اور الفاظ سے ہے، وہ عام واقعہ کو مضحکہ خیز حد تک بیان کرنے کے عادی ہیں، تاہم ان کی ظرافت نگاری میں موازنہ، مبالغہ، واقعہ اور مخصوص اسٹائل کے امتزاج کی بدولت پائداری موجود ہے، چنانچہ آج بھی ان کے مضامین اپنی مخصوص شگفتگی اور رعنائی کے اعتبار سے شہ پارے

[1] اردوئے معلی، ماہ نومبر ۱۹۱۰، بحوالہ معاونین اودھ پنچ، مصباح الحسن قیصر، ص۔ ۱۶۷

> ہیں، کہیں کہیں ان کی تحریروں میں طنز و ظرافت کا بھی نہایت حسین و لطیف سنگم نظر آتا ہے۔ طنز کی یہ مدھم چنگاری ظرافت کے ڈھیر میں اس وقت چمکتی ہے جب وہ نوابوں، وکیلوں، گواہوں اور ہندوستانی مستورات کی مخصوص فطرت کو طشت از بام کرتے ہیں، ورنہ عام حالت میں ان کی تحریریں طنز سے معرا اور ظرافت سے لبریز ہوتی ہیں۔[1]

مچھو بیگ ستم ظریف کی زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے، لکھنوی زبان کے محاورات اور روزمرہ استعمال ہونے والے فقرے اور کلمات کے استعمال میں انہیں انفرادیت حاصل ہے، نثر ہو یا نظم وہ محاورات کا بر محل استعمال کرتے ہیں، کہیں بھی بے محل استعمال یا بھونڈے پن کا شائبہ تک نہیں ہوتا، بے محل اور برجستہ استعمال کی پُر لطف چاشنی سے ان کی عبارت کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے، زبان عموماً عام فہم اور سہل ہوتی ہے، ذیل میں ہم ان کی تحریروں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جن سے ان کی تحریروں کی خوبی اور خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ذیل میں ایک مضمون سے اقتباس پیش ہے، اس مضمون میں ایک شکی مزاج بیوی اور اس کے شوہر کی زندگی کا بڑے پر لطف انداز میں بیان ہے، بیوی کے شک کی وجوہات اور شوہر کی پریشان حالت کا بڑے خوبصورت انداز میں نقشہ کھینچا ہے، مضمون کا عنوان ہے: 'ہو گیا زندگی سے جی بیزار و قنا ربنا عذاب النار'، اقتباس ملاحظہ کریں:

> ... غرض کہ آئے دن کی تو تو میں میں پھر ہانڈی کا سا ابال ایک مورچہ ہو چکا تھا کہ دوسرا قلعہ دغنے لگا، نیند کس شام سے آتی تھی کبھی دو بجے تک آنکھ لگتی، ٹھنڈی سانس اکثر اوقات بلا ضرورت بھی نکل جاتی ہے، شعر کا پڑھنا اور اس کے مضامین کا مختلف ہونا کچھ اختیاری بات نہیں اور نہ کچھ ایسی قباحت ہے، بھوک پہ کچھ ضرور نہیں کہ ایک سی رہے اور ایک ہی وقت اشتہار ہوا کرے، سوئے میں آدمی بد خواب بھی ہوتا ہے براتا بھی ہے، مشکوک مزاج اکثر گھری پرنالی کی چھینٹ سے بھی بغیر نہائے چارہ نہیں، نماز بڑے بڑے نمازیوں کی ایک کیا دو

[1] مصباح الحسن قیصر، معاونین اودھ پنچ، ص ۱۷۱

دو چار چار وقت کی قضا ہو جاتی ہے، آنکھیں مخمور مزاجوں کی تو ہمیشہ اور یوں عموماً گرمیوں کی فصل میں یا کسی گرم غذا کے کھانے میں سرخ بھی ہو جاتی ہیں، رنج و ملال انسان کو ہوا ہی کرتا ہے، سوئے میں کروٹ کا ادھر سے ادھر ہو جانا کوئی ایسے گناہ کی بات نہیں، پھر سوا موا برابر مشہور ہے لیکن توبہ توبہ العظمت للہ جتنے سامان عرض کئے گئے یہ جملہ دفعات مندرجہ بالا ایک ایک کو تخم فساد کہنا چاہیے اس میں جو پھنسی سے وہ ایسا دل باندھتی ہے جس کی حد نہیں، وہ الجھنیں ہوتی ہیں کہ مہینوں کلیجے پر نشتر پڑا کرتے ہیں۔۔۔"[1]

اسی طرح ایک اور مضمون بعنوان 'کرسمس' میں عیسائیوں کے اس تہوار کے موقع سے ایک عیسائی کی اپنے گھر میں تیاری کا حال بیان کرتے ہیں، انگریز اس پورے منظر میں جس طرح کی زبان کا استعمال کرتا ہے اور اس کی جو گھریلو زندگی ہے، اس کا نقشہ کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے، ملاحظہ کریں:

کرسمس ڈے دھوم دھام، گرجا کا اہتمام و میوہ جات کی گرانی، ڈالیوں کی ارزانی، کیک بسکٹ کی طیاری (تیاری)، بنگلے کوٹھیوں کی گل کاری، انگریزی بانسری کا بجنا، تنبور کا گرجنا، لباس و زیور کی آرائش، تکلفات کی افزائش قابل دید ہے۔ انگریزوں کا بڑا دن نئی روشنی والوں کی انگریزی عید ہے، صاحب لوگوں کے تکلفات جو کچھ ہوں واجب اور بجا ہیں، مگر نئے بگڑے نیو کرسچن کا حال نہ پوچھیے، بیرا! ول بیرا۔ اِڈر آؤ، کل بڑا دن ہے، چائے کا کیلی بہت پرانا ہو گیا ہے، کلعی گر سے بولو سی جوس کر کے پیندے میں جوڑ لگا دے، ویل ڈیکھو، وہ کالا بوٹ ہماڑا لے جاؤ، بہت سک ہو گیا ہے، چمار سے بولو پیوند لگا دے، اوس کا ایڑی بالکل گر گیا ہے درست دے، وہ کالا کوٹ الپاکہ والا جو مسٹر بچکر کے مرنے کے بعد مہم نیلام میں لیا تھا اور لال ٹوپی جو سر کے میل سے کالا ہو گیا ہے جسے مسٹر سیٹر میڈ نے جوتا پونچھ کر پھینک دیا تھا اور ہم نے دھلوا کر رکھ چھوڑا تھا نکال رکھو اور رات کو کسی بگیے سے دو نرنگی چورا لاؤ اور وہاں

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد چہار دہم، ۳۱ جولائی ۱۸۹۰

نچانہ سکو تو بدھو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مشلچی سے ہمارا اسلام کہو اور لے آؤ، ہمارا کھانا میج جس
پر مکھیاں لپٹا رہتا ہے کوئی چیتھڑا لے کر پونچھ دو، کل ہمارا دوست لوگ سب ہوگا۔"[1]

منشی احمد علی شوق

منشی احمد علی شوق کی ولادت ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ کے مضافاتی قصبہ 'جگور' کے ایک معزز و ممتاز خاندان میں ہوئی، ان کے والد شیخ کاظم علی قیس قصبہ کے ایک بارسوخ اور دولتمند خاندان کے چشم و چراغ تھے، شعر و سخن کے دلدادہ ہونے کے ساتھ خود بھی اچھے شاعر تھے، شوق جب صرف ڈھائی سال کے تھے کہ ان کے والد کا اچانک بیس سال کی عمر میں ہی ۱۸۵۵ء میں انتقال ہو گیا اور شوق والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے، ابتدائی تعلیم و تربیت ماں کے سرپرستی میں اپنے آبائی وطن میں ہوئی اور مولوی عبدالحئی موہانی استاد مقرر ہوئے، قرآن شریف اور ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم شوق نے ان سے حاصل کی پھر اپنے بہنوئی شیخ امیر الزماں صدیقی کے ہمراہ والدہ کی ایماء پر گیارہ سال کی عمر میں اناؤ چلے گئے، امیر الزماں سرکاری ملازم تھے اور ملازمت کے سلسلہ میں جہاں جہاں ان کا قیام رہا شوق کو اپنے ساتھ رکھ کر عربی و فارسی کی تعلیم مکمل کرائی اور بدایوں میں قیام کے دوران اسکول میں داخل کرا دیا جہاں سے انہوں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور یہیں سے کچھ گھریلو مجبوریوں کی بناپر تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے وطن واپس آنا پڑا، زندگی کے آخری ایام اپنی صاحبزادی کے پاس گونڈہ میں گذارے اور وہیں ۲/۷ اپریل ۱۹۲۵ء کو انتقال ہوا۔

شوق کی زندگی میں بڑے دشوار کن مراحل آئے مگر انہوں نے تمام چیزوں کا بڑی ہمت و بہادری سے مقابلہ کیا۔ والد کی وفات کے بعد جائداد اور جاگیر کا بڑا حصہ ضبط کر لیا گیا جو ان کے والد کو شاہی خدمات کے صلے میں ملا تھا، جو کچھ موروثی زمینداری تھی اور کئی مواضعات ان کے خاندانی قبضہ میں تھے ان پر شوق کے چچا نے قبضہ کر لیا اسی لئے انہیں اپنی تعلیم ترک کر کے گھر آنا پڑا، مشترکہ جائداد کی تقسیم میں اس قدر جھگڑے اور تنازعات ہوئے کہ شوق کی

---

[1] کرسمس، ستم ظریف، اودھ پنچ لکھنؤ، بحوالہ، چنگاری دہلی کالم نگار نمبر، ایڈیٹر جمیلہ احمد ۱۹۸۴

کوششوں کے باوجود باہمی تصفیہ سے اس کی کوئی شکل نہ نکل سکی۔ چنانچہ مجبور ہو کر شوق نے چچا کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور وہ مقدمہ جیت گئے، ان دشوار گذار مراحل سے گزرنے کے بعد جب کچھ اطمینان نصیب ہوا تو لکھنؤ میں قیام پذیر ہو کر علمی اور ادبی مشاغل کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے ایک اخبار آزاد جاری کیا۔ سات آٹھ سالوں تک جاری رکھ کر مالی دشواریوں کے باعث آگے وہ اس اخبار کو نہ چلا سکے اور اسے منشی سجاد حسین نے خرید لیا، شوق نے ملازمت کی ابتدا راجہ صاحب اجودھیا کے یہاں سے شروع کی لیکن جلد ہی وہاں ملازمت چھوڑ دی۔ بعد میں مہاراجہ پرتاپ گڑھ نے انہیں اپنی ریاست میں نیابت کی پیش کش کی۔ شوق نے اسے منظور کر لیا لیکن طبیعت نہ لگنے کے باعث استعفاء دے کر لکھنؤ واپس آگئے۔ پھر وہ بھوپال تشریف لے گئے، وہاں ان کا تقرر ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ہو گیا اور اپنی زندگی کے خوشگوار بائیس تیئیس سال وہاں نیکنامی کے ساتھ گزار کر کلکٹری کے عہدہ پر پہنچ کر پنشن لے لی۔ پھر ریاست رام پور سے وابستہ ہو گئے اور وہاں کے سرکاری کتب خانہ میں گیارہ سالوں تک ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔

شوق نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جہاں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، وہاں کا ماحول علمی، ادبی اور شاعرانہ تھا، اوئل عمر سے ہی اساتذۂ ادب اور مشاہیر علماء کی صحبتوں میں وقت گزارا، لہٰذا ابتدا سے ہی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا۔ چودہ سال کی عمر سے ہی غزل کہنا شروع کر دیا اور برابر سلسلہ مشق کو جاری رکھا، وقت گزرنے کے ساتھ کلام میں پختگی آتی گئی اور پھر اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا، شاعروں میں اسیر لکھنوی کی شاگردی اختیار کی اور شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کی غزلوں میں معاملہ بندی، ہجر و وصال، گل و بلبل، شمع و ویرانہ اور قفس و آشیانہ جیسے روایتی شاعری کے اجزا رہے ہیں۔ لیکن ان تمام میں متانت و سنجیدگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یوں تو شوق نے غزلیں بھی کہیں، لیکن نظم میں ان کا ذوق سخن زیادہ نمایاں ہوا، انہوں نے طویل نظمیں اور مثنویاں کہیں جو اخبارات و رسائل میں اشاعت پذیر ہو کر عوام و خواص میں مقبولیت اور داد تحسین حاصل کر چکی ہیں، ان کی سب سے مشہور مثنوی 'ترانۂ شوق' ہے جو ان کے دور شباب کی لکھی ہوئی ہے اور ماہ عالم اور یاسمین کی محبت کا ایک فرضی قصہ ہے۔

شوق جہاں ایک مشہور اور قادر الکلام شاعر تھے وہیں وہ ایک مستند اور ممتاز انشاء پرداز بھی تھے، نظم کی طرح نثر میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے بلند پایہ نثری نگارشات سے اردو ادب کو جلا بخشی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، علمی، ادبی، تنقیدی اور مزاحیہ قسم کے موضوعات پر انہوں نے مضامین لکھے اور وہ اودھ پنچ کے ساتھ ساتھ دیگر معیاری رسائل و جرائد میں تحسین آمیز تبصروں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، شوق نے ابتدا میں زیادہ تر مذہبی موضوعات پر لکھے ہیں۔ لیکن اپنے اخبار آزاد کے اجرا کے بعد دیگر سیاسی و سماجی موضوعات پر بھی کثرت سے لکھنے لگے اور آزاد کے علاوہ دیگر اخبارات میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ یوں تو انھوں نے طنز و ظرافت کے پیرایہ کو بھی اپنی تحریروں میں اختیار کیا ہے لیکن ان کے علمی اور ادبی مسائل پر لکھے گئے مضامین میں عالمانہ وقار پایا جاتا ہے، اودھ پنچ میں بھی ان کے کافی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ خاص کر گلزار نسیم کے سلسلہ میں شرر اور چکبست کے معرکہ میں جو تحریریں اودھ پنچ میں شائع ہوئیں ان میں شرر کے دعوے کی مخالفت میں شوق کے بہت سے مضامین شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک مضمون گلزار نسیم اور مرحوم نسیم شائع ہوا۔ اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے اس مضمون کو گلزار نسیم پر قول فیصل کے تبصروں کے ساتھ شائع کیا۔ اس کی ابتدا میں جو تبصرہ لکھا ہے اس سے شوق کی علمی قابلیت، وسعت نظری اور ہر دل عزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> گلزار نسیم کے متعلق آج ہم جناب منشی احمد علی شوق صاحب کی ایک تحریر شائع کرتے ہیں، اس اظہار کی ضرورت نہیں کہ ہم بتائیں جناب موصوف پرانے تجربہ کار محقق واقف کار نکات و لطافت فن، کہنہ مشق شاعر باکمال نثّار بے مثال اور مغتنمات ملک سے ہیں، آپ کا کلام ملک میں ہمیشہ نظر قبول سے دیکھا گیا ہے، آپ کی قابلیت کے سکے مدت سے بیٹھے ہیں، ایک مدت تک آپ اخبار 'آزاد' کے مالک اور ایڈیٹر بڑی ناموری کے ساتھ رہ چکے ہیں اور اعلٰی نثّاروں میں نام کر چکے ہیں، آپ کی رائے اوروں کی رائے کی طرح خدانخواستہ نہ تعصب مذہبی کی عفونت سے گندہ ہے اور نہ صرف نثر کے تخلص کی طرح بودی اور دکھاوے کی آبلہ

فریبی ہے، بلکہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ان بزرگ وار کی منصفانہ بے لوث رائے ہے جو ایک ہی
فن میں نسیم سے دوش بدوش مسابقت کے میدان میں قدم زنی کر چکے ہیں۔[1]

شوق مغربی تہذیب و تمدن کے مخالف تھے اور انہوں نے اس کے قابل اعتراض پہلوؤں کو نقائص اور عیوب کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ خاص کر اودھ کی بگڑی ہوئی معاشرت کو ہدفِ طنز بنایا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر کی تحریر ملاحظہ کریں:

شوق نے زیادہ تر اودھ کی معاشرت کو ہدفِ طنز بنایا ہے، البتہ کہیں کہیں نئی روشنی کے بعض قابل اعتراض پہلوؤں کو بھی اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کے نقائص اور عیوب از خود بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ دراصل وہ صرف تصویریں پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں، اس اعتبار سے ان کا انداز مزاح بیانیہ ہے جو ان کی طرز تحریر کے سہارے ابھرتا ہے، دھیما دھیما مزاح جو ایک طرف خوش طبعی کا مظہر ہے تو دوسری طرف اپنے اندر طنز کے تیر و نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے، شوق کا پسندیدہ طرز تحریر ہے۔[2]

شوق کے مضامین کی خوبیوں اور ان کی تحریر کے رنگ کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ان کے مضامین سے چند اقتباسات پیش ہیں، تناسخ کے مسئلہ پر وہ لکھتے ہیں:

حضرت پنچ! مجھے تو اب تناسخ میں کچھ بھی شک نہیں رہا، جتنے خیالات اس مسئلے کے خلاف تھے، سب کا ڈربہ پھنک گیا کہ بقول اہل تناسخ اگر روحوں کا الٹ پھیر ہوا کرتا ہے اور صرف اتنا ہی ہے کہ ایک لباس سے دوسرا لباس ملتا ہے تو ابتدائے آفرینش کے وقت جب کہ انسان کے لباس میں روحوں کا وجود بظاہر کم تھا، اس کثرت سے روحیں کہاں رہتی تھیں، اگر نیچر کے یہاں کوئی کانجی ہاؤس اس وقت تیار تھا تو اب کیا ہوا، لیکن ڈارون کی تھیوری نے اس

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و نہم، ۳۱ جولائی ۱۹۰۵

[2] مصباح الحسن قیصر، معاونین اودھ پنچ، ص ۱۶۴

خیال کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم سنبھال لیے، جانوروں کا ترقی کر کے انسان ہونا کیا اس سے یہ مطلب ہے کہ صورتوں میں یا کذائی لباس میں ترقی ہوئی، بالکل غلط، مطلب یہ ہے کہ پیشتر جو کیڑے مکوڑے اور جانور رہتے ان کی روحیں بقاعدۂ تناسخ قلا بازی کھا کے انسانی اجسام میں آئیں اور جس کا ثبوت انسانی حرکات سے پیش نظر ہے، مناسب تصور فرمایئے:

پہلے کیا تھے	اب کیا ہوئے	مناسبت
عنکبوت	جولاہا	تانا
پروانہ	حاسد یا عاشق	جل مرنا
بچھو	پولیس کا ملازم	نیش زنی
گھوڑا	کہار	سواری
چینٹا	بنیا	دانہ دانہ جمع کرنا۔[1]

ان کی شاعری کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ کریں جس میں اودھ کی گری ہوئی معاشرت اور نوابوں کی عیش پرستی اور نادانی کی ایک تصویر کھینچی گئی ہے، نمونہ کے لئے دو تین اشعار پیش ہیں:

چانڈو سے زمانہ میں محبت ہے ہمیں　　بمبو پہ دل آگیا ہے الفت ہے ہمیں
دم اپنا رہے یا نہ رہے بھاڑ میں جائے　　دنیا میں مدک کا دم غنیمت ہے ہمیں

رہے دو گھڑی دن تو بن ٹھن کے خوب　　کرو چوک کی سیر تن تن کے خوب
بٹیر ایک دو ہاتھ ہی میں رہیں　　کہ تا لوگ نواب صاحب کہیں

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد نہم، ۲۱ مئی ۱۸۸۵

مذکورہ بالا مضمون نگاروں اور انشاپردازوں کے علاوہ اور بھی بہت سے نامور قلم کار ہیں جن کا تعلق اودھ پنچ سے رہا ہے اور جن کی ادبی و صحافتی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، اختصار کے پیش نظر ان تمام کا ذکر نہیں کیا جا سکا اور اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہے، یوں تو معاونین اودھ پنچ کی ایک بڑی تعداد ہے لیکن چند نمائندہ قلم کاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا بھی شمار ہے۔ سرشار ایک صاحب طرز ادیب اور ماہر زبان انشاپرداز تھے۔ ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ادارت سنبھالنے سے پہلے تک وہ مسلسل اودھ پنچ میں ہی لکھتے رہے، اودھ اخبار کی ایڈیٹری نے سرشار کو اودھ پنچ کا حریف بنا دیا، تاہم ایک سال تک اودھ پنچ سے جڑے رہنے کی وجہ سے ان کا بھی شمار اودھ پنچ گروہ میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر، مولوی سید عبد الغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، مولوی احمد علی کسمنڈوی اور سید مقبول حسین ظریف کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یہ وہ بلند پایہ ادباء اور نامور صحافی ہیں جن کی ابر گہر بار تحریریں اودھ پنچ کے صفحات میں شائع ہوتی رہیں اور ان تحریروں نے مغربی تہذیب و تمدن کو اپنی طنز و مزاح کا نشانہ بنا کر انہیں ہندوستان میں سرعت کے ساتھ پھیلنے سے روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اودھ پنچ کا صحافتی دور اور ملک کا سیاسی، سماجی و معاشی پس منظر

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں سیاسی اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اب انگریز حکمراں طاقت و قوت کی بدولت آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو ملک بدر کر کے پورے ملک پر مکمل اقتدار حاصل کر چکے تھے، برطانوی پالیسی اور طرز حکومت دونوں میں تبدیلی آگئی تھی، نظام حکومت کمپنی کے ہاتھ سے منتقل ہو کر سلطنت برطانیہ کے ہاتھ میں پہنچ گیا تھا، دیسی ریاستیں آہستہ آہستہ حکومت برطانیہ کی ماتحتی قبول کر رہی تھیں اور ملکۂ برطانیہ ہندوستان کی بھی ملکہ بن چکی تھی، ملک کی سیاسی اور انقلابی تحریکیں کمزور پڑ چکی تھیں، آزادی کے متوالوں کو جیل کی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا تھا یا پھر درندگی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھانسی دے دی گئی تھی یا گولیوں اور توپوں کا نشانہ بنا کر انہیں شہید کر دیا گیا تھا، انگریزوں کے ان ظالمانہ کرتوتوں کی وجہ سے ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں

میں خوف وہراس کی زبردست کیفیت پیدا ہو چکی تھی اور وہ گو مگو کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے، باشندگان ہند میں اب دو طرح کے نظریات کے حامل افراد پائے جانے لگے، ایک طبقہ تو وہ تھا جس نے اس بات میں عافیت محسوس کی کہ سات سمندر پار سے آنے والے انگریزوں کی پچھلی ظلم وزیادتی کو فراموش کرکے ان کی حکومت کو ایک نعمت تصور کر لیا جائے اور ان کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا جائے تاکہ امن وامان اور سکون واطمینان کی زندگی گزار سکیں، دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے کسی بھی حال میں انگریزی حکومت کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کیا، اس طبقہ نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور وہ اس حکومت کو ہمیشہ ہندوستان کے مستقبل کے لئے مضر تصور کرتے رہے، انگریزی حکومت سے ان کا شک وشبہ اور نفرت وبیگانگی کا رویہ ختم نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ماضی کے تجربات اور ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے ظالمانہ برتاؤ اور ناروا سلوک اس حکومت کے مستقبل کے عزائم اور ملک کے تئیں ناپاک سازشوں کا پتہ دے رہے تھے۔

ہندوستانی عوام کا وہ طبقہ جو انگریزی حکومت کو ملک کے مفاد میں بہتر سمجھتے ہوئے اسے تسلیم کر چکا تھا اور مغربی تہذیب کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے اسی راہ پر چل پڑا تھا، وہ انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا ثبوت پیش کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگ گیا، چنانچہ اس کی بہترین مثال ۱۸۵۷ء میں شہزادہ ویلز کے دورۂ ہند کے موقع سے والیان ریاست کی جانب سے پیش کئے گئے قیمتی تحائف، دیسی اخبارات کے ذریعہ خوب سے خوب تر تفصیلات، خصوصی ضمیمہ کی اشاعت، خوشی ومسرت کا اظہار اور شعراء وادباء کی جانب سے پیش کئے گئے قصائد ہیں، ایک طرف تو ہندستانی باشندوں کا انگریزوں کے ساتھ یہ رویہ تھا دوسری طرف ملک کی معیشت اور امن وامان کی جو صورت حال تھی اسے اودھ پنچ میں شائع خبر میں ملاحظہ فرمائیے:

> ہندوستان پر صدہا سال سے پردیسی حکومت کرتے آئے ہیں، لیکن آج کل جو خاک اڑ رہی ہے، ان کے زمانے میں نہیں تھی، یہ سچ ہے کہ پرانے حاکم اپنے خزانے رعایا میں نہ بانٹ

> دیتے تھے لیکن رعایا میں یہ کنگالی بھی نہ تھی، کیوں کہ ملک کا روپیہ ملک میں رہتا تھا، بادشاہ کے ہزاروں ملازم جن کے پاس لکھو کھا روپیہ تھا وہ رعیت کے ساتھ باپ دادا کا سا سلوک کرتے تھے، لیکن اب تو رعایا سے کروڑوں روپیہ لے لیا جاتا ہے، جب تک حکومت یہ تہیہ نہ کر لے کہ ہندستان کی دولت باہر نہ جائے گی تب تک امن قائم نہ ہو گا۔[1]

ایک دوسرا واقعہ جو انگریزی حکومت کی بے حسی اور سنگ دلی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں ملکۂ برطانیہ کو 'قیصرۂ ہند' کا لقب دینے کے لئے بڑی شان و شوکت کے ساتھ 'دہلی دربار' کا انعقاد ہوا، جس میں ہندوستان کے مال و دولت کو بے دریغ خرچ کیا گیا، ملکہ کی تصویر سے مزین نئے سکے لٹائے گئے جن پر ملکہ کا نیا خطاب 'قیصرۂ ہند' کندہ تھا، جب کہ ان ہی دنوں ملک کی یہ حالت تھی کہ کچھ ہی دنوں پہلے حشر انگیز طوفان سے ڈیڑھ لاکھ غریب ہندوستانیوں کی جانیں تباہ ہو گئی تھیں، اسی زمانہ میں ہندوستان کے مختلف اضلاع میں وہ بدترین قحط پڑا تھا جس میں لاکھوں جانیں تلف ہو گئی تھیں، ان ارضی و سماوی آفات اور مصیبتوں اور انگریزوں کی ظلم و زیادتی کے آثار پھیلے ہوئے تھے کہ اسی دور میں اس شاہی دربار کا انعقاد ہوا جس میں ملک کی دولت کو بے حساب لٹایا گیا، مذکورہ بالا دونوں مواقع پر اہل ہند نے ان سارے ناگفتہ بہ حالات کے باوجود اپنی وفاداری اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیا لیکن ان کے ساتھ ہمیشہ سوتیلا برتاؤ کیا گیا اور ہندوستانیوں کے حقوق کی زبردست پامالی کی گئی، جس کی مثال ۱۸۸۲ء میں اینگلو انڈین باشندوں کے ذریعہ 'البرٹ بل' کی مخالفت ہے، جس بل کا مقصد قانون کے نفاذ میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان قائم امتیاز کا خاتمہ تھا۔

برطانوی عہد حکومت میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں جہاں ہندوستان میں نیا سیاسی و اقتصادی نظام متعارف ہوا، وہیں سب سے اہم تبدیلی معاشرتی اور تہذیبی سطح پر ہوئی، مغربی تعلیم اور تہذیب کے اثرات جوں جوں

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد دہم، ۲۸ مئی ۱۸۸۶

بڑھنے لگے اور ہندوستانی معاشرہ اس سے متأثر ہونے لگا تو جدید و قدیم قدروں میں تصادم شروع ہوا، انگریزی تعلیم، انگریزی ملبوسات اور انگریزی تہذیب و معاشرت کے خلاف ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں میں سخت رد عمل شروع ہوا، سر سید نے کیمبرج ہونیورسٹی کے طرز پر 'اینگلو محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ 'مسلمانوں میں انگریزی تعلیم عام کرنے کے لئے قائم کیا لیکن ان کے انگریزوں کے طرفدار اور اسلامی عقائد اور مذہب اسلام کی تعلیمات کی عام متفقہ رایوں سے ہٹ کر تعبیر و تشریح کی وجہ سے یہ کالج بھی متنازع رہا، انگریزی تعلیم جو کہ ایک طرف مغربی تہذیب کے فروغ کا موئثر ترین ذریعہ تھی تو دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کے حصول اور بہتر معاشی مستقبل کا وسیلہ بھی، اس تعلیم کے حوالے سے مسلمان عجیب طرح سے حیران و پریشان دوراہے پر کھڑے تھے، ایک طرف اپنے قدیم اقدار و روایات اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کی فکر تھی، دوسری طرف ذریعۂ معاش کا مسئلہ تھا، انیسویں صدی کے نصف آخر میں سماجی اور تہذیبی سطح پر اسی کش مکش اور تصادم کی اسی صورت حال میں بہت سے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم و تہذیب کو بالآخر قبول کر ہی لیا۔

یہی زمانہ وہ ہے جب ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں پر ایک ہیبت ناک اور روح فرسا قیامت گذر چکی تھی، سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون کے قید خانے میں بھیجا جا چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی انگریزوں نے مسلمانوں کے دماغوں سے حکومت کی بو باس ختم کرنے کے لیے دہلی کے چوراہوں پر ان گنت سولیاں کھڑی کر دیں اور بے شمار ممتاز اور سر برآوردہ مسلمانوں کو گرفتار کر کے ہزاروں تماشائیوں کے ہجوم کے سامنے پھانسیاں دے دیں۔ تمام مسلمانوں کو بزور شمشیر دہلی شہر سے نکال دیا گیا اور اس وقت تک ان کو دہلی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی جب تک ان کی بے چارگی، بے کسی، مظلومیت اپنی انتہا کو نہیں پہنچ گئی۔ بے تحاشہ گرفتاریاں اور وحشیانہ طور پر پھانسیادے کر مسلمانوں کو یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا گیا کہ ہندوستان میں اب ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ انگریز قوم انتہائی جاہ جلال، رعب داب، نادر شاہی، ہیبت اور ہٹلرانہ خون خاریوں کے ساتھ عامر

مطلق بن کر دہلی پر قابض ہو چکی تھی۔ دہلی کے کسی مسلم محلہ میں تنہا ایک انگریز گذر جاتا تو مسلمانوں کو ہزاروں کا مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا اور گھروں میں چپ جاتا جیسے کوئی آدم خور درندہ انسانوں کی آبادی میں گھس آیا ہو۔ برسوں مسلمانوں کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کسی نا کردہ جرم میں گرفتار کر کے پھانسی پر نہ لٹکا دیا جائے۔ یہی ماحول اور یہی حالات تھے جب مسلمانوں کا مادی وجود انگریزوں کی چمچماتی ہوئی تلواروں کی سائے میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا کہ اس کی دینی، مذہبی اور تہذیبی وجود کو مٹانے کا لندن پارلیمنٹ نے فیصلہ کر دیا اور طے کیا گیا کہ پورے ہندوستان کو بجبر واکراہ عیسائی بنا دیا جائے۔

لندن پارلیمنٹ کے اس فیصلے کے بعد مسلمانوں کے مذہبی و تہذیبی وجود کو فنا کر دینے کے لئے پادریوں کا ایک لشکر جرار ہندوستان بھیج دیا گیا اور اس نے سندھ اور ملتان سے لے کر آسام و بنگال کی سرحد تک مسلمانوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور اس طرح کے مسلمانوں کے لیے کوئی جائے فرار نہیں رہ گئی، چونکہ مسلمانوں کا نیر اقبال غروب ہو چکا تھا اور اس کے دوبارہ طلوع ہونے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے برادران وطن کا ایک طبقہ آریہ سماج بھی مسلمانوں کے منہ آنے لگا۔ عیسائی مناظرین کی ہرزہ سرائی کے ساتھ آریہ سماجی اسلام اور مسلمانوں پر سخت ترین اور دل آزار اعتراضات والزامات عائد کر کے مسلمانوں کی مرعوبیت و بے چارگی کے احساس میں اضافہ کرنے کے لیے میدان میں آگئے۔ اس طرح عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی دوطرفہ فوج نے مسلمانوں کے تہذیبی وجود کو اپنے نرغے میں لے لیا۔

اس وقت ملک کے جو حالات تھے اور خاص کر مسلمانوں کے اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی انحطاط کا جو عالم تھا، اسے مولانا عبدالماجد دریابادی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہاں اس کا ذکر بہت مفید ہوگا تا کہ ہم اس وقت کی صحیح صورت حال سے باخبر ہوں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں، ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پورے طور پر کسا ہوا ہے، مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے، اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے ہیں، ثروت و خوش حالی کا اول تو وجود ہی عنقا ہو رہا ہے اور پھر جو کچھ ہے وہ بھی عیاشیوں، نفس پرستوں کے لیے وقف ہے، تعلیم و تربیت، اتفاق اتحاد، نظم و انتظام، ضبط و خودداری، ہمت و بلند نظری، صداقت و حق پرستی، قناعت و ایثار میں سے کوئی ایک شئے موجود نہیں۔ عقائد میں تنزل آچکا ہے۔ ایمان کی مضبوطی ایک افسانہ پارینہ رہ گئی ہے، حرص و طمع، مکر و نفاق، خود غرضی و غداری، نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے، اس کے مقابلے میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔۔۔۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا، علم و فضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے، تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے، تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں مشتر کہ خاندان کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزا سے قطع تعلق کر لیا جائے، شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں، انگریزی حکومت کی برکات کا وعظ کہا جائے اور اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو نقصان پہنچا کر انگریزی دربار میں رسوخ حاصل کیا جائے، عقل و دانش کا یہ مفہوم قرار پایا کہ ہر انگریزی مصنف کے ہر قول پر بے چوں چرا ایمان لے آیا جائے، اور اپنے علوم و فنون اور اپنے شعائر و رسوم، اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دل ربا پر نثار کر دیا جائے، اور دو زبان اس لئے حقیر نظر آنے لگی کہ یہ سرکار کی زبان نہیں، پردہ کی رسم اس لیے غلامی نسواں کے مرادف نظر آنے لگی کہ

> انگریزی خواتین کا شعار بے حجابی کا ہے، تعدد ازواج کا دستور اس لیے شرمناک نظر آنے لگا کہ انگریز قوم ایک سے زائد منکوحہ بیوی رکھنے کے ضابطہ سے ناآشنا ہے، عرش کے انکار پر سب سے قوی دلیل یہ قائم ہوئی کہ انگریزی ہیئت جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، شیاطین، جنات اور ملائکہ کے وجود کے ابطال کے لیے یہ دلیل قطعی نکلی کہ انگریزی سائنس کسی آلہ کی مدد سے ان کا مشاہدہ نہ کر سکی، معجزات کا دعوی اس لیے قابل مضحکہ ٹھہرا کہ مل اور اسپنسر ان کے قائل نہیں، نبوت والوہیت کے عقائد میں اس لیے رخنے پڑنے لگے کہ ہکسلے اور ہیوم متشکک رہے ہیں۔[1]

مذکورہ بالا مضمون سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے حالات اور ان کی تہذیبی و اخلاقی صورت حال کیا تھی، مذہبی اور اخلاقی ہر اعتبار سے مسلمان پستی کی طرف جا رہے تھے اور انہیں اس کا احساس بھی نہیں تھا، تہذیب دراصل جذبہ، احساس اور فکر کے مجموعے کا نام ہے، جس سماج یا قوم میں مندرجہ بالا تینوں چیزیں نہیں پائی جاتی ہیں اس کا شمار مہذب قوم میں نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ جذبہ، احساس اور فکر زندہ قوم کی علامت ہے جہاں اس کا فقدان ہوتا ہے وہ سماج یا قوم پسماندگی اور ابتری کا شکار ہو جاتا ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو سماج حالات اور وقت سے جتنا مطابقت رکھے گا اور اعلی اقدار سے جس قدر ہم آہنگ ہوگا اسی قدر وہ زیادہ مہذب ہوگا، مہذب قوم کی ایک خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ معروضی نقطۂ نظر سے خیر و شر کا فیصلہ نہیں کرتی بلکہ اقدار حیات کو اس کی اصلی شکل میں معروضی طور پر دیکھتی ہے۔ چیزوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنا اور حقیقت کو جوں کا توں پہچاننا مہذب اور ترقی یافتہ قوم کی نشانی ہے، اگر درج بالا تناظر میں دیکھیں تو ہندوستان کی انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تہذیبی و اخلاقی طور پر کافی افسوسناک تھا جس کے رد عمل میں متعدد تحریکیں وجود میں ائیں۔

---

[1] رسالہ اردو، عبدالماجد دریابادی، ماہ اپریل ۱۹۲۳، بحوالہ طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی، ص ۹۶-۹۷

ہندوستانی باشندے تہذیبی وسماجی اعتبار سے تاریخ کے اس تبدیلی کے دور سے گزر رہے تھے اور ملک میں سیاست کی بدلتی ہوئی صورت حال کو بھی محسوس کر رہے تھے، البرٹ بل کی ناکامی اور انگریزوں کی طرف سے کئے جانے والے طرح طرح کے مظالم کی وجہ سے باشندگان ہند میں اپنی غلامی کی ذلت اور بے کسی کا شدت سے احساس ابھرا، تاریخ کے اس دور تک پہنچ کر ان میں قومی وسیاسی شعور بیدار ہونے لگا اور ایک نئی سیاسی زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے اور نیم سیاسی قسم کی مقامی اور علاقائی تنظیمیں وجود میں آنے لگیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی ان متفرق اور چھوٹی چھوٹی تنظیموں کو ایک جگہ منظم کرنے کے لئے کلکتہ میں ایک نیشنل کانفرنس پہلے ہی منعقد ہو چکی تھی اب مختلف قومی وسیاسی مسائل نے ان تنظیموں اور جماعتوں میں سرعت وحرکت پیدا کر دیا اور اس نتیجہ میں ایک منظم قومی تحریک نے بھرپور ترقی کی اور دسمبر ۱۸۸۵ء میں ہندوستانیوں کی ایک سیاسی جماعت 'انڈین نیشنل کانگریس' کا جنم ہوا جس کے پرچم تلے ہندوستانیوں نے غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک طویل بہادرانہ جد وجہد کا منظم آغاز کیا، ہندوستانیوں میں غیر ملکی اقتدار سے مقابلہ کرنے اور ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ موجزن ہو گیا اور بالآخر ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہو گیا، دراصل اس جذبہ کے پیچھے خاص بات یہ تھی کہ ہندوستانی عوام کے مفادات اور ہندوستان میں رہنے والے انگریز حکمرانوں کے مفادات میں زبردست ٹکراؤ تھا، انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کیا تھا اس لئے وہ اپنے مفادات کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہی اس ملک پر حکومت کر رہے تھے اور ہندوستان کی تعمیر وترقی اور فلاح وبہبود کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔

اس دور کے ادب وصحافت اور تاریخی دستاویز کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس صدی کے سیاسی وسماجی حالات انتہائی کش مکش کے تھے، صدی کے نصف اول میں انگریزوں کا مکمل طور پر سیاسی اقتدار قائم نہیں ہوا تھا اور انگریزی تہذیب ومعاشرت کے حملے بھی تیز نہیں تھے، اس لئے ہندوستانی باشندے اپنی تہذیب اور اقدار وروایات کے تعلق سے بڑی حد تک مطمئن تھے اور وہ ان میں کسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، یہاں کے

باشندوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی زوال دراصل سماجی اور تہذیبی زوال کا پیش خیمہ ہے، انیسویں صدی کے وسط تک مغربی فلسفہ اور سائنس کے اثرات کافی حد تک پھیل چکے تھے، مذہب اور سائنس کی باہمی کش مکش شروع ہو چکی تھی، یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کی جائے یا پھر ان میں سے کسی کو برتر تسلیم کر یا جائے، انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے حالات بالکل بدل گئے، انگریز پوری طرح ہندوستانی سیاست اور اقتدار پر قابض ہو گئے اور انگریزی کلچر ملک میں تیزی سے پر پھیلانے لگا۔ انقلاب کے بعد کے حالات نے مادی حیثیت سے مغرب کی برتری کا فیصلہ کر دیا، ہندوستانیوں کے لئے اس کش مکش کے دور میں یہ فیصل کن گھڑی آ گئی کہ اس بدلتے ہوئے حالات میں اپنے قدیم اقدار و روایات کی حفاظت کریں یا پھر نئے نظام اور نئی وضع کو قبول کریں، ان ہی حالات میں انقلاب کے بیس سالوں کے بعد اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا جس نے مشرقی اقدار و روایات کی پاسداری اور مغربی تہذیب و تمدن کی کمزوریوں کو اجاگر کر کے ملک کے عوام کو صحیح فیصلہ لینے میں انقلابی کردار ادا کیا۔

اودھ پنچ جس دور میں وجود میں آیا وہ ایک کش مکش اور مختلف رجحانات کے تصادم کا دور تھا۔ ما قبل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس دور میں تہذیبی، سیاسی اور سماجی سطح پر کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، اس دور کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

> ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور مختلف رجحانات کے تصادم کا دور تھا، تاہم اس دور میں مغربی تہذیب کو اپنانے کی روش ہی سب سے زیادہ نمایاں تھی، صدیوں کے منجمد معاشرے میں یکا یک ایک ایسا اندرونی تموج پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کا باشعور طبقہ اندھا دھند مغربی افکار کے مطالعہ کے ساتھ مغربی تہذیب کا مقلد بھی ہونے لگا تھا، جذباتیت کی رو اپنے عروج پر تھی، ایک طرف وہ لوگ تھے جو کسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے دوسری طرف وہ لوگ

> تھے جو دینی روایت اور تہذیب کا دامن چھوڑنے پر آمادہ تھے اور ان دونوں طبقوں کا انداز کسی نہ کسی حد تک جذباتی تھا، اودھ پنچ کے معرض وجود میں آنے کے لئے یہ مناسب ترین وقت تھا، کیوں کہ ان دونوں طبقوں کے جذباتی رد عمل کو ہدف طنز بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی تاکہ ان کے اعمال میں کسی نہ کسی حد تک توازن پیدا ہو سکے، چنانچہ اودھ پنچ کو یہ تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے جہاں مغرب کی اندھا دھند تقلید کو ہدف طنز بنایا وہاں اپنی معاشرت کے زوال پذیر عناصر کا مضحکہ بھی اڑایا اور یوں فضا کو اعتدال پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔[1]

اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کے جائزہ کے ساتھ ساتھ ہمیں اس دور کی صحافت پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے، اس دور میں اردو صحافت میں متعدد رجحانات کے حامل اخبارات نکلے لیکن اکثریت ان اخبارات کی رہی جن کا رجحان سیاسی و سماجی موضوعات کی طرف رہا، انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اردو صحافت اپنے دوسرے دور میں داخل ہوئی اور یہاں سے ایک نئے سفر کا از سر نو آغاز ہوا، دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، کان پور، آگرہ، پٹنہ اور دیگر شہروں سے اردو صحافت نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا، لیکن یہ نئے اخبارات حالیہ واقعات کی وجہ سے خوف زدہ، محتاط اور سہمے ہوئے تھے، ملک کے سیاسی مسائل اور حکومتی معاملات پر اظہار رائے میں یوں تو بہ ظاہر کوئی روک ٹوک نہیں تھی لیکن حال ہی میں گزرے ہوئے حادثات اور خوں چکا مظالم کے واقعات نے اخبارات کو گویا گونگا کر دیا تھا۔ بعض اخبارات نے تو خوشامدانہ لہجہ اختیار کر لیا اور بعض نے ان مسائل پر لکھنے اور اظہار کرنے کے بجائے خاموشی ہی میں بہتری سمجھا، یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں اخبارات کے اجرا کی رفتار تو تیز رہی لیکن ان کی ترقی کی رفتار سست رہی، قارئین کا حلقہ وسیع تر نہیں ہو پایا، اس کے برعکس پنجاب جو کہ لارنس کی دانشمندی کی وجہ سے انقلاب کے اثرات سے محفوظ رہا، وہاں اردو اخبارات کی ترویج و اشاعت خوب سے خوب تر ہوتی گئی اور یہاں سے بہت سے معیاری اور کثیر الاشاعت اخبارات

---

[1] وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص ۱۰۸

منظر عام پر آئے، کچھ دنوں کے بعد اردو اخبارات میں پھر سے خود اعتمادی پیدا ہوئی اور خوف و دہشت کا ماحول بتدریج رخصت ہوا اور اردو صحافت نے اہم سیاسی و سماجی مسائل پر عوام کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرنا شروع کر دیا اور نہایت جرأت و دانشمندی کے ساتھ ملکی و حکومتی مسائل پر لکھنا اور رائے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

اس دور میں نکلنے والے ہندوستانی اخبارات کے مزاج کی تفہیم اور اس کے رخ کو متعین کرنے کے لئے اگر کوئی بنیادی تقسیم کی جائے تو اس دور کے اخبارات دو طرح کے نظر آتے ہیں، ایک تو وہ اخبارات ہیں جو اینگلو انڈین اخبارات تھے، یہ اخبارات انگریزی حکومت اور برطانوی اقتدار کی بقا کے لیے مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے مالک اور مدیر انگریز ہی ہوتے تھے، انگریزی حکومت کے زبردست حامی اور ہندوستانیوں کے خلاف زہر افشانی کرنے والے ان اخبارت کو پوری آزادی اور حکومتی سرپرستی حاصل تھی، ان اخبارات میں پیش پیش رہنے والوں میں پائنیر الہ آباد، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین کلکتہ اور انگلش مین وغیرہ تھے، دوسری طرف ہندوستانیوں کے اخبارات تھے جو اردو، بنگالی، انگریزی اور دوسری مقامی زبانوں میں شائع ہوتے تھے، ان اخبارات کو حکومت کے عہدیداران شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان پر کڑی نظر رکھتے تھے، ان اخباروں کا مطالعہ اس مقصد کے لئے کیا جاتا تھا کہ کہیں ان میں حکومت مخالف نظریات اور خبروں کی اشاعت تو نہیں ہو رہی ہے، حکومت کے نمائندوں اور بہی خواہوں کا ان اخبارات کے مطالعہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا تھا کہ ان میں دی گئی مفید رایوں پر عمل کر کے ملک اور یہاں کے باشندوں کے لئے کچھ اچھا کیا جا سکے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی قانونی گرفت کا پتہ چل سکے جس کی بنا د پر اخبار پر پابندی لگائی جا سکے۔

اس دور کی صحافت کے معیار اور رجحان کے بارے میں ڈاکٹر طاہر مسعود نے لکھا ہے:

اردو صحافت کے معیار اور مسائل کو سمیٹتے ہوئے مختصراً کہا جا سکتا ہے اس دور کا اختصاص یہ ہے کہ ہفت روزہ اخبارات نے ترقی کر کے روز ناموں کا روپ دھار لیا، متعدد رجحان ساز اخبارات نکلے، اخباروں کی عمریں طویل ہوئیں، جدید اخبار نویسی کی داغ بیل پڑی، اخبارات کی ظاہری شکل و صورت اور خد و خال میں تبدیلیاں آئیں، مشتملات میں تنوع پیدا ہوا، اداریہ نویسی کا باقاعدہ رواج پڑا انگریزی تعلیم کے زیر اثر سائنسی، تعلیمی اور سیاسی موضوعات میں پڑھنے والوں کی دل چسپی پیدا ہوئی تو اخبارات نے مطلوبہ مواد کی فراہمی میں دلچسپی دکھائی اور اخباری صفحات سنجیدہ، معلوماتی اور دلچسپ مضامین سے لبریز نظر آنے لگے، اس سے اہم بات یہ کہ صدی کے آخر تک اخبارات کی زبان صاف ہو گئی، عام فہم زبان کا استعمال مقبول ہوا، عبارتوں کی پیچیدگی دور ہو گئی، علمی اور فکری مباحث میں سنجیدہ، مدلل اور تجزیاتی اسلوب اختیار کیا جانے لگا۔[1]

ان حالات اور پس منظر میں اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا، یہی وہ دور ہے جو اردو اخبارات کی ترقی کا صحیح معنوں میں دور ہے۔ ۱۸۷۰ء کے بعد ہی اردو اخبارات کی ترقی کا صحیح دور شروع ہوا اور اس دور میں پیش آنے والے ملکی اور غیر ملکی حالات نے اخبارات کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۷۷ء میں ترکی اور روس کی جنگ نے اخبار بینی کے ذوق کو مزید عام کر دیا۔ اس جنگ کے دوران ہندوستانیوں کی دلچسپی اور تازہ ترین جنگی صورت حال سے آگاہی کی طلب نے اردو میں روز نامہ صحافت کو فروغ دیا، اسی بیچ برعظیم کے حالات نے نئی کروٹ لی اور نئے انداز کے مقبول اخبارات منظر عام پر آ گئے، ان جدید مقبول اخبارات میں اودھ پنچ کو بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے جس نے اپنے اجرا کے اول روز سے ہی بڑی بے باکی اور کمال دانشمندی سے طنز و مزاح کے پیرایہ میں برطانوی حکمرانوں کی ملک دشمن

[1] ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ۷۳۴

پالیسیوں کا پردہ فاش کیا، نو آبادیاتی ہندوستان میں برطانوی سامراج کے غلط طرز حکومت پر تنقید کیا اور مختلف زاویوں سے ناقابل فراموش انقلابی کارنامہ انجام دیا۔

اودھ پنچ کی صحافت میں دو باتیں بڑی تابانی رکھتی ہیں، اول اس کا تہذیبی اور سیاسی مسلک، دوم اس کا پیش کرنے کا ڈھنگ اور دیدہ ریزی، اس کی لکھائی چھپائی اس کے کارٹونوں کی توضیحات مختلف واقعات پر تبصروں میں تنوع نثر کے ساتھ ساتھ نظم کے لیے اس میں گنجائش ملکی واقعات کے ہمراہ بیرون ملک مثلا روس افغانستان ترکی وغیرہ کی سیاسی اور جنگی خبروں پر طنزیہ شذرے مقامی مفکرین اور مصلحین کے خیالات و افکار پر مدلل مباحث جس میں بڑی عاقبت بینی، وسعت معلومات اور تعمیری نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔ ان باتوں کی شہادت کے لیے اس اخبار کے سینکڑوں شماروں سے ہزاروں شذرات مضامین نظموں اور کارٹونوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

باب سوم

نوآبادیاتی سیاسی و معاشی پالیسی اور اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ

- انگریزوں سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی حالت
- مسلم حکمرانوں کے دور میں ترقیاتی اقدامات
- برطانوی حکمرانوں کی سیاسی پالیسی اور حکمت عملی
- ہندوستانی معیشت پر برطانوی اثرات
- برطانوی سیاسی و معاشی پالیسی کے خلاف اودھ پنچ کا مزاحمتی کردار

نوآبادیاتی سیاسی و معاشی پالیسی اور اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ

انگریزوں سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی حالت

ہندوستان عہد قدیم سے ترقی یافتہ، متمدن اور پختہ معیشت کا حامل ملک تھا، گپت عہد میں بھی ہندوستان شان وشوکت کے لحاظ سے اپنے عروج پر تھا، اس دور کو بجا طور پر سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔ سن عیسوی کے پہلے ہزار سال کے دوران بھی ہندوستان بڑے پیمانے پر غیر ملکوں سے تجارت کرتا تھا، کالی مرچ اور گرم مسالے بر آمد کیے جاتے تھے، ہمارا ملک سوتی کپڑے کی صنعت میں سب سے آگے تھا، اس کی غیر ملکی بازاروں میں بڑی مانگ تھی، ریشمی کپڑا بھی بنایا جاتا تھا، اس صنعت میں اس کا شمار چین کے بعد دوسرے نمبر پر ہوتا تھا، ہمیں بہت سے سمندری فوائد حاصل تھے، چونکہ سمندر ہمارے لیے کھلے ہوئے تھے، ہم مشرقی جزیروں سے مختلف جگہوں پر مال لے جا سکتے تھے اور تجارتی مال لے جانے والوں کی طرح خوب نفع کما سکتے تھے۔

ہماری جہاز سازی کی صنعت کافی ترقی یافتہ تھی اور ہم نے جنگ میں کام آنے والی بہت سی مشینوں کو ترقی دی تھی، دواسازی اور دھات سازی میں بھی ہماری حالت کافی اچھی تھی، ہم فولاد بنانا جانتے تھے اور ہمارا لوہا اور فولاد دنیا کی اقتصادی منڈیوں میں بہت قیمتی اور اعلی معیار کا سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ایک اور اہم قدم رنگ سازی کی ترقی کے لئے اٹھایا گیا جس کی بنیاد نیل تھا۔ نیل کی دریافت نے ہمارے کپڑے کی صنعت اور غیر ملکی تجارت کو مزید ترقی دی۔

یہ دستکاریاں شہروں میں پھیلیں، شہروں میں یا تو انتظامیہ کے مرکز ہوتے یا عدالتیں ہوتیں، راجدھانیاں ہوتیں یا مقدس مقامات ہوتے تھے، بہت سے شہر اہم تجارتی راستوں جیسے بڑے دریاؤں اور سمندروں کے کناروں یا اہم سڑکوں پر آباد تھے، شہروں کی زندگی دیہاتوں کی زندگی سے مختلف تھی، شہروں میں بہت سی دستکاریاں اور مختلف قسم کی تجارتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف دیہات شہروں سے الگ تھلگ تھے اور کم و بیش اپنی ضروریات کو پورا

کرنے میں خود کفیل تھے،وہ اپنی آبادی کی ضروریات کے لئے پیداوار کرتے تھے اور باہر کی دنیا سے چیزوں کا تبادلہ بہت کم کرتے تھے، گاؤں میں مزدوروں کی سماجی تقسیم تھی، کسان کھیتی باڑی کرتے تھے اور اناج اگاتے تھے، پارچہ باف کپڑے تیار کرتا تھا، بڑھئی کسان کے لئے اوزار بناتا تھا، اسی طرح دوسرے لوگ تھے جیسے کمہار، نائی، سنار، موچی، لوہار وغیرہ سب اپنے اپنے کام گاؤں والوں کے لئے کرتے تھے اور گاؤں کی پیداوار میں اپنا روایتی حصہ حاصل کرتے تھے، گاؤں اپنی ضروریات کی تقریباً تمام تر چیزیں تیار کر لیتے تھے اور صرف چند ہی چیزوں کے لئے باہر کی دنیا پر انحصار کرتے تھے، گاؤں میں اقتصادی خود کفالت اور مزدوروں کی سماجی تقسیم دیہی علاقوں کی سماجی تنظیموں کی اہم خصوصیات تھیں۔

انگریزوں کی آمد کے وقت ہندوستان کا طریقۂ پیداوار اور صنعتی و تجارتی ادارے دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں فخریہ پیش کیے جا سکتے تھے۔ ہندوستانی ایک ترقی یافتہ صنعت کار قوم تھے، یہاں کی برآمدی تجارت یورپ اور دوسرے ملکوں کی منڈیوں تک پھیلی ہوئی تھی، یہاں کا بینکاری کا نظام بھی ترقی یافتہ تھا، اس ملک کے کاروباری اور مالی اداروں کی ہنڈیاں وسطی ایشیا کے بیشتر ملکوں میں تسلیم کی جاتی تھیں، مال فروخت کرنے کے التزامات بھی معقول تھے، ٹھیکیدار اور دلال جیسے بیچ کے لوگوں کا طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا، جہاز سازی کی صنعت اطمینان بخش طریقے سے ترقی کر رہی تھی، یہاں تک کہ ایک ہندوستانی فرم نے برطانوی امیر البحر کے لئے ایک فلیگ شپ تیار کیا تھا جسے نیپولین کے ساتھ جنگوں میں استعمال کیا گیا تھا۔ ہندوستانی کاریگروں کی دستکاری اتنی اچھی تھی کہ یہاں کے صنعت کار اپنی چیزوں کو مغربی ملکوں کی منڈیوں میں وہاں کی بنی اعلیٰ صنعتی چیزوں کے مقابلے میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی مال برطانیہ کی منڈیوں میں چھایا ہوا تھا، حالانکہ وہاں مشینوں کا استعمال ہونے لگا تھا، ہمارے پورے ملک میں بڑی تعداد میں صنعتی و تجارتی مرکز موجود تھے۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال کے شہر مرشد آباد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہاں جائدادوں کے مالکوں کی تعداد لندن شہر کی جائدادوں کے مالکوں کی

تعداد سے زیادہ تھی، مشرقی بنگال میں ڈھاکہ اپنی ململ کے لیے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ اس زمانے میں ہندوستانی معیشت کافی ترقی یافتہ اور منظم تھی، بہر حال برطانوی اقتصادی پالیسی کی وجہ سے ہماری معیشت اس درجے تک قائم نہیں رہ سکی اور بربادی کے دہانے پر پہنچ گئی۔

انگریزی اقتدار سے پہلے ہندوستان ایک دولت مند اور سرمایہ دار ملک تھا جو کہ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہیں تھا اور یہ دولت مندی اور ترقی اس ملک میں کئی صدیوں سے چلتی آرہی تھی، جس کی مختلف ممالک میں شہرت تھی اور جس کی وجہ سے دنیا کی کچھ قوموں اور ملکوں کی لالچی نگاہیں ہمیشہ اس کی طرف اٹھتی رہتی تھیں، اور کیوں نہ اٹھتیں کیوں کہ قدرت کی فیاضیوں نے اس کی سرزمین میں ایسے اسباب اور سامان مہیا کر دیے تھے جن کی وجہ سے دولت مندی، سرمایہ داری، خوش حالی اور فارغ البالی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں نے ہمیشہ ملک کی دولت اور ثروت میں اضافہ اور زیادتی کی پالیسی جاری رکھی تھیں۔ اگر کوئی راجہ یا بادشاہ ظالم ہوتا تو بھی اس کا حاصل کیا ہوا مال گھوم پھیر کر یہاں ہی رہتا تھا۔ ڈاکٹر واکز کہتا ہے:

> ہندوستان کی دولت، تجارت اور خوش حالی نے سکندر اعظم کے دل پر گہرا اثر کیا، اور جب وہ ایران سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے اپنی فوج کو کہا کہ اب تم اس سنہرے ہندوستان کی طرف کوچ کر رہے ہو جہاں نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ اور جو کچھ تم نے ایران میں دیکھا ہے اس کا ہندوستان کی دولت کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔[1]

میجر باسو لکھتا ہے:

[1] رسالہ تلک، جلد اول، بحوالہ برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ حسین احمد مدنی، ص، ۲۱

رعایا کی خوش حالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، دولت مندی اور آرام وچین کا جو نقشہ شاہ جہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلا شبہ بے مثل، بے نظیر تھا۔[1]

میجر باسو کے حوالہ سے سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:

بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار بینک آف انگلینڈ کے برابر پھیلا ہوا تھا جو کہ انگلستان کا سب سے بڑا بنک ہے اور بقول کپتان الیگزنڈر ہملٹن سورت کے ایک تاجر مسمی بہ عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمایہ کے برابر تھا۔ انہیں وجوہ سے ہندوستان کی دولت کو لارڈ کلایو نے لازوال دولت کہا تھا۔[2]

نکوموڈی کانتی (مشہور انگریز مؤرخ) اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:

گنگا کے کنارے بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت شہر آباد ہیں جن کے ارد گرد دل خوش کرنے والے باغیچے لگے ہوئے ہیں۔ شہروں کے باہر نہایت خوبصورت کھیت لہرا رہے ہیں۔ یہاں گویا سونے کے دریا بہہ رہے ہیں۔ موتی اور جواہرات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔[3]

علم المعیشت کا مصنف لکھتا ہے:

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت کے افسانے اقالیم دنیا میں مشہور تھے اور کہتے ہیں کہ یہی جنس تھی جس نے ایشیا اور یورپ کی جنگجو اور عالی ہمت اقوام کو اس سر زمین کی طرف

---

[1] بحوالہ، سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص،۱۶

[2] بحوالہ، ایضا، ص،۱۶

[3] حسین احمد مدنی، بحوالہ برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۲۳

> کشاں کشاں کھینچا تھا۔ یونانی، عرب، ترک، تاتار آئے اور بے شمار زر و جواہر اور دیگر بیش بہا سامان لے گئے۔ اکبر اعظم نے ہندوستان کو اپنا گھر قرار دیا اور پھر ہندوستان کی دولت ہندوستان ہی میں رہی۔ اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے آگرہ اور دہلی کے خزانوں کی پڑتال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ چھ ماہ تک کئی ہزار نفوس چاندی کے سکے تولنے میں مصروف رہے اور معلوم ہوا کہ خزانۂ شاہی کا صرف ایک کونہ تولا جا سکا ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کی نوبت نہیں آئی اور اورنگ زیب فوراً اس مہم کو بند کرا کے دکن کی مہم پر چلا گیا۔[1]

مذکورہ بالا شہادتیں اور ان جیسی بہت سی شہادتیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے بہت زیادہ دولت مندار سرمایہ دار ملک تھا، سونا، چاندی، جواہرات اور قیمتی موتی جس قدر اس ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس پائے جاتے تھے، دوسرے ملک اس سے تقریباً خالی تھے۔ بعض تاریخی تحریریں بتاتی ہیں کہ ۱۷۶۲ء میں صرافوں کی دکانوں پر شہروں میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ دوسری قومیں ہندوستان کا قصد کر کے یہاں آتی رہیں، یورپین اقوام بھی اسی بناء پر سمندری راستوں سے یہاں بار بار آتے رہے اور سب ہی نے یہاں سے بہت زیادہ مال و متاع حاصل کیا۔ یہاں کی بسنے والی رعایا نہایت خوش حال اور فارغ البال تھی، نہایت آرام اور چین سے زندگی بسر کرتی تھی۔

مقریزی کتاب الخطط جلد ثانی صفحہ ۷۴ا پر لکھتا ہے:

> شہنشاہ محمد تغلق مرحوم سالانہ دو لاکھ جوڑے کپڑوں کے رعایا میں تقسیم کرتا تھا۔ دس ہزار گھوڑے علاوہ فوجیوں کے ہر سال رعایا میں تقسیم کرتا تھا۔ شہر دہلی میں ستر شفاخانے عام

---

[1] علم المعیشت، ص ۲۵۷، بحوالہ برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ حسین احمد مدنی، ص ۲۵

رعایا کے واسطے جاری تھے۔ دو ہزار مسافر خانے اور رباطیں مسافروں اور غریب الوطنوں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ ایک ہزار مدرسے تھے۔ [1]

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی زرعی حالت

ہندوستان کو قدرت نے نہایت زیادہ زرخیز ملک بنایا ہے، اس میں ہر قسم کے اناجوں کی کاشت اور پیداوار کے طرح طرح کے ذرائع مہیا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے زمانۂ قدیم سے یہاں بافراط غلہ پیدا ہوتا رہتا تھا اور یہاں کے باشندے ہمیشہ خوش حال اور فارغ البال رہتے تھے، اس قدر پیداوار ہوتی تھی کہ اس زمانہ کی ارزانی سن کر نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات گزشتہ تاریخی تصریحات کو آج کے زمانہ کے لوگ جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں، ہم پہلے مسٹر تھارن ٹن کا قول نقل کر آئے ہیں وہ کہتا ہے کہ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی، اسی طرح سر تھامس منرو کی ہندوستانیوں کے طریقہ کاشتکاری اور ان کی اعلیٰ استعداد کی پرزور تعریف کا ذکر گزر چکا ہے۔

بہر حال انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں غلہ جات کی پیداوار بہت زیادہ تھی اور بہت ہی ارزاں اور سستے دام سے تمام اناجوں کی اقسام اور ضروریات زندگی فروخت ہوتی تھیں، جس کی وجہ سے تمام باشندگان ہند نہایت خوش حال اور فارغ البال راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عموماً ان کو اناج اور خورد و نوش کی کمی ستاتی نہ تھی، بہر حال ہندوستان انگریزی اقتدار سے پہلے نہایت ارزاں اور سستائی والا ملک تھا، اس میں اناج اور تمام ضروریات زندگی بالخصوص خورد و نوش کی اشیاء کی نہایت زیادہ کثرت اور فروانی تھی۔ یہاں کے باشندے نہایت چین اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔

---

[1] بحوالہ حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۲۷

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی صنعتی وتجارتی حالت

ہندوستان قدیم زمانہ سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا،اس میں بکثرت ہر جگہ صنعتی کارخانے قائم تھے، ہر صنعت کے اعلی درجہ کے ماہر دست کار پائے جاتے تھے جو کہ یہاں کی خام پیداوار سے نہایت نفیس ایسی عمدہ اشیاء تیار کرتے تھے جن کی اطراف عالم میں بہت زیادہ مانگ اور قبولیت ہوتی تھی۔ خشکی اور تری کے راستوں سے ان کی تجارت ایشیاء، یورپ، افریقہ اور دیگر ممالک میں ہوتی تھی اور ہر سال کروڑوں اشرفیاں ہندوستان میں آتی تھیں، جن کی وجہ سے کاروباری لوگ نہایت آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے، یہاں بے کاری کا نام ونشان تک نہ تھا، فاقہ مستی اور غربت وافلاس کا یہاں کے باشندوں پر سایہ بھی نہیں پڑتا تھا، ہر طرف آرام اور چین کا غلغلہ تھا، یہاں کے لوگ فارغ البالی اور خوش حالی میں زندگی گزارتے تھے۔ چنانچہ مسٹر تھارن ٹن اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:

> یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جب بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانہ میں درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور دولت کا مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت وحرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن ورات اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لائق کاریگر اور صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے جس کی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک ونفیس وخوبصورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔[1]

---

[1] رسالہ مظلوم کسان، بحوالہ برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ حسین احمد مدنی، ص، ۲۲

متعصب انگریز مصنفین اپنے اغراض ملعونہ کے تحت ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں کہ زمانۂ قدیم سے ہندوستان صرف زراعتی ملک رہا ہے، مگر ڈاکٹر فرانسس بکانن فرانس بوجانن جن کو لارڈ ویلزلی نے ۱۸۰۰ء میں جنوبی ہند کی معاشیات کے معائنہ کے لیے مقرر کیا تھا، تمام ملک میں دورہ کر کے بچشم خود معائنہ کرتے ہیں اور تین ضخیم جلدوں میں رپورٹ مکمل کر کے لندن میں شائع کرتے ہیں، جس کو عام طور پر انگریز اس قدر پسند کرتے ہیں کہ کمپنی ان کو شمالی ہند کا دورہ کرنے اور وہاں کے حالات بچشم خود دیکھ کر قلم بند کرنے پر پھر مقرر کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی تکمیل بھی تین ضخیم جلدوں میں ہو کر لندن میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ کا ہندوستان کا معاشی حال نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔ اس سے نتیجۂ ذیل اخذ کر کے صاحب علم المعیشت صفحہ ۶۰۰ میں لکھتا ہے:

> یہ خیال غلط ہے کہ سدا سے ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے، یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین اور آب و ہوا کاشت کے واسطے بے حد موزوں ہے اور ہمیشہ سے ہندوستان میں کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت چلی آتی ہے، لیکن جیسا کہ یقین دلایا جاتا ہے یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ من حیث القوم ہندوستانیوں کا ذریعۂ معاش زراعت ہی زراعت رہا ہے، بلکہ جو جماعت طرح طرح کی صنعت و حرفت سے اپنی روزی کماتی تھی وہ اگر کاشت کاروں سے زیادہ نہ تھی تو بہت کم بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر بوجانن کا قول ہے کہ جامہ بانی کی صنعت و حرفت کا ہندوستان میں اس قدر رواج اور عروج تھا کہ زراعت کے مانند اس کو بھی عام ملکی پیشہ قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔ کروڑہا بندگان خدا اسی پیشہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ادنی سے لے کر اعلی سے اعلی قسم تک کی روئی اور ریشم کا کپڑا یہاں پر بکثرت تیار ہوتا اور مقامی استعمال کے علاوہ دور دراز ممالک تک جاتا تھا۔ روپہلی کلابتوں سے بٹ کر سینکڑوں قسم کے سنہرے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ ہندوستانی ململ، اطلس، کمخواب، جامہ دار، چکن، چھینٹ، نفاست و خوبی میں اب

> تک بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔ان کی پائیداری ہر کسی کو مسلم ہے۔ کپڑوں پر اس غضب کی سوزن کاری ہوتی تھی کہ پرانے کشیدے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ فرش و بستر کا کل سامان چادریں، شطرنجیاں، دریاں بکثرت تیار ہوتی تھیں۔ تانبے اور پیتل کے خوشنما ظروف، سونے چاندی کے نظر فریب زیورات، اعلیٰ درجہ کے تیل و عطر، ہر قسم کے چمڑے کے سامان، طرح طرح کے ہتھیار، لکڑی پر نقاشی اور ہاتھی دانت کا عجیب و غریب کام، اور نہایت پائیدار کاغذ، غرضیکہ ناگزیر ضروریات کی کل چیزیں اور اعلیٰ قسم کی بہت سی تعیشات ہندوستان میں اس کثرت سے ہوتی تھیں کہ دیگر ممالک یہاں سے مال منگا منگا کر استعمال کرتے تھے۔[1]

صنعت و حرفت کا ہر طرف چرچا تھا، مصنوعات کی دور و پاس شہرت تھی۔ باوجودیکہ کافی امن اور وسائل میسر نہ تھے، لوگوں کو کس قدر ذرائع معاش حاصل تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پیدائش کے دونوں اہم ذرائع یعنی زراعت اور صنعت و حرفت اپنے ہی ہاتھ میں تھے۔ اور اگر حالات مساعدت کرتے اور مزاحمتیں سد راہ نہ ہوتیں تو معاشی ترقیات میں آج اس کا کیا درجہ ہوتا۔ لیکن ہندوستان کچھ ایسے جال میں پھنسا کہ اس کی صنعت و حرفت تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑنے لگی اور حالت نزع میں گرفتا ہوگئی۔ ۷۵ فیصد آبادی کی وجہ معاش کا بوجھ زراعت پر آپڑا۔ باقی ماندہ لوگ ملازمت، معمولی صنعت و حرفت اور بے کاری میں زندگی بسر کرتے تھے۔ زراعت ہندوستان کے سر منڈھی گئی اور اکثر صنعت و حرفت برطانیہ نے ہتھیالی۔

مذکورہ بالا صنائع اور دستکاریوں کے علاوہ جہاز بنانے میں ہندوستانیوں کی مہارت نہایت بے نظیر اور کامل تھی اور اسی طرح جہاز رانی اور سمندروں کی واقفیت میں بھی وہ نہایت اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔ ہندوستان کا مال لے کر ہندوستانی

---

[1] بحوالہ، حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص،۳۶

جہاز جب لندن کی بندر گاہ میں پہنچے تو وہاں ان جہازوں کو دیکھ کر سنسنی پیدا ہو گئی، ہندوستانی جہاز کی خوبصورتی اور جہاز سازوں کی کمال کاریگری کو دیکھ کر لندن کے جہاز سازوں نے شور برپا کر دیا کہ ان کا کاروبار تباہ ہوا چاہتا ہے اور انگلستان میں تمام جہازوں کے خاندان بھوکوں مر جائیں گے۔ کمپنی بھی اس مخالفت سے مرعوب ہو گئی اور بالآخر حکم دے دیا کہ ہندوستانی جہازوں سے کام نہ لیا جائے اور وہ لندن کے بندر گاہ میں نہ آئیں، بلکہ ہندوستان کے جہاز راں بھی ملازم نہ رکھے جائیں، کیوں کہ جب وہ لندن پہنچ کر وہاں کے حالات دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ہماری وہ وقعت باقی نہیں رہتی جو بالعموم ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے اور جو حکمرانی کے واسطے لازم ہے اور واپس جا کر وہ لوگ اپنے ملک میں ہمارے قصے سناتے ہیں، اس سے بڑی خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہذا مادی، اخلاقی، کاروباری اور سیاسی ہر لحاظ سے ہندوستانی جہاز رانوں کا لندن آنا مناسب نہیں۔ اس طرح ہندوستان کی یہ صنعت بھی کس مپرسی کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔

بعض متعصب انگریزوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان ہمیشہ سے محض ایک زرعی ملک رہا ہے، حالاں کہ گزشتہ صفحات میں خود انگریزوں کی تحریروں سے اخذ کئے گئے اقتباسات سے واضح ہے کہ ہندوستان کی صنعت کس درجہ پر رہی ہے اور کس طرح اس کی قوت توڑی گئی، ہندوستان میں جہاز سازی، جس کا ذکر اوپر کیا گیا، نہایت اعلی درجہ کی حالت میں تھی، مگر انگریز اسے گوارہ نہ کر سکے۔ مسٹر ٹیلر نے لکھا ہے کہ لندن کی بندر گاہ میں جب ہندوستان کا مال ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں میں پہنچا تو اس سے وہاں کے بااختیار لوگوں میں اس قدر پریشانی پھیلی کہ دشمن کے بیڑے سے بھی نہ پھیلتی، لندن کے جہاز سازوں نے اس شور و غوغا کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور کہا کہ ہمارا کاروبار بربادی کے کنارے آ لگا ہے اور ہمارے بال بچے یقیناً فاقہ کشی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ یہاں ہر قسم کی اعلی اور ادنی صنعتوں کے بے شمار کارخانے قائم تھے جن سے ملکی ضروریات اور ذرائع ترقیات پوری ہوتی تھیں، اور تمام دنیا کے ممالک نفع

حاصل کرتے تھے۔ بیرونی ملک سے ہر سال کروڑوں اشرفیاں انہیں مصنوعات کی قیمت میں ہندوستانی تاجر حاصل کرتے تھے اور ہندوستانی باشندے کروڑوں آدمیوں کی تعداد میں یہاں کی صنائع، ہنرمندیوں اور تجارتوں کے ذریعہ آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر برطانیہ کو ہندوستانیوں کا عیش وآرام نہ بھایا اور ان کی آنکھوں میں کھٹکنے اور چبھنے والا کانٹا بن کر دن ورات بے چین کرنے لگا، مدبرین برطانیہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح ہندوستان کی صنعت اور تجارت پر چھاپہ مارا جائے اور اس کی تمام صنعتوں اور تجارتوں پر اپنا قبضہ جمایا جائے۔ تنہائیوں میں، مجمعوں میں، حکومت کے ایوانوں میں اس کے تذکرے جاری ہوئے، اسکیمیں بنائی گئیں، رزولیوشن پاس ہوئے اور نت نئے طریقے مظالم کے ایسے ایسے جاری کیے گئے جن کی انسانی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ تہذیب کا دعوی کرنے والی قوم اور انسانیت کی خدمت کا ڈھونگ رچانے والی ملت نے ہندوستان میں ایسے ایسے انسانیت کش طریقے اپنائے اور جاری کیے جن کے سامنے قدیم زمانہ کے ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر بادشاہوں اور قوموں کے وحشیانہ مظالم بھی ہیچ تھے۔

مسلم حکمرانوں کے دور میں ترقیاتی اقدامات

انگریزوں سے پہلے بہت سی قومیں مختلف ادوار میں ہندوستان میں آئیں اور مختلف حیثیتوں سے یہاں آباد ہوئیں، انہیں میں سے مسلمانوں کی ایک مغل قوم بھی تھی جسے اس ملک میں حکومت کرنے کا موقع ملا، انھوں نے اپنی حکومت میں مقام، نسل اور مذہب کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا، حکومت کا حق سب پر برابر رکھا اور اسی طرح حکومت پر سب کا حق برابر، چاہے وہ قریب کے لوگ ہوں یا دور کے، حکومت کا جو دشمن ہوتا اسے وہ دشمن سمجھتے چاہے وہ مسلمان ہوتا یا ہندو، اسی طرح وہ دوستی کا بھی حق ادا کرتے اس میں بھی انہیں نسل اور مذہب سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ان کا حوصلہ کسی ایک شخص کا حوصلہ نہیں تھا، بلکہ ان تمام لوگوں کا حوصلہ تھا جو سمجھ دار تھے اور خود غرض نہ تھے۔ پورے ہندوستان کو ایک راج اور ایک دیس بنانے کی ان کی کوشش رہی اور ترکوں کی طرح مغلوں کو بھی اتحاد کی آرزو نے کامیابی کے عروج پر پہنچا دیا اور پھر اسی نے ان کو مٹا بھی دیا۔

ہندوستان کو ایک ریاست بنانے کا جو حوصلہ مسلم حکمرانوں کو تھا، چاہے وہ ترک ہوں پٹھان یا مغل، اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس کے پیچھے انھوں نے اپنا پسینہ بھی بہایا اور خون بھی اور بہت سی عداوتیں مول لیں۔ اس سے جو فائدہ پہنچا وہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس حوصلے نے گھنے جنگلات کو کٹوا کر ایسی سڑکیں بنوائیں جو ہندوستان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک جوڑتی تھیں اور ان کے دھاگوں میں سرائے اور ڈاک چوکی، قصبے اور شہر کے دانے پروئے، اس میں تھانے اور چھاؤنیاں بنوائیں، حکومت کا ایک بہترین ڈھانچہ تیار کیا اور صنعت، معاشرت، تہذیب سب میں ایک ہی دھن پیدا کر دی۔

اتحاد کا یہ حوصلہ خالی سیاسی اتحاد کا حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا، ہندوستان کو انھوں نے اپنا وطن بنایا اور یہ سمجھ کر رہے کہ یہاں سے بس اب جائیں گے تو اپنے آخری سفر پر ہی جائیں گے۔ ان کی سرکاری زبان تو فارسی رہی، لیکن بول چال کے لیے انھوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں، ان میں سے ہر ایک کو ادبی زبان کا مرتبہ دیا اور شمالی ہندوستان کی بھاشاؤں کو ملا کر ایک ایسی زبان بنائی جو قومی زبان کہی جا سکتی ہے۔ وہ ایسے اوچھے نہ تھے کہ ہر بات کی نقل کرتے اور ایسے تنگ دل بھی نہ تھے کہ دوسرے کی اچھی چیز کو پسند نہ کرتے۔ ہندوستان آتے ہی یہاں کی فضا ان کے دلوں میں سما گئی، زبان کی طرح یہاں کے ہر فن کی انھوں نے قدر کی، ہر صنعت کو ترقی دی، اپنے مذاق کو یہاں کے مذاق میں سمو دیا اور ہر چیز میں ایک وضع نکالی جسے ہم ٹھیٹھ ہندوستانی کے سوا اور کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ہندو مسلم مذاق کا یہ میل امیر خسرو کی ملی جلی فارسی ہندی نظموں، ان کی غزلوں اور پہیلیوں سے شروع ہوتا ہے۔ انگریزی نظام حکومت نے ان باتوں کو بھلا دیا جو ہندوستان کو اس خالص ہندوستانی تہذیب نے سکھائیں۔ مسلمانوں کے دور حکومت کے بارے میں علامہ عبداللہ یوسف علی نے انگریز مؤرخ اسکریفٹن کے حوالے سے لکھا ہے:

> ہندوستان میں بدامنی اور بدنظمی کے زمانے میں بھی تالابوں اور آبپاشی کے دیگر ذرائع کو
> حکومت ضرور قائم رکھتی تھی۔ لوٹ مار بھی کم ہوتی تھی۔ اور تو اور جواہرات کے تاجروں کو

> بھی ہتھیار رکھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ سڑکیں محفوظ تھیں۔ ہر دو تین میل پر مسافروں کے لیے سرائیں اور آرام گاہ بنی ہوئی تھیں۔ علم نجوم سے عوام کو دلچسپی تھی۔ خسوف و کسوف کے اوقات باقاعدہ درج کیے جاتے تھے۔[1]

ذیل میں ان گوشوں کو علاحدہ علاحدہ طور پر اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق مسلم دور حکمرانی میں ہندوستان کی معاشی ترقی سے ہے۔

باغات، میوے، پھل اور پھول

تمدنی ترقی میں باغات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستانی زمینی پیداوار کو ترقی اور کسانوں کی حوصلہ افزائی اور اپنے ذوق کو پورا کرنے کے لیے باغات کی طرف خاص توجہ دی۔ سلاطین دہلی نے مختلف قسم کے پھل پھول اور میووں کے بے شمار باغات لگائے۔ مغلوں نے تو باغوں کی ترقی میں بہت ہی نفاست اور لطافت سے دلچسپی سے کام لیا، اکبر کے زمانے میں بہت سے میوے باہر سے ہندوستان آئے، اناس بھی اسی دور میں یورپ سے یہاں آیا، پستہ کے درخت بھی اکبر نے لگوانے شروع کیے، ان میووں اور پھلوں کے باغوں سے ہندوستان میں زراعت و تجارت میں نمایاں ترقی ہوئی، اسی دور میں گجرات میں خربوزے کی کھیتی ہونے لگی، عبدالرحیم خان خاناں نے سب سے پہلے عراق اور خراسان سے خربوزے کے بیج منگوا کر گجرات میں کھیتی شروع کرائی اور اتنی ترقی ہوئی کہ عراقی اور خراسانی اس ترقی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

---

[1] عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص،۴۹

آم پنجاب کے علاوہ بنگال، مالوہ، گجرات، خاندیش اور دکن میں ہوتا تھا۔ پنجاب میں اکبر نے آم کی پیداوار کو ترقی دی اور زیب وزینت اور خوشبودار باغوں کی طرف توجہ دی اور صندل، سرو وصنوبر اور چنار کے درخت لگائے گئے جن کا ذکر ابوالفضل نے آئین اکبری اور جہانگیر نے تزک جہاں گیری میں صاف طور سے کیا ہے۔

پھول تو ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے، مگر مغلوں نے ایران اور یورپ سے مختلف قسم کے پھول منگوا کر ہندوستان کو ایران کا چمن زار بنادیا، ولایت کے سوداگر مختلف قسم کے انار اور خراسانی خربوزے ہندوستان لائے۔ ہر سال کابل سے انار اور بدخشاں سے خربوزے آتے تھے، لیکن یہ خربوزے اور انار یزد کے انار اور کاریز کے خربوزے سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ جہانگیر غیر ملکی پھلوں اور میووں کے درختوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔

شاہ جہاں نے کشمیری پھلوں کو پیوند کے ذریعے بڑی ترقی دی، ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے باغوں میں خاص لطافت اور رنگ و بو پیدا کیا۔ تاریخوں کی کتابوں میں بہت سے باغات کا ذکر ملتا ہے، جن حکمرانوں نے باغات لگوانے میں دلچسپی لی، ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کے مطابق فیروز شاہ نے دہلی کے گردونواح میں ایک ہزار دو سو سے زیادہ باغ لگوائے، ان تمام باغات میں طرح طرح کے انگور مثلاً سفید، سیاہ، خزنی، منوری، ارغوانی، آلو وغیرہ ہوتے اور ایک جیتل میں ایک سیر انگور عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ باغات میں دوسرے پھل بھی ہوتے تھے۔ مالکوں کے منافع کے بعد ان باغات سے ایک لاکھ اسی ہزار تنکے حکومت کو بھی وصول ہوتے تھے۔

محمود بیگڑہ نے گجرات میں باغ فردوس لگوایا جو پانچ کوس لمبا اور ایک کوس چوڑا تھا اور اس میں آم کھرنی اور آنولے کے نو لاکھ درخت نصب کروائے۔ اسی زمانے میں عماد الملک نے ایک باغ لگوایا جس کا نام باغ شعبان رکھا، اس

باغ میں شوق کو ہی پورا کرنا مقصد نہ تھا، بلکہ باغات سے وہ ایک تمدنی خدمت کو انجام دے رہا تھا، یعنی زرعی پیداوار کو ترقی دینا مقصود تھا۔

سلطان محمود نے ۸۹۰ھ میں محمد آباد شہر آباد کیا اور شاندار عمارتوں کے ساتھ کثرت سے مختلف پھولوں اور پھلوں کے باغات لگوائے۔ ان باغات میں آم، پونڈے، انجیر، انگور، انار، کیلا، سردھا پھل، نارنگی، کھرنی، کٹہل، کھٹا پھالسہ، آملہ، گل لال، سیوتی، چینالو، چمپا، بیلا، موگرہ، جوہی، کرنی، کیوڑہ وغیرہ پیدا ہوتے۔ ان ہندوستانی ایرانی اور تورانی پھلوں اور پھولوں کی پیداوار سے گجرات میں بھی تمدنی نفاستیں پیدا ہوئیں۔

دور تیموری میں تو باغات میں اور بھی زیادہ تمدنی نفاستیں پیدا ہو گئیں جن کے تیموری بادشاہ منتظر تھے، اکبر اور اس کے امراء نے آگرہ اور لاہور کے حسن میں باغوں سے آراستہ کر کے چار چاند لگا دیے۔ ابوالفضل نے ان شہروں کی خوبصورتی کا آئین میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اکبر نے دریائے سابرمتی کے کنارے ایک باغ لگوایا جس کی سیر جہانگیر نے بھی کی تھی، اکبر کے زمانے میں بیجاپور کے علی عادل شاہ نے بھی بہت سے باغات لگوائے۔

اکبر کے بعد جہانگیر نے بھی کثرت سے باغ لگوائے۔ ایک باغ کشمیر میں لگوایا اور سلطان پور اور نیکودر کے درمیان میں باغ کودر لگوایا۔ ان کے علاوہ جہانگیر نے باغ نور منزل لگوایا اور اس باغ کو آبشاروں، تالابوں، حوض، کنوؤں، فواروں اور پر تکلف عمارتوں جس میں نشیمن گاہ خاص ہے، سے آراستہ کیا۔ جہانگیر نے تزک میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ باغ نور منزل کے علاوہ جہانگیر نے ایک بڑا خوبصورت باغ بوستاں کے نام سے لگوایا جو باغ بوستاں کے نام سے مشہور ہوا۔

ہندوستان میں مسلم بادشاہوں نے اتنے باغات لگوائے کہ ان کا شمار بہت مشکل ہے، ان باغوں میں پائے دار مختلف پھول اور پھلوں کے درخت لگائے گئے۔ یہی باغات ہندوستان کے غریب باشندوں کے گذارے کا ذریعہ بھی

ہے اور یہاں کی تجارت کو بھی ان کے ذریعے فروغ ملا۔ ان باغات نے ہندوستان کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کی رونق کو بھی بڑھایا اور آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ اس طرح مسلم سلاطین نے سرزمین ہند کو عظمت کی بلندیوں پر پہنچایا۔

نئے شہر اور قصبات

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے زیادہ لوگ دیہات میں رہتے تھے، بڑے شہر اور قصبات بہت کم تھے، راجہ اور مہاراجہ راجدھانی میں رہتے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی قومی ضرورت، تجارتی، صنعتی اور تمدنی ترقی کے لیے بڑے بڑے اور نئے شہر آباد کیے اور یہاں انھوں نے اپنے آپ کو اور خزانوں کو محفوظ سمجھا۔ یہاں سب شہروں اور قصبات کی تفصیل طویل ہے۔ چند نئے شہروں اور قصبات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

پنجاب میں اچ کے نام سے ایک شہر آباد کیا، اس کا نام دیو گڑھ بھی تھا۔ بنگال کی سرحد پر رنگ پورہ نامی شہر کو بختیار خلجی نے آباد کر کے اپنا پایۂ تخت بنایا۔

دولت آباد: اس کا بھی پرانا نام دیو گڑھ تھا جو دیواگیر یا دیو گری کے نام سے مشہور تھا۔ جب محمد بن تغلق نے سلطنت کو وسیع کیا تو سلطنت کے وسط میں اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنا کر دولت آباد نام رکھا۔

فیروز شاہ نے دو مشہور شہر جون پور اور قنوج کے پاس فیروز آباد بسائے جو علوم و فنون کے مرکز بنے، احمد شاہ گجراتی نے شہر احمد آباد کو آباد کیا، احمد شاہ نے گجرات کی سرحد پر ایک اور شہر احمد نگر آباد کیا، سلطان احمد بہمنی نے ایک شہر احمد آباد دکن میں آباد کیا، کشمیر میں زین العابدین نے بہت سے شہر آباد کیے، ان شہروں میں مسافروں اور محتاجوں کے لیے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرائیں۔ نصیر خان فاروقی نے برہان پور اور اس کے قریب زین آباد شہر آباد کیا۔

مبارک شاہ نے مبارک آباد اور پہلول لودھی کے عہد میں پٹیالہ پنجاب آباد ہوا۔ پھر اس کے بعد مغلوں کے دور میں اس شہر نے بہت ترقی کی اور بہت سی شاہانہ عمارتیں تعمیر ہوئیں اور عالمگیر کے دور میں اس شہر کی رونق اور بڑھ گئی۔

محمد شاہ بیگڑہ نے گجرات میں مصطفےٰ آباد شہر آباد کرائے، اس نے احمد آباد کے پاس دوسرا شہر محمود آباد آباد کیا، اس کے بعد ایک دوسرا شہر محمد آباد آباد کیا۔ سلطان محمود کے بیٹے مظفر حسین نے دولت آباد جو بڑودہ کے نام سے جانا جاتا ہے، آباد کیا۔ علاؤالدین نے ہمایوں کے قلعہ دین پناہ (دہلی) کے درمیان فیروز آباد تین کوس کی لمبائی میں آباد کیا، شیر شاہ سوری نے شہر شیر گڑھ آباد کیا۔

۹۰۰ھ میں احمد نظام نے احمد نگر شہر آباد کیا، محمود غزنوی کے عہد میں غلام ملک ایاز نے لاہور میں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور نیا شہر آباد کیا، محمود کی اولاد میں خسرو شاہ نے اس کو پایۂ تخت بنایا۔ ہمایوں کے بھائی کامران نے لاہور کی رونق کو بڑھایا، لاہور کی اصلی ترقی اکبر کے زمانہ سے شروع ہوئی، اکبر نے قلعہ شہر پناہ اور دولت خانہ تعمیر کرایا جس کا ذکر ابوالفضل نے بھی آئین میں کیا ہے۔ جہانگیر نے بھی وہاں شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔

الہ آباد جس کا قدیم نام پراگ مگر ابوالفضل کے مطابق پیاگ تھا۔، وہاں اکبر نے گنگا جمنا کے درمیان ایک قلعہ تعمیر کرایا جس کا نام الہ باس رکھا، مگر شاہجہاں نے اس کا نام الہ آباد رکھا۔ بقول ابوالفضل قدیم نام پیاگ تھا، اکبر نے اسکو بدل کر الہ آباد نام رکھا۔ ایک قلعہ تعمیر کر دیا اور عمدہ عمارتیں تعمیر کرائیں۔

آگرہ بیانہ پرگنہ کا ایک گاؤں تھا۔ سکندر لودھی نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنا کر ایک خوبصورت شہر میں بدل دیا جو بادل گڑھ کے نام سے جانا جانے لگا، بابر نے اس کو کابل اور ایران کی طرح آباد کیا اور اس کے آس پاس باغات لگوائے اور جمنا کے کنارے شاہی عمارات تعمیر کرائیں، اکبر نے بھی اس کو پایۂ تخت بنایا اور آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔

جہانگیر کے زمانے تک اس شہر کا نام آگرہ ہی رہا۔ مگر شاہجہاں کے زمانہ میں اس کا نام اکبر آباد رکھا گیا، اورنگ زیب کے عہد میں آگرہ کی کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ پرانی شان وشوکت وعظمت ہی باقی رہی۔ اس زمانہ میں بھی آگرہ صنعت وحرفت وتجارت کا مرکز تھا۔ دنیا کے تجار یہاں آتے اور مال خرید وفروخت کرتے تھے۔

فتح پور سیکری جو آگرہ سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے، ایک گاؤں تھا۔ پہاڑوں اور جنگلوں کو صاف کرا کے اکبر نے اسے عظیم الشان شہر بنادیا اور اپنا پایہ تخت بنایا۔

دکن میں برار اور حیدر آباد عمدہ اور خوبصورت شہر آباد ہوئے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۹۰۹ھ میں گولکنڈہ کے چار کوس کے فاصلے پر حیدر آباد شہر آباد کیا جس کی آب وہوا بہت موزوں تھی۔ بہدر پورہ شہر کو بہادر خاں نے ۱۰۰۹ھ میں آباد کیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے ۳۸ھ میں شہر فتح آباد بسایا۔ رستم خاں نے اپنے بیٹے مراد بخش کے نام پر عہد شاہجہانی میں مراد آباد بسایا، عہد شاہجہانی میں وزیر خاں نے لاہور کے پاس وزیر آباد بسایا۔

غیاث الدین تغلق نے شہر تغلق آباد بسایا۔ پھر اس کے لڑکے جوناخان نے اس شہر کا نام اپنے لقب محمد عادل تغلق شاہ کے نام پر شہر محمد آباد اور عادل آباد نام رکھا۔ پھر فیروز شاہ تغلق نے فیروز آباد کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ تین کوس کے فاصلے پر جہاں نما نام کا ایک محل تعمیر کرایا۔ اس کے بعد خضر خاں نے خضر آباد شہر آباد کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے مبارک شاہ نے مبارک آباد شہر بسایا، شاہجہاں کے دور میں ابراہیم آباد، اشرف آباد عالمگیر کے زمانہ میں اورنگ آباد، عظیم آباد وغیرہ آباد ہوئے۔

ان شہروں میں سے بہت سے شہر یا تو ختم ہو گئے یا بہتوں کے نام اب بدل گئے ہیں۔ ان شہروں کے علاوہ مسلم دور حکومت میں بہت سے قصبات اور نئے نئے گاؤں آباد ہوئے جن کے آخر میں پور، گنج اور آباد لگا ہوا ہے۔ ان نئے

نئے شہروں، قصبات اور دیہات نے ہندوستان کی شان و شوکت کو بلندی کے مقام پر پہنچا دیا، ان شہروں نے ہندوستانی تمدن کو فروغ دیا اور ہندوستان کے نام کو دنیا میں روشن کیا، یہ شہر وطن کی تہذیب و تمدن کے مراکز بنے۔

عوام کے فلاحی کام

تمدن کے ضروری اجزاء میں چند چیزیں ایسی ہیں جن سے تمام مخلوق یکساں طور پر فائدہ اٹھاتی ہے اور اس میں امیر غریب ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں ہوتی، مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں رعایا کے آرام و آرائش کے لئے ہندوستان میں نہایت وسیع پیمانے پر تمدن کے ان ضروری اجزا کو ترقی دی، تاریخ دکن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان علاؤالدین بہمنی نے دکن میں کئی شفاخانے قائم کیے، محمود خلجی نے شاہ آباد میں ۸۴۹ھ میں شفاخانہ قائم کیا، تاریخ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے عوام کے لئے ایک وسیع شفاخانہ قائم کیا جس کے مصارف کے لئے کئی گاؤں وقف کیے، فرشتہ کا بیان ہے کہ فیروز شاہ نے پانچ شفاخانے قائم کیے۔

تیموری بادشاہوں میں سب سے پہلے جہانگیر نے شفاخانوں کے قیام کے لئے احکام جاری کیے، شاہجہاں نے کوئی نیا شفاخانہ قائم نہیں کیا بلکہ اس عہد میں اس کے امیر وزیر خاں نے اپنی یادگار میں بہت سے شفاخانے قائم کیے، بقول مصنف مرآۃ احمدی عالمگیر کے زمانہ میں بہت سے شفاخانے قائم تھے جن کے انتظام کا عالمگیر بہت خیال رکھتا تھا۔

مسلم حکمرانوں میں محمد بن تغلق نے سب سے پہلے سراؤں کا انتظام کیا۔ اس نے اپنی حکومت کے وسط میں آباد دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور دہلی اور دولت آباد کے درمیان ہر منزل پر سرائیں بنوائیں اور راستوں کے کنارے سایہ دار درخت لگوائے گئے تاکہ مسافروں کو آمد و رفت میں آسانی ہو، سلطان محمود بیگڑہ نے گجرات میں بہت سی سرائیں بنوائیں اور سکندر لودھی نے تمام ہندوستان کے مختلف مقامات پر غسل خانے اور سرائیں، مدرسے اور بازار بنوائے۔ اس کے بعد شیر شاہ نے دو دو کوس کے فاصلے پر لاہور سے دہلی تک سرائیں قائم کیں، جس میں مسافروں کو کھانا دیا جاتا تھا۔

شیر شاہ نے بنگال اور سنار گاؤں سے سندھ تک بہت سی سرائیں بنوائیں جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے کھانے کا انتظام کرایااور سڑک کے دونوں طرف پھل دار اور سائے دار درخت لگوائے، بنگال سے سندھ تک ۱۵۰۰ سرائیں اور آگرہ سے سندھ تک ۱۵۰ سرائیں بنوائیں۔ شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ نے بھی رفاہ عام کے کام کو جاری رکھا۔ اکبر نے اپنے دور میں بہت سی سرائیں تعمیر کرائیں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں اور ان کے امراء نے بھی بہت سی سرائیں تعمیر کرائیں، عالمگیر نے اور نگ آباد سے اکبر آباد تک اور لاہور سے کابل تک سرائیں بنوائیں اور مسافروں کی ہر طرح کی تکلیف کو دور کرنے کا حکم دیا۔ عالمگیر کے بعد شاہ عالم کے زمانہ میں بھی سرائیں تعمیر ہوئیں۔ محمد شاہ کے زمانہ میں امین الدین خاں سنبھلی نے سنبھل میں اور حسین علی خاں نے اپنے وطن میں ایک عمدہ سرائے بنوائی۔

سراؤں کے علاوہ اس دور میں مہمان خانے اور لنگر خانے قائم کیے، مہمان خانے سہولت کی وجہ سے شہروں میں قائم کیے گئے۔ فیروز شاہ نے دہلی اور فیروز آباد میں ۱۲۰ مہمان خانے قائم کیے اور مسافر تین روز تک مہمان خانہ میں بطور مہمان قیام کر سکتے تھے۔ مسلم حکمرانوں نے ہندوستان میں محتاجوں اور فقراء کے لئے مالوہ میں لنگر خانے قائم کیے جہاں خام غلہ یا پکا ہوا کھانا ملتا تھا۔ محمود خلجی نے بھی اسی طرح کے بہت سے لنگر خانے قائم کیے۔ جہانگیر نے احمد آباد، لاہور، آگرہ، الہ آباد اور دہلی وغیرہ میں فقراء کے لئے غلہ خانہ قائم کیے، قحط کے زمانہ میں تو عام لوگوں کے لیے بھی عارضی لنگر خانے بھی قائم کیے جاتے تھے۔ شاہ جہاں نے گجرات اور دکن میں قحط سے متأثر لوگوں کے لیے برہان پور، احمد آباد اور سورت میں لنگر خانے جاری کیے۔ اسی دور میں بہت سے امراء نے بھی سوکھے اور سیلاب سے متأثر لوگوں کے لئے لنگر خانے جاری کئے۔ میر جملہ کے بارے میں مآثر الامراء میں تحریر ہے اسی زمانہ میں کشمیر اور پنجاب کے قحط کی وجہ سے شاہجہاں نے عوام کی اور بالخصوص غرباء و مساکین کی ہر طرح کی مدد کی۔ لنگر خانوں کے علاوہ قحط کے ساتھ جنگ وجدل، فتنہ و فساد اور فوجوں کی آمد و رفت سے جو عوام کو نقصان ہوتا تھا اس کے لئے اور نگ زیب اور دیگر امراء نے عوام کی مختلف طریقوں سے ہر طرح کی مدد کی۔ مسلم حکمرانوں نے محتاجوں اور مساکین و حاجت مندوں

کی صدقہ و خیرات کے ذریعہ بھی مدد کی۔ بیوہ اور مستحق لڑکیوں کی شادی میں بلبن، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودھی، اکبر، نور جہاں، شاہجہاں، عالمگیر وغیرہ تک لباس لحاف وغیرہ تقسیم کرتے تھے۔ تزک سے ان کی فیاضانہ عادت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ فیاضی صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ ہندؤوں کو بھی یکساں امداد پہنچائی جاتی تھی۔ شاہ جہاں کے صدقات کے بارے میں محمد صالح کنبوہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ضعیفوں، اپاہجوں، یتیموں، بوڑھی عورتوں، بوڑھے سپاہیوں کو ہر روز اور شب برأت، اور ماہ رمضان وغیرہ میں بے شمار روپیہ خیرات کرتا تھا۔ حکمرانوں نے عوام کے فیض کے لئے نہریں، کنویں، تالاب اور پل وغیرہ تعمیر کرائے جن سے ہندو مسلم غریب امیر سب یکساں فیض اٹھاتے تھے۔

نہریں، تالاب، کنویں اور پل

سب سے پہلے فیروز تغلق نے بہت سی نہریں کھدوائیں۔ ستلج سے جھجر تک ایک بڑی نہر جمنا کے کنارے نکالی جس سے سات نہریں اور جوڑدیں اور حصار فیروزہ کے محل کے نیچے ایک تالاب کھدوایا، فیروز آباد کے پاس ایک اور نہر نکالی گئی، زین العابدین نے بھی کشمیر میں بہت سی نہریں کھدوائیں، تیموریوں کے دور میں ایرانی طرز کی نہروں کا آغاز ہوا، جہانگیر نے ہندوستان کی نہروں، کنووں، حوضوں، تالابوں اور چشموں کا ذکر تزک میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خان خاناں نے ایرانی طرز کی نہر برہانپور میں جاری کی۔ شاہ جہاں نے بہت سی نہریں کھدوا کر باغوں اور زرعی زمین کو سرسبز اور شاداب کیا جس سے شہروں کی رونق میں بھی اضافہ ہوا، فرخ سیر کے وزیر اعظم سید عبداللہ خاں نے بھی شاہ جہاں آباد میں ایک نہر نکالی، علاء الدین خلجی نے تالابوں کا سلسلہ جاری کیا، اکبر نے ایک مستقل عملہ تالاب کھدوانے کا قائم کیا، جہانگیر نے بھی اپنی تخت نشینی کے ساتھ تالاب کھدوانے کا اعلان کیا، ان تالابوں سے دیہاتوں کو پانی بھی مہیا ہوا اور رونق بھی بڑھی، آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ اس دور میں شاہ جہاں نے شاہی عمارتیں آبشاروں اور حوضوں کے ساتھ تعمیر کرائیں اور باغات میں ان آبشاروں اور حوضوں نے شادابی اور رونق میں چار چاند لگادیے۔ عالمگیر نے بذات

خود تو نہیں اس کے دور میں امراء نے تالاب کھدوائے، خان زماں خاں نے نارنول اور محمد شاہ کے عہد میں حسین علی خان نے اورنگ زیب آباد میں حوض بنوایا۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں کی سہولت اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے متعدد کنویں کھدوائے، پھر اکبر نے اپنے دور حکومت میں بقول ابوالفضل کثرت سے کنویں کھدوائے۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے وارثوں کے مرنے بعد ان کے مال سے سرکاری طور پر مسجدیں، پل، سرائیں تعمیر کرائیں۔ کنویں اور تالاب کھدوائے۔

حمام تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تمدنی پیداوار ہے۔ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں غسل خانے کا رواج نہ تھا، فیروز شاہ تغلق نے بابر سے پہلے ہندوستان میں حمام تعمیر کرائے، اکبر کے عہد میں خان خاناں نے برہانپور میں نہایت عمدہ حمام بنوایا، جہانگیر نے خود تو نہیں بلکہ اس دور میں بہت سے حمام تعمیر ہوئے۔ شاہ جہاں نے کشمیر میں شالیمار باغ یعنی باغ فرح بخش کے جنوب ایک وسیع حمام تعمیر کرایا۔ لاہور میں وزیر خاں نے ایک حمام تعمیر کرایا، غالبا عالمگیر کے امیر امانت نے بھی لاہور میں حمام تعمیر کرایا جس کے بارے میں مآثر الامراء میں ذکر ملتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے دور میں پل کثرت سے تعمیر ہوئے، فیروز شاہ تغلق اور زین العابدین نے بھی بہت سے پل بنوائے، مآثر الامراء سے معلوم ہوتا ہے کہ خان خاناں نے جونپور میں پل تعمیر کرایا، جہاں گیر نے بھی بہت سے پل بنوائے، عالمگیر نے بھی بہت سے پلوں کی تعمیر کرائی۔ نواب آصف علی خاں اور حسین علی خاں نے بھی پلوں کی تعمیر کرائی، پلوں کے علاوہ فیروز شاہ نے بہت سے باندھ بندھوائے، عالمگیر نے سراؤں کے ساتھ بازار بھی قائم کیے، جہانگیر نے بوجھ اٹھانے والوں کی سہولت کے لئے ڈھائی تین گز اونچی دیواریں بڑے بڑے شہروں میں جگہ جگہ تعمیر کرائیں، ہندوستان میں مسلم بادشاہوں نے گلیوں اور راستوں کی صفائی اور روشنی کا بھی انتظام کرایا، افسوس ہے کہ تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا، سود پر روپیہ لینے سے بچنے کے لئے مستقل خزانہ قائم کیا گیا، محمود بیگڑہ نے اس طرح کا خزانہ قائم کیا۔ عوام کی بھلائی اور بے روزگاری روکنے کی بھی مسلمان حکمرانوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ قوم و ملک کی فلاح،

اخلاق اور تہذیب کو بلند رکھنے اور سیاسی شورشوں کو روکنے اور بغاوتوں کو کچلنے کی ہر دور میں کوشش کی گئی، تاکہ عوامی زندگی پر امن ترقی کی جانب گامزن رہے۔ تغلق شاہ نے رعایا کے ہر فرد کو کام میں لگانے کا خیال کیا۔ تاریخ فیروز شاہی سے اس کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ فیروز شاہ نے بے روزگار لوگوں کو کسی نہ کسی کام پر لگانے کی کشش کی۔

مسلم حکمرانوں نے رعایا کی زندگی کو خوش حال بنانے اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے کی طرف توجہ دی اور ضروریات زندگی کی اشیاء کی قیمتوں کے مناسب نرخ مقرر کیے۔ کم تولنے کم ناپنے اور قیمتوں کے بڑھانے کے خلاف سخت قانون بنائے۔ غلہ کی ارزانی کا خیال رکھا گیا۔ غلہ کی منڈیوں پر کنٹرول کیا گیا۔ کپڑے کے نرخوں پر بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ علاء الدین خلجی کو مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لئے کثیر فوج کی ضرورت پیش آئی۔ اس کثیر فوج کے اخراجات بازار پر کنٹرول کرنے کے بعد ہی ممکن تھے تاکہ سستے ملازم اور سپاہی رکھے جا سکیں، اس نے نرخ برقرار رکھنے کے لئے بہت سے ضوابط بنائے۔ (۱) منڈیوں میں سرکاری نرخ مقرر کیے گئے۔ (۲) سرکاری مال گوداموں میں غلہ جمع رہنا لازمی کر دیا۔ تجاروں کو غلہ روکے رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ غلہ فروشوں کو جمنا کے کنارے بسایا گیا۔ (۳) کاشتکاروں کو کھیت پر غلہ فروخت کرنے کا حکم جاری کیا۔ گھر پر غلہ صرف اپنے خرچ کے لئے ہی لے جا سکتا تھا۔ روزمرہ غلہ کے نرخ اور منڈی کے تمام معاملات کی بادشاہ کو خبر دی جاتی تھی۔ ضرورت سے زیادہ آدھ سیر غلہ بھی کوئی نہیں خرید سکتا تھا۔ اس کے لئے گماشتے اور جاسوس مقرر کیے گئے جو بادشاہ کو ہر بات کی خبر دیتے تھے۔ کپڑا سوداگروں کو حکم تھا کہ اسی سرائے میں کپڑا اتارا جائے اور شاہی نرخ کے مطابق ہی کپڑا فروخت ہوتا تھا۔ کسی بازار یا گھر میں کپڑا نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ کپڑا صبح سے دوپہر تک ہی فروخت کیا جاتا تھا۔ خرید و فروخت میں اگر وقت کی پابندی نہیں کی جاتی تو کپڑا ضبط کر لیا جاتا تھا۔ رئیس اور امراء بھی قوانین کے پابند تھے۔ سرائے عدل سے سرکاری نرخ سے کپڑا خرید کر باہر زیادہ قیمت پر کپڑا نہیں بیچا جا سکتا تھا۔ کپڑا غلہ کی مقرر قیمت کے ساتھ گھوڑوں، بھینس، بکری، بھیڑ، گائے وغیرہ کی

قیمتیں بھی مقرر کر دی گئیں۔ ان سب کاموں کے علاوہ مسلم سلاطین اور امراء نے عوام کی سہولت اور راحت کے لئے بہت سے کام کیے۔

سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوستان کی دنیا بھر میں جو عظمت قائم ہوئی اس کا بیان مسالک الابصار، صبح الاعشی، ابن بطوطہ، شمش سراج، عفیف، ضیاء الدین برنی، محمد بن عبد الرحیم اور دیگر سیاحوں کے بیانات سے ثابت ہے کہ اس عہد میں ہندوستان کی شان و شوکت اور عظمت و شہرت کا مقابلہ دنیا کا کوئی ملک نہیں کر سکتا تھا۔ مصنفین نے ہندوستان کی جو تصویر پیش کی اس سے اس عہد کی جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

کاغذ سازی

کاغذ مسلمانوں ہی نے یہاں رائج کیا جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے۔ کاغذ کے رائج ہونے کے بعد پتوں پر کتابوں کے لکھنے کا رواج بند ہو گیا اور کتابیں ظاہری حسن کے ساتھ زیادہ تعداد میں ہاتھ آنے لگیں۔ مخطوطات کی کلا کاری ایک خاص آرٹ ہے جو مغلوں کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اکبر اور اس کے بعد کے عہد میں ہندو راجاؤں کے لیے ہندی اور سنسکرت میں کتابیں نقل کی جانے لگیں اور ان کو مصوّر بھی کیا گیا۔ یہاں کی فارسی کتابوں کی کلا کاری اور خطاطی کی شہرت یورپ تک پھیلی جس کی وہ مستحق تھی۔ مسلمانوں کے اثر سے کتابیں عام طور سے نقل کی جاتیں۔ علوم وفنون کو پھیلایا جاتا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے لوگ اپنی کتابوں اور علوم وفنون کو راز ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے۔

چین والے چینی کاغذ پر لکھتے تھے جو گھاس سے تیار کیا جاتا تھا اور شہر کی بڑی آمدنی کا ذریعہ تھا، کاغذ کی ایجاد کا سہرا چینیوں کو جاتا ہے، چینیوں کے بعد آٹھویں صدی میں اس ہنر کو مسلمانوں نے سیکھا اور انہیں کے ذریعہ تمام دنیا کاغذ اور اس کے استعمال سے واقف ہو گئی، البیرونی لکھتا ہے کہ جب مسلمانوں نے سمرقند پر حملہ کیا تو قیدیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو کاغذ بنانا جانتے تھے۔ عربوں نے قیدیوں سے اس صنعت کو سیکھ کر اسے ترقی دی، اس طرح سمرقند اور

خراسان میں سب سے پہلے کاغذ کے کارخانے قائم ہوئے، عربوں نے کاغذ سازی میں ترقی کا قدم بڑھایااور روئی سے کاغذ تیار کرنے لگے کچھ مؤرخین کی رائے ہے کہ چینی لوگ گھاس یا شہتوت کے درخت کی چھال یا ایک قسم کے خاص پودے سے کاغذ بناتے تھے اور عربوں نے چیتھڑوں سے کاغذ بنانا ایجاد کیا۔ درخت کی چھال ہرن کے چمڑے کی طرح نرم ہوتی تھی، اسی سے سفید کاغذ بنایا گیا۔

مسلمانوں نے ان ممالک کو جہاں ان کے فاتحانہ قدم پہنچے کبھی صرف دودھ دینے والی گائے نہیں سمجھا، وہ اسپنج کی طرح ایک ملک کی دولت پی کر دوسرے ملک میں اگلنے کے قائل نہ تھے، انہوں نے انتہائی قیمتی سوغات اس ملک کے حوالے کر دیے یعنی احترام انسانیت و مساوات کا تحفہ، ملک کو چلانے کی اہلیت وصلاحیت، اعلی درجے کی حسن تدبیر اور حسن انتظام، وہ اپنی غیر معمولی ذہانت، لطیف احساس و شعور، ذوق رفیع، دل دردمند اور دست ہنر مند سب کے ساتھ آگے بڑھے اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے اس ملک کو وحشت کے دور سے نکال کر دور تمدن میں یا عہد طفولیت سے نکال کر عہد شباب میں پہنچادیا۔ بدامنی وانتشار کے بعد امن و سکون کا دور آیا، اضطراب کی جگہ سکون واطمینان نے لے لی، زمین نے نئے نئے شگوفے کھلائے، تمدن اپنے نقطۂ عروج تک جا پہنچا۔ بیاباں و صحرا اور بنجر زمینیں آباد و گلزار، شہر لہلہاتے مرغزاروں میں تبدیل ہوگئے۔ جنگلوں کی جگہ طرح طرح کے دلفریب باغات نظر آنے لگے۔ خودرو اور جنگلی پیڑوں کی جگہ ترقی یافتہ اور ثمر دار درختوں نے لے لی۔ بہت سے نئے علوم و فنون کی طرح ڈالی گئی۔ تہذیب و تمدن اور طرز حکمرانی نے نئی نئی روشیں پیدا کیں۔ مختلف قسم کے علوم و فنون وجود میں آئے جن کا ماضی میں کوئی اندوختہ موجود نہ تھا۔ تجارت وزراعت دونوں میں خوب ترقی ہوئی۔

برطانوی حکمرانوں کی سیاسی پالیسی اور حکمت عملی

تمام مہذب، ذی شعور اور سمجھ دار لوگوں حتیٰ کہ کم فہم لوگوں کا بھی یہ تسلیم کیا ہوا اصول ہے کہ اتحاد و اتفاق ، رواداری و سماجی ہم آہنگی اور میل ملاپ ہی انسانی فلاح و بہبود، دنیوی اور دینی ترقی اور راحت و آرام کا ذریعہ ہے۔ انسان جو کہ صاحب عقل و شرافت ہے وہ اگر اس کا احساس کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ چیز تو جنگلی حیوانوں اور درندوں تک میں پائی جاتی ہے، وہ اتحاد و اتفاق سے زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے پابند بھی رہتے ہیں، اسی طرح سب مانتے ہیں کہ جھگڑا، لڑائی، تنفر اور عداوت، بدامنی اور فساد ہر طرح سے بربادی کے اسباب ہیں، جن کی اجازت کسی طرح نہیں دی جاسکتی۔ مگر برا ہو خود غرضی اور نفسانی خباثتوں کا کہ وہ انسانوں اور اقوام کو ایسی ملعون پالیسیوں پر مجبور کرتی ہیں جن کی وجہ سے قوموں کی قومیں بربادی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں، یورپین اقوام اور بالخصوص برطانوی قوم نے حصول اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کے لیے یہی پالیسی تمام ایشیائی اور افریقی اقوام کے ساتھ ضروری سمجھی۔ جس ملعون طریقہ سے بھی ممکن ہو ہندوستان کو حاصل کرنا، پھر پورے ملک کو زیر اور برباد کر کے اور اپنے آہنی پنجہ کے اندر دبا کر چوستے رہنا اور یہاں کی معیشت کا اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا انگلینڈ کی حکمت عملی رہی ہے، جب مقاصد ایسے ہلاکت انگیز ہوں تو ملکوں اور وہاں کے باشندوں کی بربادی میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر درندوں کو اس کی کیا پرواہ، ان کو خون چوسنے سے مطلب تھا، شکار مرے یا جیے، اس سے انہیں کیا لینا۔ برطانیہ کی دو سو سالہ شرمناک سیاسی پالیسی نے ہندوستان کو سخت ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں ڈال دیا اور ایسے گندے اخلاق اور اعمال میں مبتلا کر دیا جس کے دور رس اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ برطانوی حکمرانوں کی سیاسی پالیسی کے مطالعے سے ہمدردی، انسانیت اور خدمت خلق کے برطانوی دعووں کا پول کھل جاتا ہے اور حقیقت حال بے نقاب ہو جاتی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور اسے بقاء و دوام بخشنے کے لیے مختلف حربے اور طریقے اختیار کیے، ان میں سے خاص طور سے ہندوستانی باشندوں کے درمیان مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے بیچ

فرقہ وارانہ جذبات کا فروغ، ہم مذہب لوگوں کے درمیان مسلک اور ذات پات کی منافرت، تعلیمی انحطاط، روزگار کی عدم دستیابی اور معاشی ابتری جیسے امور خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس جگہ ہم نے ان ہی امور میں سے چند امور سے بحث کی ہے۔

انگریز حکمرانوں کے مختلف حربوں میں سے ایک حربہ یہاں کے باشندوں کے بیچ مختلف امور میں اختلاف و انتشار پیدا کرنا اور لڑانا تھا، انگریزی عہد حکومت کی غیر جانبدارانہ تاریخ اور برطانوی دستاویزات کا منصفانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی پر کس کس طرح سے عمل کیا۔ یہاں ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں جس سے ہمارے اس دعوی کی تصدیق ہوتی ہے۔ لارڈ ڈالگن کے زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ووڈ نے ایک خط مؤرخہ ۳/مارچ ۱۸۶۲ کو لکھا کہ

> ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو مخالف بناتے رہے ہیں اور اس عمل کو جاری رکھنا چاہیے اسی لیے جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔"[1]

مئی ۱۸۶۲ء اسی مسٹر ووڈ نے لارڈ ڈالگن کو پھر لکھا کہ

> ہمارے خلاف جو مخالفت ہو اس کو مضبوط بننے نہ دیا جائے اور اس کو یقین جانیں کہ وہاں (ہندوستان) کے لوگوں میں جو ایک دوسرے سے دشمنی ہوگی وہ ہمارے لیے قابل اعتبار قوت ہوگی اور پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں باقی نہیں رہ سکتے ہیں۔[2]

---

[1] بحوالہ محمود علی، عظمت ہنوستان اور عہد وسطی، ص۲۸

[2] بحوالہ محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص۲۸

اسی کی ایک اور مثال جس سے انگریزوں کی سیاسی پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے وہ تحریر ہے جسے ۲۶ مارچ ۱۸۸۶ کو ایک دوسرے سیکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے لارڈ کرزن کو لکھا وہ کچھ اس طرح ہے۔

میرے خیال میں ہندوستان میں ہماری حکومت کو ابھی خطرہ نہیں ہے لیکن پچاس برس کے بعد یہ خطرہ ضرور سامنے آئے گا جب مغربی طرز کی شورش پسندی اور تنظیم کی قوت ابھرے گی، ہم لوگ ان تعلیم یافتہ لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں اور یہ دونوں اپنے خیالات میں کافی مختلف ہوں، آئندہ تعلیم کے پھیلنے سے ہماری حکومت پر تیز اور مسلسل حملے ہونگے لیکن ہم ہندوستانیوں میں تفرقہ پیدا کرتے رہیں تو اس سے ہماری حکومت مضبوط رہیگی، ہمارے تعلیمی اداروں میں تعصبات کی کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں میں تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی ہو۔[1]

۳ جنوری ۱۸۸۶ کو کراس نے گورنر جنرل ڈفرن کو لکھا کہ

یہاں کے لوگوں میں مذہبی اختلافات پیدا کرنا ہمارے فائدے کے لیے ہے اور آپ نے جو ہندوستانی تعلیم اور اس کے نصاب کے بننے کی تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں۔[2]

اسی حوالہ سے سر جام میکلم لکھتا ہے:

اس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے

---

[1] بحوالہ، ایضا، ص ۲۸

[2] بحوالہ، ایضا، ص ۲۹

ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالبا کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔[1]

سر جان میکلم کے ذریعہ بیان کیے گئے اس مقصد کے حصول کے لیے ایسی تاریخیں لکھی گئیں جن میں ہندؤوں پر مسلمان بادشاہوں کے ذریعہ فرضی اور غیر واقعی مظالم بھیانک صورتوں میں دکھلائے گئے، جن میں سے مشہور تاریخ سر ہنری ایلیٹ کی ہے، جسے یہ بات سخت ناگوار تھی کہ پڑھے لکھے ہندو مسلمانوں کی گزشتہ عہد حکومت کی تعریف کیوں کیا کرتے ہیں اور کیوں برطانوی عہد کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں جس قدر کتابیں اور تاریخیں خود ہندو مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں، ان سب سے مسلمانوں کی عظمت ووقعت کا اظہار ہوتا تھا اور اس کو متعصب انگریز برداشت نہ کر سکتے تھے، اس لیے سب سے اول سر ہنری ایلیٹ نے جو کہ ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے اور آخر میں حکومت ہند کے محکمۂ خارجہ کے سکریٹری ہو گئے تھے، ہندوستان کی ایک تاریخ لکھ کر اس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع کی، یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانۂ قدیم اور بالخصوص مسلمانوں کے عہد کے خلاف خوب زہر اگلا ہے، تاریخی میدان میں یہی وہ پہلی کتاب آئی جس کے ترجمے دیسی زبان میں کرا کے ان کے ذریعے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار اور دشمنی کا بیج بویا گیا۔ اگر کسی شخص کو اس تاریخ کے لکھے جانے کا مقصد معلوم کرنا ہو تو اس کے لیے صرف اس کا دیباچہ پڑھ لینا بالکل کافی ہوگا۔ جس میں مؤرخ نے اپنی منشاء کو واضح اور صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً وہ تحریر فرماتے ہیں:

بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات، توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے، مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں، ماہ

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا ص، ۱۷۰؟

محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں، اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔[1]

ایلیٹ کے مذکورہ بالا الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ وہ فرقہ واریت اور نفرت وعداوت کو ہندوستانی باشندوں کے درمیان کس طرح پھیلانا چاہتا تھا اور اسے یہاں کے باشندوں کے بیچ باہمی میل جول اور آپسی محبت سے کس قدر چڑھ تھی، ایلیٹ کو ہندو مصنفین کی اس بات پر سخت غصہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مراسم اور مذہب کی اس قدر عظمت کیوں کرتے ہیں اور ان میں اتحاد اور سماجی ہم آہنگی کیوں پائی جاتی ہے، اسے ہندو مصنفین کے وہ تعریفی کلمات جنہیں وہ اسلامی عہد حکومت کے متعلق کہتے یا لکھتے تھے، نہایت ناگوار ہوتے تھے، حالانکہ وہ واقعیت پر مبنی ہوتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ہندو مصنفین انہیں وجوہ سے جو کہ واقعی اور صحیح تھیں اور جن کا مشاہدہ اور معاملہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے باپ داداؤں سے سن کر یقینی طور پر مانتے تھے مسلمانوں کے عہد حکومت کی تعریفیں کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی عیب جوئی کرتے تھے۔ ایلیٹ آنکھوں میں دھول جھونک کر اور واقعات کو چھپا کر اور مسخ کر کے بلکہ فرضی اشیاء درمیان میں لا کر چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کو ظالمانہ اور انگریزوں کے عہد حکومت کو نرم اور منصفانہ ثابت کریں، حالانکہ انگریزوں نے بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدوں پر آخر تک کسی ہندوستانی کو فائز نہیں ہونے دیا اور وہ انسانیت سوز اور برباد کن کاروائیاں کرتے رہے کہ جن کی مثال متمدن دنیا میں نہیں ملتی۔

اس قسم کی تاریخ نگاری کی ابتدا ایلیٹ صاحب نے کی تھی، ان کے بعد مسٹر کیمسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے بھی اسی نوعیت کی ایک تاریخ لکھی جس کی شکایت سرسید احمد خان نے بھی کی ہے۔ اسی قسم کی کتابیں اسکولوں کے

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۷۰

درس میں داخل کی گئیں، ان کے ترجمے اردو میں کراکے تمام ملک میں پھیلائے گئے جنہوں نے ملک کے امن کو باہمی خلفشار اور کشاکش میں بدل دیا۔ اسی قسم کی فضا میں ملک میں فرقہ وارانہ اور نام نہاد سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں جو ملک کی سیاسی ترقی میں مزاحم ہو کر غیر ملکی حکومت کی بالواسطہ امداد کرتی رہتی تھیں۔

چنانچہ یہی وہ تعلیم ہے جس کا پھل چکھنے سے ہندوستان میں مذہبی افتراق پیدا ہوا اس کی تصدیق سر جان مینارڈ ممبر ایگزیکٹو کونسل پنجاب کے سینیر ممبر کے حسب ذیل قول سے ہوتی ہے جس کو اس نے لندن کے ایک جریدہ موسومہ 'معاملات خارجیہ' میں شائع کیا تھا:

> ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ظالم بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے کسی نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور کسی نے ذبیحہ گاؤ پر مجنونانہ جوش میں آکر سزائیں دیں۔ لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا خواہ ہندو یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف بہ پرستش ہوتے تھے۔[1]

ان تاریخی کتابوں اور اس قسم کے پروفیسروں اور مدرسوں نے گزشتہ بادشاہوں اور راجاؤں کو متعصب، کٹر مذہبی، مذہبی دیوانے وغیرہ الفاظ سے ملقب کر کے تحریروں اور تقریروں میں زہر پھیلا کر ملک کی فضا کو نہایت زیادہ گندا کیا۔ نوعمر، جوشیلے، ناتجربہ کار، ناواقف طلبہ کے سادہ اور صاف قلوب ان زہریلے مواد سے ایسے زہر زدہ ہو گئے کہ ان کی اصلاح باوجود کھلی بربادی اور نہایت مضرت رساں نتائج دیکھنے اور اقرار کرنے کے نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ دلوں

---

[1] لالہ لاجپت رائے، ان ہیپی انڈیا، ص،۴۰۸

کی صفائی ہو سکتی تھی۔ اسی کی شکایت ڈبلیو ایم ٹارانس اپنی کتاب 'ایشیاء میں شہنشاہیت' میں کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:

> شیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے۔ لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اس وقت ان کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا۔ جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حق دار سمجھا جاتا تھا اور نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا۔ جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدہ کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا، ٹھیک اس وقت ہندوستان کے اندر ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت اور سرمایہ کمانے میں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے۔[1]

گزشتہ شہادتیں جو بالکل صحیح ہیں بتلاتی ہیں کہ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور دیگر سلاطین مغلیہ اور اسی طرح شیواجی اور سلطان ٹیپو اور دوسرے نواب اور راجہ فرقہ وارانہ تعصبات نہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے نہ اپنے احکام شاہی اور اپنے درباروں میں استعمال کرتے تھے۔ ہاں حکومت اور ملک کے لیے بے شک لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، مگر ہندو راجاؤں کے ساتھ مسلمان اور مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ ہندو فوجی ہر طرح کی خدمات اور ملکی نظام میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک کو دوسرے پر اعتماد ہوتا تھا، جہانگیر اپنے تمام توپ خانہ کو راجہ بکرماجیت کی کمان میں رکھتا تھا، مرہٹے اپنے تمام توپ خانہ کی قوت کو ابراہیم کردی کے زیر کمان رکھتے تھے۔ توپ خانہ ایسی اہم چیز ہے کہ اس پر لڑائی کا تمام تر دارومدار ہوتا ہے، چنانچہ پورے دور حکومت میں انگریزوں نے اپنے توپ خانہ کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

---

[1] ڈبلیو ایم ٹارنس، ایشیاء میں شہنشاہیت، بحوالہ، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ حسین احمد مدنی، ص، ۱۷۴

اورنگ زیب مرحوم جن کو انگریزوں نے بعد میں متعصب مشہور کیا اور پھر کچھ ہندوستانی مؤرخین نے بھی انگریزوں کی ہمنوائی کی، اس کے متعلق مسٹر آرنلڈ کی اور دوسرے مؤرخین کی شہادتیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت فراخ حوصلہ اور دریادل غیر متعصب بادشاہ تھا۔ ہفت ہزاری منصب پر اکبر کے یہاں صرف ایک ہندو فائز ہوتا ہے، مگر عالمگیر کے یہاں اس منصب پر ایک فہرست میں دو اور دوسری میں تین ہندو امراء نظر آتے ہیں، اس کے سپہ سالاروں میں جے سنگھ، جسونت سنگھ، ساہو پسر مہاراجہ سیتاراجندر جی داماد شیواجی، مالوی بھونسلہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ شیواجی کے مقابلہ کے لیے جے سنگھ سپہ سالاری کرتا ہوا پہنچتا ہے اور اس کو قید کرتا ہے، شیواجی معافی طلب کرتا ہے تو عالمگیر اس کو معاف کر دیتا ہے۔ انگریزی قانون اور عمل درآمد میں تو صرف سازش پر رجسٹریشن ایکٹ کے تحت موت یا کالے پانی کی سزا دینی ضروری ہو جاتی تھی، بغاوت کی تحقیق پر تو ٹھکانہ ہی نہیں، مگر شیواجی کھلی بغاوت کرتا ہے اور بادشاہی قلمرو کو لوٹتا اور فوجوں سے مقابلہ کرتا ہوا اور ہزاروں کا خون بہاتا ہوا پکڑا جاتا ہے، مگر معافی مانگنے پر دوبارہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور خلعت پاتا ہے۔ اسی طرح تمام نوابوں اور بادشاہوں کا حال تاریخ میں موجود ہے، سلطان ٹیپو کا دیوان معتمد سردار پورنیا برہمن تھا۔ سراج الدولہ (نواب بنگال) کا صدر دیوان (وزیر اعظم) موہن لال اور پٹنہ کا گورنر رام نارائن تھا۔ آصف الدولہ (نواب اودھ) کا وزیر اعظم بھاؤلال تھا۔ روہیلہ نواب حافظ رحمت خان کا وزیر اعظم راجہ مان رائے تھا اور اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا راؤ پہاڑ سنگھ ہوا۔ نواب کو اس قدر اعتماد تھا کہ نوابوں اور گورنر جرنل کے پاس ایلچی بنا کر اس کو بھیجا جاتا تھا۔

مسلم حکمراں اپنے طرز عمل میں ہمیشہ غیر متعصب رہے اور انہوں نے کبھی ہندوؤں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا، مذہبی آزادی کے علاوہ ہندوؤں کو زراعت اور تجارت میں بھی گراں قدر مراعات اور حقوق حاصل تھے، بلکہ مسلمان تو بالعموم فوجی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے تھے، زراعت و تجارت بہ تمام و کمال ہندوؤں کے ہاتھ میں ہی تھی۔ ہندوؤں کی بعض قومیں مثلاً کھتری، ٹھاکر اور راجپوت فوج میں نوکری کرتے تھے ویش خزانچی کے

عہدوں کے لیے موزوں سمجھے جاتے تھے۔ اور کایستھ اہل قلم ہونے کے باعث حکومت کے تمام دفاتر میں ملازم تھے۔ سفارت کے اہم اور نازک فرائض بھی بالعموم ہندو معتمدین کے سپرد کیے جاتے تھے۔ چنانچہ حافظ الملک نے منشی ٹیک چند اور منشی چتر بھوج کو بارہا بڑی اہم سفارتوں پر بادشاہ دہلی، مرہٹوں، جاٹوں، شجاع الدولہ اور انگریزوں کے پاس روانہ کیا۔ دیوان کا عہدہ جو مدارالمہام یا وزیر اعظم کے برابر سمجھا جاتا تھا، خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا۔ پہلے راجہ مان رائے حافظ الملک کے دیوان رہے اور ان کے بعد راؤ پہاڑ سنگھ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے، جن کی جاگیر میں کم و بیش ۴۶۰ گاؤں تھے، ان لوگوں کے حافظ الملک سے نہ صرف برادرانہ اور عزیزدارانہ تعلقات تھے، بلکہ یہ لوگ ان کے جملہ مالی اور ملکی معاملات میں سیاہ و سفید کے مالک اور غیر معمولی اختیارات کے حامل تھے۔ حافظ الملک کی مجلس مشاورت جس میں اہم معاملات طے پاتے تھے اس میں ہندو اعیان دولت میں شریک ہوتے تھے جن کی موجودگی کے بغیر کوئی مجلس انعقاد پذیر نہ ہوتی تھی۔ اور ان کی رائے کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔

نیز رنجیت سنگھ کے وزیر اور معتمد خاص پیرزادہ عزیز الدین تھے اور اس کے توپ خانہ کے افسر اعلی الٰہی بخش تھے۔ اسی نام سے توپ خانہ موسوم تھا، یہی نہیں کہ ان دنیادار بادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کے یہاں آپس میں ایک دوسرے پر اس قدر اعتماد تھا۔ بلکہ مذہبی لوگوں میں بھی یہی اعتماد اور وثوق تھا، سکھوں سے لڑائی میں حضرت سید احمد شہید بریلوی نے اپنے توپ خانہ کا چارج راجہ رام راجپوت ہندو کو دے رکھا تھا۔ جس نے اتمان زئی کی جنگ میں سکھوں پر بہت سخت گولہ باری کر کے سکھوں کو شکست دی۔

غرض کہ زمانۂ ماضی میں ہر دو فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ اعتماد اور وثوق اور میل جول اور رواداری کا تھا۔ ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ یکجا رہتے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء تک مذہبی اور ملی اختلاف کا عوام میں وجود نہ تھا۔ جب فوجوں میں بغاوت اور انقلابی تحریک شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی اپنی چھاؤنیوں میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے

معزول اور معطل بادشاہ مرحوم کی طرف دوڑ پڑے۔ سپاہی بہار تک سے آئے۔ ان میں ہر ملت اور مذہب کے ہندوستانی تھے۔ ہندو سپاہی بھی بہادر شاہ کی جے پکارتے تھے۔ اگر ان کے درمیان اس وقت تعصبات ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس ہی جاتے اور ہندو سپاہی کسی ہندو راجہ کے پاس جاتے۔ مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب و ملت معزول اور بے جان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور دیگر اقوام ملے جلے عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرح بستے اور آپس میں رواداری بلکہ اتحاد و اتفاق سے چلے آتے تھے۔ مگر انگریزوں نے اپنے مفاد اور خود غرضی کے لیے اس کو خطرہ جان کر مختلف تدبیروں سے نفاق ڈلوایا اور آپس میں ایک دوسرے کو لڑانا اختیار کیا، کبھی ایک جماعت پر دست شفقت پھیرا اور کبھی دوسری پر اور اس ذریعہ سے مختلف ملتوں میں رقابت پیدا کر کے حسد، عناد، مذہبی کشت و خون کی صورتیں پیدا کیں۔

سمت سرکار نے اپنی کتاب 'جدید ہندوستان' میں لکھا ہے کہ:

> اس کے ساتھ ہی ہندوستانیوں کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی جا رہی تھی کہ انگریز تو یہاں محض امین (امانت دار) کا رول ادا کر کے ہندوستانیوں کو اپنی حکومت کے لیے تیار کر رہے ہیں، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ برطانوی راج ناگزیر طور پر ایک جابرانہ اور گوروں کا راج تھا جس میں سیاسی فیصلے اور حکومت چلانے کا سارا اختیار یوروپیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ۱۸۸۰ کی دہائی میں انڈین سول سروس کی کل ۹۰۰ا سامیوں میں سولہ کے علاوہ باقی سب پر یورپی ہی فائز تھے۔ ۱۸۶۱ میں مٹھی بھر ہندوستانی صوبائی کاؤنسلوں اور سپریم کاؤنسل میں شامل کیے گئے تھے۔ مگر اس طرح کے سپریم کاؤنسل کے ان نامزد ہندوستانی ممبروں کے اختیارات کافی حد تک کم کر دیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں فائنانس ممبر اے گرین بارنگ کی یہ شہادت

آج بھی موجود ہے کہ ہم بنگالی بابو کو اس کے اسکولوں اور نالیوں کے سلسلے میں بحث کی اجازت دے کر مملکت برطانیہ کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ بری فوج (آرمی) جیسے اہم شعبے کے دروازے بھی ہندوستانیوں پر بند تھے۔ ۱۹۴۷ تک کوئی بھی ہندوستانی بریگیڈیر کے درجے سے اوپر ترقی نہیں پاسکتا تھا۔[1]

ہندوستانی معیشت پر برطانوی اثرات

حکومت اور رعب ودبدبہ کے نشہ میں ظلم وعناد میں مست انگریزوں کے لیے یہ بات یاد رکھنی یا تسلیم کرنی دشوار ہوگئی تھی کہ کسی زمانہ میں یورپ بالخصوص انگلستان کے نووارد تاجروں پر ہندوستان کے فرماں رواؤں نے اپنی بے تعصبی اور دریادلی سے کیا کیا احسانات کیے اور کیسی کیسی رعایت و مراعات روا رکھیں، جو ہمدردی بعد کو احسان فراموش تاجروں کی چالاکی اور احسان فراموشی سے خود ان حکمرانوں اور ان کی نسلوں کے حق میں وبال جان بن گئیں اور دوسروں کے واسطے خیر اندیشی اپنے حق میں سخت ناعاقبت اندیشی ثابت ہوئی۔ اگرچہ تاریخ ہند کے اس پہلو پر بہت اہتمام اور احتیاط سے پردہ ڈالا گیا ہے، مگر انگریزوں کی آمد کے بعد کی ہندوستانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا سبق ہے کہ ہندوستانی فرماں رواؤں کی بے جا رعایت اور بے محل اعتماد نے ہندوستان کو آنکھوں دیکھتے ہاتھوں سے نکال دیا۔ غرضیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کو ہندوستان کے بادشاہوں اور فرمان رواؤں نے ایسی ایسی رعایتیں اپنی بے تعصبی اور دریا دلی سے عطا کیں کہ آج تمدن کی مدعی یورپ کی قومیں اور انسانیت کی خدمت گزاری کے بلند بانگ دعوے کرنے والی بادشاہتیں کسی دوسری قوم اور نووارد مسافروں کے ساتھ روا نہیں رکھتیں۔ لارڈ کلایو لکھتا ہے:

شہر مرشد آباد مثل لندن کے وسیع آباد اور خوش حال ہے مگر فرق یہ ہے مرشد آباد میں ایسے ایسے افراد ہیں جو جائیداد کے مالک ہونے میں انگلستان کے لوگوں سے بدرجہا بڑھے

---

[1] سمت سرکار، جدید ہندوستان، ۱۸۸۵-۱۹۴۷، ص، ۱۷

ہوئے ہیں۔ مرشد آباد میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں اگر وہ یورپینز کو تباہ کرنا چاہتے تو محض لاٹھیوں اور پتھروں سے کر دیتے۔[1]

چاہیے تو یہ تھا کہ انگریزوں میں تہذیب اور انسانیت و شرافت، عدل و انصاف، مروت اور اخلاق ہوتے تو ہمیشہ ممنون احسان رہ کر دائرۂ قانون اور انصاف کے ماتحت شکر گزاری کے ساتھ اپنی جائز تجارت میں مشغول رہتے۔ مگر انہوں نے ابتداء ہی سے ان مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنی بربریت اور جعلسازیوں اور چالاکیوں اور غداریوں کو ہمیشہ کام میں لاکر ہر طرح ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھا، اور لوٹ کھسوٹ کو اس قدر دن رات مختلف پیرایوں سے کام میں لاتے رہے کہ ہندوستان کی دولت مندی ایک کہانی بن کر رہ گئی اور ہندوستان جسے کبھی 'سونے کی چڑیا' کہا جاتا تھا، اس کی حالت اب ایک غریب، فاقہ زدہ اور کنگال ملک کی ہو گئی۔ یہاں کی آبادی لاکھوں کی تعداد میں بھوک کی وجہ سے ایڑیاں رگڑتی ہوئی موت کے گھاٹ اتر گئیں۔ یہ سلسلہ ابتدائی تجارت سے لے کر آخری ایام حکومت تک برابر جاری رہا، مگر ان میں ذرا بھی رحم دلی پیدا نہ ہوئی اور ہندوستانیوں کی لاچارگی اور مصیبتوں کا خیال بھی نہیں آیا۔

بے شک سنگ دل حملہ آوروں کی عادت رہی ہے کہ وہ فتح یابی پر اپنی مفتوح قوموں اور ملکوں کو لوٹا کرتے تھے، مگر امن قائم ہو جانے اور اطاعت کا دم بھر لینے پر سخت سے سخت سنگ دل اور وحشی حملہ آور لوٹ کھسوٹ کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاتے تھے، مگر انگریزی قوم اطاعت اور فرماں برداری کا دم بھرنے والی ہندوستانی رعایا کے متعلق بھی اسی لوٹ کھسوٹ کی تگ و دو اور فکر و کوشش میں مشغول رہی، اور نئے نئے انسانیت سوز طریقوں اور قوانین سے ہندوستانی عوام اور امراء اور یہاں کی دولت و صنعت کو برباد کرتی رہی۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔ ہم معتمد انگریزوں کی شہادتوں سے مختصر طور پر کچھ شہادتیں نقل کرتے ہیں۔

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص، ۴۴

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے اقتدار کی بقااور یہاں کے مال ومتاع کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ اپنے ملک اور ہم وطنوں کو خوش حال بنانے کے لیے جو طریقے اور فارمولے اختیار کیے، اسے تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے، اول تسلط بذریعہ تجارت، دوم تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر۔ سوم تسلط بذریعہ پوست۔ خوش معاملگی کا دکھاوااور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو برباد حالت میں لازمی طور پر قائم رکھنا۔ اب ہم ان تینوں اصول حکومت اور تینوں ادوار کے حالات مختصر طور پر بیان کرتے ہیں، ان تینوں ادوار اور اصول حکومت میں یہ امر مشترک رہا ہے کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور انگلستان کو پہنچایا جائے، اگرچہ طریقۂ حصول بدلتا رہا ہے۔

پہلا دور تسلط بذریعۂ تجارت (از ابتداء تا ۱۷۵۷ء)

پہلے دور میں ہندوستان کی دولت کو سمیٹ کر انگلستان کو پہنچائے جانے کی کیفیت کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ۱۶۰۱ء میں برطانیہ سے ہندوستان کی طرف تجارتی جہاز روانہ کیا گیا اور اس پہلے سفر سے ہی تجارت کی شروعات ایسی رہی کہ ہر سفر میں منافع بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ بارہویں سفر میں کمپنی کے ہر حصہ دار کو ۳۳۴ فی صد نفع ہوا، انگلستان کی آمدنی میں بھی دن دونی اور رات چوگنی زیادتی ہوتی گئی۔ ۱۶۱۳ء میں برطانیہ کی سرکار کو کمپنی نے تیرہ ہزار پونڈ محصول ادا کیا اور ۱۶۶۲ء میں یہ رقم چالیس ہزار تک پہنچ گئی، ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریبا ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کا سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات خرید کر لے گئے۔ ان اعداد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کاروبار شروع ہی میں کس پیمانہ پر پہنچ گیا تھا۔ حالاں کہ کمپنی کا مشترک سرمایہ ابتداء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا جس کو لندن کے سو سے زیادہ تاجروں نے مل کر ہندوستانی تجارت کے لیے جمع کر کے ملکہ الزبتھ کے دربار میں محضر پیش کرتے ہوئے اجازت کا معیار بنایا تھا جس پر ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں شاہی منشور عطا کیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کمپنی جس کا سرمایہ ۱۶۰۱ء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا تقریبا ساٹھ برس تجارت کرنے کے بعد اس قدر وہ دولت مند ہو جاتی ہے کہ بادشاہ انگلستان کو تین چار لاکھ پونڈ بطور نذرانہ پیش کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس مدت میں ہندوستان کی اس عجیب و غریب تجارت سے خدا جانے کتنے کروڑ پونڈ حاصل کر لیے ہوں گے، جب لاکھوں پونڈ نذرانہ پیش کرتی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کمپنی کو پرتگیزوں، ہالینڈیوں، فرانسیسیوں، جرمنوں وغیرہ سے مقابلہ کرنا پڑا اور ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ بارہا اپنے کاروبار تجارت بلکہ اپنے وجود کو بھی فنا کے گھاٹ اتر جانے کا خطرہ نظر آنے لگا۔

اس زمانہ میں کمپنی کے علاوہ انگریزوں کی دوسری جماعتیں بھی انفرادی یا اجتماعی طور پر ہندوستان میں تجارت کرتی تھیں۔ اس لیے کمپنی کو خوب کھل کر لوٹ کھسوٹ اور من مانی کاروائیوں میں پوری آزادی نہ تھی۔ آپس میں مخالفتیں اور روک ٹوک رہا کرتی تھیں۔ بالآخر ۱۷۰۰ء میں ان سبھوں کی ایک ہی جماعت بنا دی گئی جو کہ زیر سرپرستی حکومت انگلستان تجارت میں پیش قدمی اور انہماک کرتی رہی اور حکم ہو گیا کہ کوئی انگریز انفرادی یا اجتماعی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ تجارتی کاروبار ہندوستان میں نہ کرے۔

چنانچہ ۱۷۰۰ء سے کمپنی نے نیا مگر زوردار قدم اٹھایا۔ اسی لیے مشہور ماہر معاشیات انگریز سر ولیم ڈگبی ۱۷۰۰ء ہی سے پہلا دور بتلاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت تک کروڑوں اشرفیاں یہاں سے انگلستان کو لے جائی جا چکی تھیں۔ مگر ۱۷۰۰ء سے تجارتی لوٹ کھسوٹ نئے اور پرزور طریقہ پر جاری ہوئی اور ۱۷۵۷ء تک خالص تجارتی طور پر جاری رہی۔ اس وقت میں پرتگیز بالکل اور ڈچ تقریبا ختم ہو چکے تھے۔ اب کمپنی نے بالکل کھل کر کھیلنا شروع کیا اور اس قدر نفع کمایا کہ اس کی کوئی حد اور انتہا باقی نہ رہی۔

اس لوٹ کھسوٹ کی کیفیت کا اندازہ خود کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مندرجہ ذیل یادداشت سے ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ہمارے خیال میں یہ بڑی دولت جو ہم نے ہندوستانی تجارت سے حاصل کی ہے ظالمانہ اور جابرانہ دستور العمل سے مہیا ہوئی ہے، ایسا دستور العمل جس کی نظیر نہ کسی ملک میں ملتی ہے اور نہ کسی زمانے میں ملے گی۔[1]

کمپنی کے کارکنان میں بیشتر لوگ جرائم پیشہ ڈاکو، قاتل، چور، جعلساز، بدمعاش اور غیر شریف قسم کے ہوتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو وہاں سے بلایا جاتا تھا اور وہ انتہائی بربریت اور جبر و ظلم عمل میں لاتے تھے۔ چنانچہ مسٹر جیمس مل کے مقالہ سے تاریخ برٹش انڈیا میں منقول ہے کہ ۱۶۰۰ء میں جب کہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا، تو گورنمنٹ انگلستان کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا کہ تم اپنی مہم میں سر ایڈورڈ مائیکل بوردن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں ایک عجیب و غریب ریزولیوشن کی نقل بھیجی گئی جس کا مطلب حسب ذیل تھا:

> کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لیے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفاء کو نوکر رکھنے سے کمپنی کے عوام الناس حصہ دار شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔[2]

---

[1] تنظیم امر تسر، جلد ۶، شمارہ ۱۵، ۲۸ اگست ۱۹۲۸

[2] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص ۶۹

چنانچہ نواب کرناٹک کی مندرجہ ذیل تحریر اس ضمن میں کافی اہم ہے جو کہ انہوں نے کمپنی کے ڈائریکٹروں کو لکھا تھا:

> آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں۔ نہ آپ انہیں معقول تنخواہ دیتے ہیں۔ پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرائع کے یہ بے حساب کمائی کہاں سے آتی ہے۔ ہم اور آپ دونوں سمجھ سکتے ہیں۔[1]

مدراس کے بڑے پادری کی بھی وہ تحریر کافی اہم ہے جسے انہوں نے انگریز جرائم پیشہ رذیل اور شریر لوگوں سے تنگ آکر کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ۱۶۷۶ء میں لکھی تھی،

> آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظر میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں۔ جو لوگ آتے ہیں ان میں بعض قاتل ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو بھگا لے جانے کا کام کرنے والے اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادی کر لیتے ہیں۔[2]

غرض کہ کمپنی نے قصداً تمام کارکنان ایسے ہی کمینہ طبیعت، اوباش اور غیر شریف جمع کیے تھے جن کو کسی شرمناک اور انسانیت سوز کاروائی میں جھجھک اور رکاوٹ نہ ہوتی تھی اور اپنے مقاصد ملعونہ، لوٹ کھسوٹ اور زرکشی

---

[1] بحوالہ، ایضاً، ص، ۷۰

[2] بحوالہ، ایضاً، ص، ۷۱

میں نہایت آزادی سے بلاخوف وخطر ہر قسم کی کاروائی کرتے تھے، بہر حال ۱۷۵۷ء تک کمپنی کا یہ انسانیت سوز طریقۂ تجارت جابرانہ اور ظالمانہ طور پر جاری رہا جس سے ہندوستان کی عظیم الشان دولت کو چوس کر انگلستان لے جایا گیا۔

دوسرا دور تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر (۱۷۵۷ء تا ۱۸۳۲ء)

کمپنی کا دوسرا دور جس کی ابتداء بنگال کی جنگ یعنی نواب سراج الدولہ کی پلاسی کی لڑائی سے ہوتی ہے، یہ دور جو کہ جبر کا دور کا کہلاتا ہے، یہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۳۲ء تک کا زمانہ ہے، اس کی تفصیل نہایت ہی درد انگیز اور دہشت ناک ہے اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے کئی جلدوں کی ضرورت ہے، اس کی مختصر تمہید یہ ہے کہ کلکتہ میں بیٹھ کر انگریزوں نے ایک سازش کا سلسلہ شروع کیا جس میں غداران وطن میر جعفر اور امی چند شریک تھے۔ سازش کے تحت سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کے ذریعہ جنگ چھیڑ دی گئی اور پلاسی کے میدان میں دونوں لشکر بالمقابل آ گئے، سراج الدولہ کے چالیس ہزار پیادے اور پندرہ ہزار سوار انگریزوں کے صرف تین ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں تھے، لیکن انگریزون کی قوت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ فریب، دھوکہ، دغا اور سازش پر تھا، جن میں سراج الدولہ گھرا ہوا تھا اور باوجود نام نہاد کثیر جمعیت کے در حقیقت اکیلا اور بے یار و مددگار تھا۔ چنانچہ صبح کے آٹھ بجے سے دن کے بارہ بجے تک کل چار گھنٹہ میں اس تاریخی جنگ کا فیصلہ سراج الدولہ کے خلاف ہو گیا۔

انگریزوں کی طرف سے سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کو نمک حرامی کے صلہ میں مرشد آباد کی مسند دی گئی، اس جنگ نے ایک وسیع اور شاداب ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، انگریزوں کو سونے کی کان ہاتھ لگ گئی، میر جعفر کی طرف سے تین لاکھ پونڈ یعنی تیس لاکھ روپیہ کلائیو کو نذر کیا گیا اور کلکتہ کا جنوبی علاقہ اسے جاگیر میں دیا گیا، جس کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اسی طرح ساٹھ ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ کونسل کے ممبروں کو پیش کیا گیا، یہ تو ذاتی

انعامات تھے۔ کمپنی کے ہر خرچہ اور تاوان کے مطالبات ان سے الگ تھے جن کو اس وقت پورا کرنے کی گنجائش خزانہ میں نہ رہی تھی، اس لیے صرف نصف کی ادائیگی ہو سکی۔ ۲۴ پرگنہ کا علاقہ کمپنی کی جاگیر ٹھہری، بقول میکالے:

> کمپنی اور اس کے نوکروں پر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اسی لاکھ روپیہ دریا کے راستہ مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا، سو سے زیادہ کشتیاں تھیں، جھنڈیاں اڑ رہی تھیں اور باجا بجتا جاتا تھا، چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوش حال ہو گیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا تجارت چمک اٹھی، ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔[1]

اس جنگ کی کامیابی سے جو ۱۷۵۷ء میں ہوئی کمپنی کے خالص تجارتی دور کا خاتمہ ہو گیا جو ۱۶۰۸ء سے شروع ہو کر پورے ڈیڑھ سو سال تک رہا اور اب ایک وسیع ملک ہاتھ میں آجانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہوا، علاوہ اس مقدار کے جو میر جعفر سے حاصل کی گئی عام لوٹ کا بازار بھی گرم کیا گیا۔ چنانچہ لارڈ کلایو بنگال کی لوٹ کے بارے میں کہتا ہے:

> تین کروڑ انسانوں کو لوٹ کر کلکتہ میں عظیم الشان دولت بہت جلد جمع کر لی گئی تھی۔ ہندوستانی قدیم زمانوں میں معمولی معمولی نظام کی خرابی پر اپنے حاکموں کو برطرف کر دیا کرتے تھے۔ مگر انگریزی حکومت سنگدل سے سنگدل وحشی اور مستبد حکومتوں کی طرح ظالم اور سخت تھی۔ مزید برآں تمام تمدنی طاقتور ہتھیاروں سے مسلح تھی۔[2]

اس زمانہ میں کمپنی نے ایک اور عجیب و غریب نئی تجارت کی بنا ڈالی اور وہ تخت اور گدیوں کی تجارت تھی، محمد علی کو کرناٹک میں اور میر جعفر کو بنگال میں تخت دلانے سے یہ تجربہ ہوا تھا کہ سلطنت کے منتقل ہونے سے انگریزی

---

[1] بحوالہ، حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص، ۴۷

[2] تنظیم امرتسر، جلد ۶، شمارہ ۱۵، ۲۸ اگست ۱۹۲۸

خزانہ مالامال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میر جعفر کو ہٹا کر میر قاسم کو مسند پر بٹھایا گیا۔ میر قاسم نے بغاوت کی تو پھر میر جعفر سے سودا کر لیا گیا۔ اس کے بعد نجم الدولہ سے سودا کیا گیا۔ اس سوداگری سے انگریزوں نے جو نفع حاصل کیا اس کی مقدار پانچ کروڑ کے قریب ہوتی ہے۔

حکومت اور اس نئے عجیب طریقہ کی لوٹ کھسوٹ کی تجارت کے ساتھ ایک اور عجیب و غریب طریقہ اپنایا گیا، اس کا پس منظر یہ ہے کہ فرخ سیر بادشاہ دہلی کی لڑکی جل گئی اس کا علاج دہلی کے اطباء کے قابو میں نہیں آیا تو ڈاکٹر ہملٹن کو کمپنی نے پیش کیا، اتفاق ایسا پیش آیا کہ ڈاکٹر ہملٹن کا علاج کامیاب رہا اور لڑکی درست ہو گئی۔ فرخ سیر بہت خوش ہوا اس نے بادشاہان ہند کے حسب عادت اس کو زر و جواہر سے مالامال کرنا چاہا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کو لینے سے انکار کر دیا اور اس کے عوض میں یہ استدعاء کی کہ کمپنی کو اس ٹیکس سے جو تجارت پر لیا جاتا ہے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اہل دربار شاہی اس کے زہریلے نتائج تک نہ پہنچ سکے اور بادشاہ سے اس قسم کا فرمان جاری کرا دیا کہ کمپنی کے تمام کارکن تجارتی ٹیکس سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔ یہ حکم جاری ہونا تھا کہ انگریزوں نے تمام ملک میں اودھم مچا دی اور تاجروں کے تمام کاروبار بند ہو گئے اور طرح طرح سے انگریزوں نے ہر قسم کی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت کی کیفیت کا نقشہ مندرجہ ذیل تاریخی تحریر سے معلوم ہو گا۔

> پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کی حکومت اب برائے نام میر جعفر کی رہ گئی اور سلطنت پر درو بست قبضہ کمپنی کا ہو گیا۔ اس طرح ذمہ داری نواب کی رہی اور اختیارات کمپنی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس صورت حال میں کمپنی کو ناجائز مالی فائدے اٹھانے کا خوب موقعہ ملا جو اس کا اصلی مقدمہ تھا اور اس نادر موقعہ کے مل جانے سے کمپنی کے سینوں میں حرص و آز کے جذبات بہت مشتعل ہو گئے زر کشی اور اخاذی (لوٹ) کی لگن بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل ڈاکٹر ہملٹن فرخ سیر کا معالج رہ کر انگریزی مال کو تمام محصولوں سے مستثنیٰ کرا چکا تھا۔

> حالات سب سازگار جمع ہو گئے، اس لیے کمپنی کے ملازموں نے نجی تجارت شروع کر دی اور ایسی شروع کی کہ بنگال میں شاید ہی کوئی بڑی منڈی ہو گی جہاں گھی، پان، بانس، چاول، بھس وغیرہ کی خرید و فروخت انگریز نہ کرتے ہوں۔ دیسی سوداگر جنہیں سرکاری محصول بھی دینا پڑتے تھے، کمپنی کے مال کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ انگریز تاجروں سے خود نواب ڈرتا تھا۔ اس لیے اس کی پولیس اور اس کی کچہریاں ان کو سزا نہ دے سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے نام سے لوٹ شروع ہو گئی۔ انگریز سوداگر جس مال پر ہاتھ رکھ دیتے اس کو خریدار آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا اس لیے یہ لوگ اس مال کو من مانی قیمت پر خرید لیتے تھے اور اپنا مال نکالنا ہوتا تو جب تک کہ اس کی نکاسی نہ ہو جاتی دوسرے سوداگر دوکان بند رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔[1]

ان حالات سے مجبور ہو کر میر قاسم نے دیسی سوداگروں کو بھی محصول سے معاف کر دیا۔ اس سے انگریز بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ میر قاسم کو بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا اور پھر وہاں شجاع الدولہ والئ اودھ اور شاہ عالم کی مدد لے کر بنگال کا رخ کیا، تو انگریزوں سے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر شکست کھائی اور اس سے اگلے سال ۱۷۶۵ء میں الہ آباد کا مشہور صلح نامہ ہوا جس کی رو سے کمپنی کو بادشاہ دہلی کی طرف سے بنگال کا دیوان یعنی مال گزاری وصول کرنے والا افسر مقرر کر دیا گیا اور اس کے بدلے میں بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا۔ نواب بنگال کے ذاتی مصارف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لیے ایک رقم معین کر دی گئی۔ اور قرار پایا کہ ان دو مصارف کی منہائی کے بعد جو بچے وہ کمپنی کا ہو۔ اس معاہدہ کے وقت تک تو انگریز عمل دخل بے ضابطہ طور پر تھا۔ اب شاہی فرمان کی رو سے انگریزی قبضہ کے جواز کی سند مل گئی۔

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص، ۴۶

اس کے بعد کمپنی کے لیے ایک اور نیا طریقہ لوٹ کھسوٹ کا ہاتھ آگیا۔ زمین کا بندوبست اور اس کا لگان ٹھیکہ اور نیلام اس کی مال گزاری کا اضافہ یہ سب نئے نئے ذرائع پیدا ہو گئے۔ دیوانی ملنے کے بعد ہی اضافہ مالگزاری کیا گیا۔ اور پہلے لگان پر نوے فیصد یا اس سے زائد اضافہ کیا گیا جس سے کاشتکار بالکل تباہ ہو گئے اور کمپنی کے یہاں سونے کی بارش ہونے لگی۔ الحاصل اس تمام دور میں جس کی ابتداء جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے ہوتی ہے۔ جابرانہ طور پر طرح طرح سے دولت اور سرمایہ کی لوٹ جاری ہوئی اور بے شمار خزانے ہر طرف سے لٹ لٹ کر لندن میں پہنچنے لگے۔ کمپنی ایک طرف تو قسم قسم کی تجارت سے خوب ہاتھ پاؤں پھیلا کر لوٹتی تھی، دوسری طرف حکومت کے ذریعہ سے خوب من مانی لوٹ کھسوٹ کرتی تھی۔ بکسر کی فتح کے بعد لارڈ ویلزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی گورکھپور رو، ہیلکھنڈ جنوبی دو آبہ کے علاقوں پر قابض ہو گئی اور اس عہد میں کرناٹک کے نواب کو معزول اور ٹیپو سلطان کو شہید کر دینے کے بعد وہ تمام علاقے حاصل کر لیے گئے اور وہاں کے تمام خزانے لوٹ کر انگلستان میں پہنچا دیے گئے، یہ جابرانہ اور غیر آئینی طریقہ ۱۸۳۲ء تک برابر جاری رہا۔

تیسرا دور تسلط بذریعہ خوش معاملگی کا دکھلاوا (۱۸۳۳ء تا اخیر)

اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے، یہ دور ۱۸۳۳ء سے آخر تک قائم رہا۔ اس دور کو انگریزوں نے آئینی دور کہا ہے، اس دور میں مطیع اور فرماں بردار رعایا کو لوٹنے اور زائد سے زائد کھسوٹنے کے نئے نئے قوانین طرح طرح کے بنائے گئے جن میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اور انگریز اپنے مقاصد واغراض کے ماتحت اپنی آہنی قوت اور مضبوط شکنجہ کے بل بوتے پر گھمنڈ کر کے بغیر عدل وانصاف کے جو قانون چاہتے تھے بناتے تھے اور خوشنما الفاظ میں شائع کرتے رہتے تھے۔ محکوم رعایا کی خواہشوں اور ضرورتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ان سے زیادہ دولت چوستے رہنا اور ان کو دائمی غلامی میں جکڑ بند رکھنا انگریز کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ ہندوستانی راجاؤں کا ہمیشہ سے دستور تھا کہ اگر کوئی راجہ لاولد ہوتا تھا تو وہ اپنے خاندانی یا غیر خاندانی بچے کو اپنا متبنی قرار دیتا تھا اور وہ ریاست کا بعد میں حقیقی بیٹے کی طرح

مالک قرار دیا جاتا تھا، اس طرح کی متعدد ریاستیں ہندوستان میں موجود تھیں، ہندوستانی بادشاہ اور رجواڑے اور خود کمپنی کے آفیسر ہمیشہ سے اس کو تسلیم کرتے چلے آتے تھے مگر ہوس ملک گیری میں کمپنی نے یکبارگی اس طریقہ کو ناجائز قرار دے کر غیر متعبر ہونے کا اعلان کر دیا اور تقریبا پندرہ ریاستیں اپنے قبضہ میں کر لیا، اسی طرح بلا وجہ صوبۂ سندھ، صوبۂ اودھ اور صوبۂ پنجاب وغیرہ کو یکے بعد دیگرے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ الحاصل اس زمانہ میں ایسے ایسے طریقے عمل میں لائے جانے لگے کہ جن پر ملمع تو بہت خوبصورت ہوتا تھا اور در حقیقت لوٹ کھسوٹ پہلے سے زیادہ ہوتی تھی۔

اسی دور کے متلعق سر ولیم ڈگبی 'پروسپرس برٹش انڈیا' میں لکھتا ہے:

> مگر اس میں شبہ نہیں کہ آج ہندوستان اس سے زیادہ شرمناک طور پر لوٹا جا رہا ہے جتنا کہ اس سے پہلے کبھی لوٹا گیا تھا۔ ہماری ابتدائی حکومت کی باریک چابک اب آہنی زنجیر بن گئی ہے۔ کلائیو اور ہیسٹنگز کی لوٹ اس نکاس کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو روز افزوں ترقی کے ساتھ ایک ملک دوسرے ملک کا خون بہا کر مالا مال کر رہا ہے۔[1]

برطانوی حکمرانوں کے ان تینوں ادوار اور اصولوں کا جائزہ لیتے ہوتے ہوئے مسٹر آر بی دت کی تحریر سے استفادہ کرتے ہوئے سمت سرکار نے لکھا ہے:

> آر بی دت کی تصنیف انڈیا ٹوڈے میں جو کہ اپنی پہلی اشاعت کے چالیس سال بعد بھی ہندوستان کی نو آبادیاتی معیشت کے بہترین تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مارکس کے بعد سرسری بیانات کو انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان کے استحصال کے تین مرحلوں کے تناظر میں ایک نظریے کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ سے ۱۸۱۳ تک کا پہلا سوداگرانہ مرحلہ براہ راست لوٹ کھسوٹ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ دارانہ تجارت سے

---

[1] ولیم ڈگبی، پروسپرس برٹش انڈیا، بحوالہ، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ حسین احمد مدنی، ص، ۸۱

عبارت تھا۔اس اجارہ دارانہ تجارت کا طریقہ یہ تھا فاضل آمدنی سے ہندوستان خصوصاً بنگال کی تیار اشیاء کو من مانے اور سستے داموں خرید کر انگلینڈ نیز یورپ کے دوسرے ملکوں کو برآمد کر دیا جاتا تھا۔انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں تجارت کی ساری وضع ہی الٹ پلٹ ہو گئی اور ۱۸۱۳ سے ۱۸۵۸ تک کے برسوں میں آزاد تجارت پر مبنی صنعتی سرمایہ دارانہ استحصال کا ایک بالکل نیا دور سامنے آیا، جس کے نتیجے میں ہندوستان کو مانچسٹر کے کپڑوں کی ایک وسیع منڈی اور خام مال فراہم کرنے والے ملک کی حیثیت دے دی گئی اور ہندوستان کی روایتی دستکاریوں اور حرفوں کا گلہ گھونٹ دیا گیا، یہ وہ دور تھا جس میں کپاس پیدا کرنے والی زمین میں ہی کپاس کی بھرمار کر دی گئی تھی۔[1]

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی زرعی بربادی

زراعت کے متعلق بھی انگریزوں کی پالیسی نہایت اندوہ ناک اور دل خراش ہے۔انگریزوں سے پہلے کاشت کاروں سے مالگزاری چوتھ کی صورت میں وصول کی جاتی تھی۔ جس کی صورت یہ تھی کہ کھیت میں غلہ تیار ہونے پر حکومت کے افسر غلہ کو تولا کرتے تھے اور پیداوار کے تخمینہ پر چوتھائی غلہ یا اس کی قیمت حکومت کو دینا تھا،اس طرح اگر پیداوار اچھی ہوتی تھی تو حکومت اور کاشت کار اور زمین دار سب کو نفع ہوتا تھا اور اگر نہیں ہوتی تھی یا کم ہوتی تھی تو سب کو نقصان رہتا تھا۔ حکومت کاشت کار کے نفع اور نقصان میں یکساں طریقہ پر شریک رہتی تھی، مگر انگریزوں نے قبضہ پاتے ہی پختہ لگان کر دیا اور زمینوں پر نقد معین کر دیا۔ خواہ زمین میں پیداوار ہو یا نہ ہو، غلہ خواہ عمدہ قسم کا ہو یا خراب قسم کا، ہر حالت میں حکومت اپنی مقرر کردہ مقدار وصول کرنے لگی خواہ کاشتکار کے یہاں کچھ بھی پیدا نہ ہوا ہو۔ عدم وصول یابی پر کاشت کار کی قرقی کر لی جاتی تھی۔اس کے گھر کا سامان، عورتوں کے زیورات،اس کی زراعت کے

---

[1] سمت سرکار، جدید ہندوستان، ص، ۴۰

وسائل، بیل اور ہل وغیرہ نیلام کر دیے جاتے تھے جس کی بناء پر عام زراعت پیشہ انتہائی مفلوک الحالی میں مبتلا ہو گئے اور لگان پر زیادتی برابر جاری رہی۔

۱۸۱۷ء کے بعد سے جبری لگان کا طریقہ اختیار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۳ء میں لگان کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ پچاس لاکھ ہو گئی، حتی کہ ۱۸۷۵ء میں لگان کی مجموعی رقم چار کروڑ اسی لاکھ ہو گئی، ہندوستان میں ٹیکسوں کا ۸۰ فیصد زمینوں کے لگان سے وصول کیا جاتا تھا۔ گورنمنٹ متواتر زمیندار طبقے کو نظر انداز کرتی رہی جو حکومت اور کاشت کار کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کاشت کار سے اس کی پیداوار کا ۵۰ فیصد سے لے کر ۶۵ فیصد تک حکومت وصول کر لیتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے دوسرے ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے تھے، اس طرح تمام ٹیکسوں میں اسے اپنی پیداوار کا تقریباً ۷۵ فیصد دینا پڑتا تھا۔ ہندوستان میں کاشت کاروں پر بہت زیادہ بار پڑا ہوا تھا، اگر گھر کی آمدنی پر ۵ فیصد ٹیکس لگا دیا جاتا ہے تو ٹیکس دہندہ چیخ اٹھتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی حالت کس قدر ردی اور ناگفتہ بہ ہو گی جہاں پیداوار پر ۵ فیصد نہیں بلکہ ۷۵ فیصد ٹیکس لیا جاتا تھا۔ حکومت آئے دن شرح لگان پر نظر ثانی کرتی رہتی تاکہ ان کسانوں سے جو پہلے ہی بھاری بھاری ٹیکسوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوتے اگر ممکن ہو سکے تو ان کی جیب سے آخری پیسہ بھی حاصل کر لے۔

صوبۂ بنگال کا لگان نواب بنگال کے آخری عہد یعنی ۱۷۶۴ء میں اکیاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچ سو بیس روپیہ تھا مگر اضافہ کرتے کرتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۹۴ء میں دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ وصول کیا، اسی طرح ہر صوبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔

انگریزوں نے دیوانی کے اختیارات شہنشاہ دہلی سے حاصل کرتے ہی نہایت ظالمانہ حیثیت سے گرانبار اضافہ لگان میں جاری کر دیا تھا اور باوجودیکہ مختلف وجوہ سے لوگ قحط اور افلاس میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے مگر سنگدل انگریزوں کو رحم نہیں آتا اور دولت ومال کی ہوس میں لگان کا اضافہ غریب کسانوں پر لگاتار جاری کر رہے تھے۔

ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کے تین خاص وجوہ ہیں۔ اول مالگزاری کی زیادتی، مالگزاری اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصہ کو بھی ہضم کر لیتی تھی، مال گزاری اس طرح بڑھائی جاتی تھی کہ بعض مواضعات میں تو سو فیصد اور بعض خصوصی آراضیات پر ہزار فیصد تک پہنچ جاتی تھی۔ دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہوا کہ لگان اور مال گزاری کی وصولی کا طریقہ نہایت سخت بنایا گیا جس کی رو سے ایک مقررہ سالانہ رقم وقت معینہ پر وصول کی جاتی تھی اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا اس کا بوجھ کاشت کار پر ڈالا جاتا۔ یہ بوجھ اتنا زیادہ ہوتا کہ کاشت کار اس کو برداشت نہیں کر پاتا اور اس کو سودی قرضہ لینا پڑتا تھا۔ تیسرا سبب یہ ہوا کہ یورپ کے طرز پر قرضہ وصول کرنے کے لیے عدالتیں قائم کر دی گئیں جن کی وجہ سے قرض خواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی اور اس کو اس قابل بنا دیتی کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنی درجہ تک پہنچا دے۔

یہ چند شہادتیں بطور اختصار ہم نے پیش کی ہیں جن سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سنگ دل اور خودغرض برطانویوں نے کس طرح ہندوستان کے غریب کاشت کاروں کو بے رحمی سے برباد کیا اور کاشت کاری کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ لگان کے ثقیل بوجھ اور وصولی کے انتہائی جابرانہ طریقہ کی وجہ سے کسان ہر سال زمین جوتنے پر مجبور تھا، زمین کو لگاتار بوتا تھا اور اپنی گلو خلاصی کی فکر کرتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کی زمین انتہائی درجہ میں کمزور ہو گئی اور پیداوار میں بہت زیادہ کمی ہو گئی۔

قدیم تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان کی پیداوار کسی زرخیز سے زرخیز ملک سے کم نہ تھی بلکہ دنیا میں کوئی ملک غذائیات کی پیداوار میں ہندوستان کی برابری نہیں کر سکتا تھا مگر انگریزی عہد حکومت میں پیداوار نہایت گھٹ گئی جس کی وجہ بادشاہ کی بدنیتی اور خود غرضی تھی، جو کہ رعایا کی بہبودی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر امر میں اس کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو لوٹنا اور اپنی قوم اور ملک کی پرورش کرنا اور نفع پہنچانا تھا۔ دوسری وجہ کاشت کاری اور پیداوار کے ذرائع اور وسائل میں کمی اور ناپیدگی تھی۔ کاشت کار اور زمیندار پر مختلف قسم کی مالیات کا اتنا بوجھ ڈال دیا گیا تھا کہ وہ کھاد، آلات زراعت، بیل، جانوروں کا چارہ، زمین چھوڑے رکھنا، مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ لگانا، آبپاشی حاصل کرنا اور اس قسم کی دوسری سہولتوں کو پوری طرح مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً زراعت کے جانوروں کی انتہائی گرانی اور ان کے چارہ کی کمی اور مہنگائی کاشتکاروں کے لیے ہر ہر قدم پر سخت رکاوٹ پیدا کرتی تھی۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان جو کہ زراعتی صلاحیت کی حیثیت سے تمام دنیا میں امتیازی شان والا شمار کیا جاتا تھا، انگریزی دور حکومت میں کس قدر پست کر دیا گیا۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی صنعتی و تجارتی بربادی

اٹھارویں صدی کے نصف تک ہندوستانی مصنوعات بلا تکلف انگلستان جاتی رہیں۔ لیکن انگریز جیسی معاملہ فہم اور وقت شناس قوم فوراً تاڑ گئی کہ اگر یہی لیل و نہار رہے اور ہندوستانی مصنوعات یوں ہی بلا روک ٹوک بکثرت ملک میں آتی رہیں تو ملکی صنعت کا پنپنا محال ہے، بلکہ رہی سہی کسر جو کچھ باقی ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی، اور ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کا دست نگر بننا پڑے گا۔ عام مرفہ الحالی اور ملکی ترقی پر صنعت و حرفت کے زوال سے جو تباہ کن اثر پڑتا وہ اس بیدار مغز اور مآل اندیش قوم سے مخفی نہ تھا، چنانچہ جوں ہی دیکھا کہ ہندوستانی مصنوعات کا ملک پر تسلط بڑھتا جا رہا ہے فوراً چونک اٹھی اور ہر قسم کی پیش بندی شروع کر دی۔ سوتی، اونی، ریشمی، زریں غرضیکہ ہر قسم کے کپڑے تیار کرنے میں ہندوستان نے وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اگر صریح ثبوت موجود نہ ہوتے تو اس کا یقین کرنا دشوار ہوتا اور

جامہ بافی کا ملک بھر میں اس قدر کاروبار پھیلا ہوا تھا کہ زراعت کے مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا۔ نہ صرف غرباء اور متوسط الحال لوگوں کی مستورات بوقت فرصت سوت کات کر نفع اٹھاتی تھیں بلکہ اچھے اچھے گھر کی بہو اور بیٹیاں چکن اور کشیدے کاڑھنا اور طرح طرح کی سوزن کاری باعث فخر و امتیاز خیال کرتی تھیں، کروڑہا بندگان خدا کی روزی اسی صنعت و حرفت سے وابستہ تھی۔ دیگر ممالک کو کپڑا بھی بکثرت بھیجا جاتا تھا۔

چنانچہ ہندوستان میں پارچہ بافی کا عروج دیکھ کر انگلستان والوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور بنظر دور اندیشی رقابت کے جوش میں انہوں نے سب سے اول ہندوستان کی اسی صنعت پر حملہ کیا اور اس کا ایسا اثر پڑا کہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی پارچہ بافوں کا حال زار و نزار ہو گیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ولایت کے کپڑا بننے والوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ نہ کپڑوں کی عمدگی میں ہندوستان والوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ اس کی ارزانی میں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی کپڑا انگلستان میں خود وہاں کے کپڑے پر غلبہ پا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ انگلستان کی یہ صنعت کسی روز بالکل بے جان ہو جائے گی تو انہوں نے شور مچانا شروع کیا۔ حکومت اپنی قوم کے ہاتھ میں تھی، حکمراں طبقہ مستعد اور بیدار مغز تھا، صنعت کاروں کی معروضات پر فورا توجہ کی، ان کی شکایات کو معقول اور بجا پا کر اختیارات حکومت سے کام لیا اور نہ صرف ملک کو تباہی سے بچا لیا بلکہ مستقل عظمت و طاقت کی بنیاد قائم کر دی۔ یعنی جامہ بافی کی صنعت کو بذریعہ قانون مامون کر دیا اور کون نہیں جانتا کہ انگلستان کی مرفہ الحالی و اقتدار کو گنگا شائر، مانچسٹر اور لورپول کے کپڑے کی ملوں نے کس قدر سیراب و شاداب کر دیا۔

۱۷ مارچ ۱۷۶۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولایت سے اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے نام ایک عام خط بھیجا جس تحریر تھا کہ ہر طرح سے بنگال میں خام ریشم کی پیداوار اور بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ریشمی کپڑوں کی تیاری کم کرنی بلکہ روکنی چاہیے، تاکہ خام ریشم ہندوستان سے ولایت آئے اور ریشمی کپڑا یہاں سے تیار

ہو کر ہندوستان جائے۔اس غرض کو پورا کرنے کا ایک یہ طریقہ بھی بتایا گیا تھا کہ کپڑا بننے والوں کو کسی نہ کسی طرح خود کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بطور خود کام کرنے سے ان کو روکا جائے تاکہ سارا کاروبار کمپنی کے ہاتھ میں آجائے اور وہ اس میں جیسی ردوبدل مناسب سمجھیں، بآسانی کر سکیں۔

خلاصہً کلام یہ ہے کہ ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے مٹانے کے لیے تین ڈپلومیٹک طریقے اختیار کیے گئے،اول یہ کہ ہندوستانی کاریگروں کو صنعت سے روکا جائے،دوم یہ ہندوستان کے مال کو انگلستان میں داخل نہ ہونے دیا جائے، سوم یہ کہ اپنی مصنوعات کو ہندوستان میں ٹھونسا جائے اور اس کو اس قدر ارزاں کر دیا جائے کہ ہندوستانی صنعت گھٹنے ٹیک کر فنا ہو جائے۔انگریز ڈپلومیٹوں نے ہندوستان کے ساتھ تینوں طریقے نہایت معصومانہ انداز میں اختیار کیے جن کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

انگریزوں کی ان پالیسیوں کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ ریشم بننے والے کاریگر اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے،اگر اب وہ بطور خود کام کرنا چاہتے بھی تو ان کو اس سے منع کیا جاتا اور اگر نہ مانتے تو سرکار ان کو سخت سزا دیتی اور بطور خود کام کرنے کی قطعا اجازت نہ دیتی۔اس بندش کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ اولا ریشمی کپڑے کی پیداوار اپنے قابو میں کر کے حسب ہدایات اس کی مقدار گھٹائی جائے،ثانیا جس قدر کپڑا بھی تیار کرایا جائے منمانی اجرت دے کر ارزاں تیار کرایا جائے۔ریشمی کپڑوں کی خوبی اور نفاست نے دنیا کو گرویدہ بنا رکھا تھا،وہ یا تو تیار ہی نہ ہوں یا اگر ہوں تو ہندوستانیوں کو نفع واجبی حاصل نہ ہو۔اس طرح مجبور کرنے کے لیے کاریگروں کے ساتھ جو معاملے کیے گئے ان پر مندرجہ ذیل اقتباسات سے روشنی پڑتی ہے:

سر تھامس منرو ۱۸۱۳ء پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے کہتا ہے:

ملازمان کمپنی نے خاص خاص نور بافوں کو ایک عمارت بارہ محل میں جمع کر کے ان پر پہرہ بٹھا دیا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ انہوں نے معاہدہ نہ کیا کہ وہ سوائے کمپنی کے اپنا مال کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے۔ جب کبھی نرخ پر نور بافوں کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کمپنی کی ایک کمیٹی اپنی رائے کے موافق نرخ قرار دیتی اور نور بافوں کو قبول کرنا پڑتا۔ ان کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی، جس کی ادائیگی سے ان کو عمر بھر سبکدوش ہونا محال ہوتا۔ اگر کوئی نور باف معاہدہ کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کی نگرانی کے واسطے ایک کوتوال تعینات کر دیا جاتا تھا جس کا طلبانہ ایک آنہ روز اسی نور باف سے وصول کیا جاتا تھا۔ کوتوال کے پاس ایک ڈنڈا بھی ہوتا تھا جس سے وہ بلا تکلف تنبیہ الغافلین کا کام لے سکتا تھا اور لیتا تھا، مزید براں نور بافوں پر جرمانہ کیا جاتا تھا جو کہ ان کے تانبے پیتل کے برتن نیلام کرنے سے وصول ہوتا تھا، اس طرح سے کپڑا بننے والی جماعت بالکل کمپنی کے نیچے میں دبی رہتی تھی۔ [1]

ہندوستان میں انگلستان کی مصنوعات کو جو کہ مشینوں کے ذریعہ سے تیار کی گئی تھیں، نہایت کثرت سے ٹھونسا گیا اور ان کی درآمد پر کوئی ٹیکس نہیں لیا گیا۔ اور اگر لگایا بھی گیا تو اس قدر کم لگایا گیا کہ اس سے دست کاروں کے ہاتھ سے بنائی گئی مصنوعات ارزاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں دست کار بھوک اور مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے ملک عدم کو چل بسے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں دست کار صناعی چھوڑ کر زراعت یا دوسرے پیشوں پر مجبور ہو گئے اور بالجبر یہ صنعتی اور زراعتی ملک محض زراعتی بنا دیا گیا۔

انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانی صنعت و تجارت کی بربادی کا جائزہ لیتے ہوئے برج کشور نے لکھا ہے"

برطانوی صنعتی نظام کو بہت بڑے تجارتی پھیلاؤ کی ضرورت تھی، نئی منڈیاں تلاش کرنا اور ان کو حاصل کرنا ہی اب ان کا مقصد تھا، حکومت برطانیہ کے تحت جو علاقے تھے وہاں سب

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص، ۱۱۱

سے پہلے اسی پروگرام پر عمل کیا گیا، ہندوستان بہت بڑا ملک ہونے اور معاشی طور سے مالا مال ہونے کی وجہ سے یہاں بہت آسانی سے یہ مقصد حاصل ہو گیا، پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی پارلیمنٹ نے انتہائی خود غرضانہ تجارتی پالیسیوں کو اپنایا اور ۱۸ ویں صدی کے بڑے بڑے تاجروں کو نکال باہر کیا انھوں نے ہندوستانی اشیاء سے لوگوں کو بدل کر دیا تاکہ ان کا اپنا مال زیادہ فروخت ہو اور ہندوستان کو خام مال پیدا کرنے والا ملک بنا دینے کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح ہندوستان کا خام مال انگلینڈ کے کارخانوں اور صنعتوں کے لیے جانے لگا اور وہاں سے تیار مال یہاں آنے لگا۔ ذرائع آمد و رفت اور باربرداری کے بہتر ذریعوں کی بدولت یہ ممکن ہو سکا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے اور ریشمی کپڑے پر انگلینڈ میں بھاری درآمدی ڈیوٹی لگا دی گئی جب کہ برطانوی چیزیں ہندوستان میں ٹیکس کے بغیر ہی درآمد ہوتی رہیں یا برائے نام درآمدی محصول لگایا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جب بجلی سے چلنے والے کرگھے ہندوستان میں استعمال ہونے لگے تو سوتی کپڑے پر ایکسائز ڈیوٹی لگا دی گئی جس کی وجہ سے ہندوستانی کپڑا چین اور جاپان کی منڈیوں میں مقابلے میں نہیں ٹھہر سکا، کیوں کہ اس کی قیمت دوسرے ملکوں کے کپڑوں کی قیمت کے مقابلے میں بڑھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ بھاپ سے چلنے والے نئے ہندوستانی ملوں کو ختم کر دیا جائے اور برطانوی تجارتی مفادات کو فروغ دیا جائے۔[1]

مذکورہ بالا شہادتوں اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو مٹانے کے لیے نہایت وحشیانہ مظالم اور تعدیاں کی ہیں جن کی بناء پر صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہو کر صنعت و حرفت چھوڑ دی، ہندوستانی دست کاری اور تجارت کے برباد ہونے کی وجہ سے دست کار اور تجارت پیشہ لوگوں کے اندر انتہائی

[1] برج کشور، ہندوستانی معیشت، ص، ۲۰

افلاس جا گزیں ہو گیا۔ کروڑوں آدمی بھوک سے مر گئے، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ایک صدی کے اندر ہندوستان میں ۳۱ قحط واقع ہوئے اور چار کروڑ سے زیادہ لوگ موت کی نذر ہو گئے۔ لاکھوں نفوس اخلاقی جرائم، ڈاکہ اور چوری وغیرہ میں مبتلا ہو گئے اور کروڑوں نفوس زراعت پر گزران کرنے لگے، دست کاری روز بروز کم ہوتی گئی اور زراعت پیشہ لوگ بڑھنے لگے، پیداوار میں کمی کی وجہ سے روز بروز غلہ کی گرانی بڑھتی گئی، بڑے بڑے شہر اجڑ گئے، دیہات آبادی بڑھ گئی کیونکہ زراعت کے لیے مزارع کے قریب رہنا ضروری ہے۔ دیہاتی زندگی کی وجہ سے جہالت بڑھ گئی کیونکہ دیہات میں تعلیمی انتظام نہیں تھا۔

انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے صدیوں قبل ہندوستانی معیشت اور تہذیب کافی ترقی یافتہ تھی، اگرچہ یہاں کی آبادی کا سب سے بڑا پیشہ زراعت تھا، پھر بھی ہندوستانی دست کاریوں کو غیر ملکی منڈیوں میں ان کی بہتر کوالٹی کی بدولت خوب شہرت حاصل ہوئی تھی۔ خاص طور سے ہندوستان اپنے سوتی اور ریشمی کپڑے، فولاد، سنگ تراشی، سنگ مرمر کے کام، زیورات اور دھاتوں کے تار وغیرہ کے لئے کافی مشہور تھا۔ یہ دست کاریاں نہ صرف مقامی ضرورت کو پورا کرتی تھیں بلکہ مغربی یورپ کے ملکوں کی منڈیوں میں بھی خوب فروخت ہوتی تھیں۔

صنعتی انقلاب سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی دست کاریوں کو یورپ کے ملکوں میں فروخت کر کے خوب نفع کماتی تھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد صورت حال اس کے برعکس ہو گئی، اب برطانوی تیار شدہ مال ہندوستانی منڈیوں میں فروخت ہونے لگا اور ہندوستان کا سستا خام مال برطانوی صنعتوں کے لئے خریدا جانے لگا اور برطانوی آبادی کے لئے یہاں سے اشیائے خوردنی جانے لگیں۔ صنعتی انقلاب نے انگلستان میں معاشی قوتوں اور ہندوستانی غیر ملکی تجارت کے طریقے کو بدل دیا۔

قومی دولت کا اخراج:

ہندوستان کو نہ صرف تیزی کے ساتھ غیر صنعتی ملک بنایا گیا، بلکہ یہاں کی دولت کو خاصی مقدار میں باہر لے جایا گیا، شروع میں ہندوستانی محصول سے حاصل شدہ روپیے سے ہندوستانی مصنوعات خریدی گئیں اور ان کو یورپ کی منڈیوں میں زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کیا گیا، منافع کی بچی رقم برطانیہ میں جمع ہو جاتی، اس سے برطانوی باشندوں میں سونے کی خواہش بڑھ گئی، اس لالچ میں انہوں نے برصغیر ہند میں لوٹ کھسوٹ کے نئے نئے طریقے نکالے۔ بنگال جو ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال علاقہ تھا اس پالیسی کا سب سے پہلے شکار ہوا، زراعت پر غیر منصفانہ ٹیکس لگایا گیا اور اس کو بڑی بے دردی سے وصول کیا جانے لگا، ۱۷۹۳ سے ۱۸۸۲ کے درمیانی دور میں نوے فیصدی شرح کے حساب سے زمین ٹیکس لگا دیا گیا اور شمالی ہندوستان میں ٹیکس اسی فیصدی شرح سے زیادہ تھا، بمبئی اور مدراس میں زمین ٹیکس کسانوں سے براہ راست وصول کیا جاتا تھا اور اس کی شرحوں میں ہر تیس برس کے بعد تبدیلی کر دی جاتی تھی، جب کہ بنگال میں یہ مستقل طور پر طے کر دیا گیا تھا، کسانوں کے پاس ٹیکس ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا وہ مشکل سے کھیتوں پر محنت اور مزدوری کے معاوضے کے برابر بھی نہیں ہوتا تھا، تقریباً تمام ٹیکسوں کی رقم انگلینڈ میں ہی جمع کر دی جاتی تھی، دوسرے دولت کا اخراج وہ سود تھا جو ہندوستان کو پبلک ڈیٹ یا عوامی قرضوں پر ادا کرنا ہوتا تھا، حکومت برطانیہ نے جو قیمت ایسٹ انڈیا کمپنی کو دی تھی اس معاوضے کی یہ رقم ہندوستان پر قرض تسلیم کی گئی تھی۔ وہ ہندوستان کو ادا کرنی تھی۔ اس کی ادائیگی محصولوں سے حاصل کیے ہوئے سرمایے سے کی گئی۔ ۱۸۵۷ء میں یہ قرض پانچ کروڑ دس لاکھ پونڈ تھا جو بڑھ کر ۱۹۰۱ میں بیس کروڑ پونڈ ہو گیا۔

ہندوستان برطانیہ کو انتظام حکومت کے خرچ کے لئے ہوم چارجز کے نام پر بہت بڑی رقم ادا کرتا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ رقم تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ سالانہ تھی۔ ہندوستان میں انتظامی امور پر تعینات انگریز

افسران کی تنخواہوں پر ایک کروڑ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ ہندوستان کی قومی آمدنی کا اس طرح آدھا حصہ ملک سے باہر چلا جاتا تھا۔

شہروں کی ترقی اور زوال:

نئے کارخانے قائم ہونے کی وجہ سے پرانے شہروں اور تجارتی مراکز نے اپنی اہمیت کھو دی۔ جو شہر دریاؤں اور سڑکوں کے ذرائع آمد ورفت اور باربرداری کی وجہ سے زندہ تھے وہ اس وقت گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ تجارتی راستے بدل گئے اور ریل گاڑیوں نے دریائی راستوں اور سڑکوں کی جگہ لے لی۔ مرزاپور، پٹنہ، ساگر وغیرہ ایسے ہی شہر ہیں۔ شہری دست کاریوں میں کمی آنے کی وجہ سے ڈھاکہ، مرشد آباد اور تنجور وغیرہ شہروں کی آبادی میں بھی کمی آئی اور ان کی پہلی سی ساکھ ختم ہو گئی۔ گیا اور بنارس جیسے مذہبی اہمیت کے مقدس شہروں نے بھی اپنی اہمیت کھو دی، کیوں کہ ان جگہوں کی پرانی حرفتوں کی مصنوعات کی طلب کم ہو گئی، قدیم شہروں کی اہمیت وبائی بیماریوں کی وجہ سے بھی کم ہو گئی، لوگ محفوظ جگہوں پر چلے گئے اور اس طرح پرانے شہروں کی آبادی میں کمی آنے لگی۔

صنعتی دور کے آغاز کے نتیجے میں ابھرنے والے شہروں میں کلکتہ، بمبئی، مدراس اور جزیرہ نمائے ہند کے اندرونی علاقوں میں واقع شہر کانپور اور احمد آباد مشہور ہیں جبکہ ڈھاکہ، مرشد آباد، لکھنؤ، تنجور وغیرہ جیسے کئی مشہور قدیم شہر جنھیں مسلم دور حکومت میں خاصی شہرت حاصل تھی نہ صرف اپنی اہمیت کھو بیٹھے بلکہ ان میں بسنے والے کاریگروں کی تعداد بھی گھٹ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی قدیم دستکاری صنعتیں جن کی ماہرانہ کاریگری میں مسلمانوں نے ید طولی حاصل کیا تھا زوال پزیر ہو گئیں، مثلاً ڈھاکہ جو کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت والا ایسا شہر تھا جسے بنگال کے نوابوں کا دارالخلافہ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، اپنی ململ کی صنعت کے لئے چہار دانگ عالم میں مشہور تھا۔ لیکن ان

دنوں یہ شہر بھی بڑی سرعت کے ساتھ تنزل پزیر ہوا۔یہی داستان مرشد آباد، لکھنؤاور دیگر قدیم شہروں کی بھی ہے جو مسلم دور حکومت میں صرف دستکاری کی صنعتوں کے معاملے میں بلکہ تہذیبی امور میں بھی اپنے بام عروج پر تھے۔

ریل گاڑیوں کازمانہ

برطانوی تاجروں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے اندرونی حصے میں ان کے مال کی کھپت آسانی سے ہو سکتی ہے، اگر ریلوں کا جال بچھادیا جائے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سیاسی دباؤ سے بھی کام لیا۔۱۸۴۵میں دو ریلوے کمپنیاں قائم ہوئیں جن کے نام ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پیننسولر ریلوے کمپنی تھے۔ حکومت ہند نے ان کمپنیوں کو یہ یقین دلایا کہ انہیں ریلوں پر لگائے سرمایے پر پانچ فیصدی نفع ضرور ملے گا۔اگر انہیں اس سے کم نفع ہو تو حکومت اپنے خزانے سے اسے پورا کرے گی۔اس گارنٹی کا اثر یہ ہوا کہ ریلوے کمپنیوں نے روپیہ غیر ضروری طور پر خرچ کیا۔ دنیا میں ریلوے کی تاریخ میں اس طرح کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ۱۸۷۳تک ضرورت کی حد تک ریلوے کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی بھاری خرچ ہوتے رہے، ملک کے ان علاقوں میں بھی ریلیں چلائی جانے لگیں جہاں ان کی اس وقت ضرورت نہیں تھی۔اور سچ تو یہ ہے کہ یہ علاقے ریلوے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔۱۹۰۱میں ۲۵۳۷۳ میل لمبی ریل کی پٹریاں ۲۲۶۸۰۰۰۰۰ پونڈ خرچ کر کے بچھائی گئیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں ریلوے کی ترقی کے لئے بہت خواہش مند تھی، چاہے اس کی لاگت منافع سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت نے بار بار برطانیہ کی پرائیوٹ کمپنیوں کو ریلوں کی تعمیر میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ کمپنیوں کے سرمایہ پر کم سے کم سود دینے کا وعدہ بھی کیا۔اور اس تمام سرمایے کی واپسی کی ضمانت بھی دی جو وہ لگا رہے تھے۔اس سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے اندرونی علاقوں تک پہنچا جائے،تاکہ برطانوی پیداکاروں اور صنعت کاروں کے لئے نئی منڈیاں مہیا ہو سکیں۔ لیکن یہ مقصد دریاؤں اور بحری راستوں سے بھی

حاصل ہو سکتا تھا جو پہلے سے ہی موجود تھے۔ دراصل برطانوی باشندوں کو ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر کا تو تجربہ تھا، مگر وہ نہریں تعمیر کرنا نہیں جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ریلوں کی تعمیر سے ان کا ایک ذاتی فائدہ بھی تھا، اس مفاد کے تحت وہ ریلوں کی تعمیر پر لگائے ہوئے سرمایے سے حاصل شدہ نفع کو اپنے انجینیرنگ اداروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوے کی ترقی پر بہت دھیان دیا گیا اور سرمایہ کاری کی گئی۔ اس لئے ریلوے کی ترقی اس وقت کی معیشت کی ضرورت سے زیادہ ہو گئی۔

برطانوی سیاسی و معاشی پالیسی اور اقدام کے خلاف اودھ پنچ کا مزاحمتی کردار

نو آبادیاتی ہندوستان میں انگریزوں نے تہذیبی و سماجی اعتبار سے تو ہندوستانی طرز معاشرت کو برباد کیا ہی لیکن برطانوی حکومت نے یہاں کی معیشت کو جس طرح برباد کیا اور یہاں کے مال و دولت کو جس طرح بے دریغ خرچ کر کے ملک کو کنگال بنا دیا، ہندوستانی تاریخ میں اس سے قبل ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ جب کہ اس سے پہلے بھی بہت سے غیر ملکی حکمرانوں نے یہاں بادشاہت کی ہے، لیکن ان بادشاہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا اور یہیں کے ہو کر رہنے کا قصد کر لیا جس کے نتیجے میں انہوں نے ملک کے مال و دولت کو ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی ترقی کے لئے استعمال کیا۔ جب کہ انگریزوں نے ہندوستان کو صرف ایک ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا اور یہاں سے مال و زر کی منتقلی کا غیر منصفانہ سلسلہ جاری رکھا، یہاں کے باشندوں کو مصائب و آلام برداشت کرنے پڑے، ہندوستانی معیشت زبردست تباہ حالی کا شکار ہو گئی جس کے نتیجے میں ملک کے باشندے فاقہ کشی کا شکار ہوتے گئے اور یہ متعصب حکمراں عیش و آرام اور عیاشی کی زندگی گزارتے رہے۔

برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار باقی رکھنے اور یہاں کی دولت و صنعت کو لوٹ کر اپنے ملک کو مالا مال کرنے کے لیے مختلف حربے اختیار کیے، اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے کسی بھی طرح کا

ظالمانہ اور وحشیانہ طریقہ اپنانے سے گریز نہیں کیا۔ انگریزوں کے ذریعہ کی جانے والی اس انسانیت سوز ظالمانہ کارروائی اور لوٹ کھسوٹ کی ہندوستانی باشندوں نے مختلف انداز میں مخالفت کی۔ سماج کے ہر طبقہ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور جانی اور مالی قربانی پیش کر کے اپنے ملک کو انگریزوں کے استبدادی چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اردو اخبارات نے خاص طور سے اس میدان میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

اس ضمن میں اودھ پنچ نے انگریزوں کے رعب و دبدبہ اور ظلم و زیادتی سے بے پرواہ ہو کر صحافتی دیانت داری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے خود کو اس کام کے لیے وقف کر دیا، ہندوستانی معیشت کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے لئے انگریز حکمرانوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کی حکومتی پالیسیوں پر جہاں اودھ پنچ نے کڑی تنقید کی وہیں سیاسی مسائل اور حکومتی معاملات پر اظہار رائے اور تبصرہ کے معاملے میں بھی نہایت جرأت مند واقع ہوا۔ انگریز حکمرانوں اور دیسی راجاؤں و نوابوں کی خبر لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین اور دیگر نامہ نگار سیاسی اعتبار سے باشعور تھے اور ان حکمرانوں کے سیاسی داؤ پیچ اور حکومتی مصالح کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس اخبار کے ذریعہ انگریزوں کی استحصالی تدبیروں کو اپنے مخصوص طنز و مزاح کے انداز میں ہندوستانی باشندوں کے سامنے واضح انداز میں پیش کیا۔

منشور محمدی جو بنگلور سے منشی محمد شریف کے ہاتھوں ۱۸۷۶ء میں جاری ہوا تھا، اس کا بنیادی مقصد تو انگریز مشنریوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے دینی و مذہبی عقائد پر حملہ کا دفاع تھا، لکین ساتھ ہی ساتھ نو آبادیاتی ہندوستان میں باشندگان ہند کے ساتھ انگریزوں کے ذریعہ کئے جانے والے برتاؤ اور عوام مخالف پالیسیوں کا بھی پردہ فاش کرتا تھا، چنانچہ ۱۶/اگست ۱۸۸۶ء کے شمارہ میں اس اخبار نے انگریزوں کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کا حال بیان کیا ہے، اس وقت مصر کو بھی انگریزوں نے اپنی غلامی کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا چنانچہ درج ذیل اقتباس سے اس وقت کے مصر اور ہندوستانی نو آبادیات کا حال ہمیں معلوم ہوتا ہے:

مصر کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے مختلف عہدوں اور خدمتوں پر ممالک غیر کے ۷ ۳/ہزار ۲ سو/۱۶/اشخاص ماموروفائز ہیں،ان میں زیادہ تر انگریز ہیں جن کی تعداد ۳/ ہزار ۴/ سو ۲۰/ ہے، ان کے بعد فرانس، آسٹریلیا، جرمنی، یونان، بلجیم، روس، امریکہ، بلگیریا، ہالینڈ اور ڈنمارک وغیرہ ممالک کے باشندے ہیں، جس ملک کا خون ممالک غیر کی اس قدر جونکیں چوس رہی ہوں اس کی زندگی کا خدا حافظ ہے، ہندوستان کی بھی یہی حالت ہے، جس قدر بڑے اور منتخر عہدے ہیں، سب خوش قسمت انگریزوں ہی کو نصیب ہیں، ہندوستان کو بجز افلاس اور مصیبت کے کچھ نہیں ملتا، افسوس جو لوگ ہندوستان سے ہزاروں کوس دور اور سینکڑوں دریا پار اس کے نام نامی اور شکل و ہیئت سے بھی ناواقف ہیں وہ تو اس کے روپیہ، پیداوار (جان مال) سے پرورش پاتے اور چین اڑاتے ہیں اور جنھوں نے آغوش ہند میں پرورش پائی، اس کے آب و گل سے بنے، جو اہل وطن و فرزندان ہند ہیں اور بیچارے مسافرت تو درکنار اپنے ہی وطن میں بھوکوں مرتے ہیں، کوئی نہیں پوچھتا۔ اگر پوچھے بھی گئے تو ٹکے کے دس دس، علاقہ ضبط، جائداد قرق، روزگار عنقا، ملازمت غائب، ملکیت سے بے دخل، صنعت کو کوئی نہیں پوچھتا، حرفت کا پتہ نہیں، کوئی مزدور البتہ پوچھا جاتا ہے وہ بھی صاحب بہادر کا پنکھا قلی، بیرا، خانساماں، حمال یا شملہ پر لیڈی صاحب لوگوں کی بگھی کھینچنے کے لئے گھوڑوں کی جگہ، بس اور مفلسی و فاقہ مستی کے حوالے، عبرت، افسوس، عبرت۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ خود کو مہذب کہلانے والے تعلیم یافتہ انگریزوں اور ہندوستان کی ترقی کا نعرہ دینے والے حکمرانوں کا ہندوستان اور اس کے باشندوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا۔ اپنے ہی ملک میں اہل ہند کے ساتھ کس طرح جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا تھا اور ہندوستانیوں کو معاشی و تعلیمی ترقی سے دور رکھنے کے لئے انگریزوں

[1] بحوالہ: امداد صابری، روح صحافت، ص ۴۱

نے کس طرح کی منظم ظالمانہ وشاطرانہ چالیں چلیں۔ ہندوستانی معیشت کو برباد کرنے اور ہندوستان سے مال ودولت کو اپنے ملک منتقل کرنے کے جو حربے انگریزوں نے استعمال کئے ان پر بھی اس اخبار نے مختصر روشنی ڈالی ہے:

> ہندوستان کا سولہ کروڑ روپیہ ۲۵/ہزار انگریزوں کی جیب میں بطور تنخواہ داخل ہوتا ہے، چار کروڑ بقدرے تجارت یہاں سے جاتا ہے، لیکن ۱۶/ کروڑ ہی نہیں ہے جو تنخواہوں کی صورت میں انگریزی جیبوں میں جاتا ہے، یہ تو وہ رقم ہے جو ۲۵/ہزار انگریز لیتے ہیں جن کی تنخواہیں ایک سو روپے سے زیادہ ہیں، حالانکہ ہزاروں اور یوریشین ایسے ہیں جو اس سے کم تنخواہ پاتے ہیں، علاوہ بریں ۷۵/ہزار انگریزی سپاہ ہندوستان کے روپیہ سے پیٹ پالتی ہے اور یہ حساب کیا گیا ہے کہ ایک سپاہی پر دوہزار روپیہ سال صرف ہوتا ہے۔[1]

انگریزوں کے ظلم وزیادتی کے بارے میں بریلی کی خبر ۱۱اپریل ۱۸۷۸ کے نصرت الاخبار دہلی میں درج ہے کہ پانچ سولجروں کی گولیوں سے چار ہندوستانی مارے گئے۔ خبر کا عنوان ہے 'آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا'۔

> مقام مراد آباد سے ایک انگریز مخبر اپنے خط مورخہ ۲۱ ماہ گذشتہ میں لکھتا ہے کہ آج صبح کو ایک متأسف واردات کی نسبت جو بریلی میں واقع ہوئی میں نے سنا کہ پانچ سولجرس شکار کو گئے اور چند موروں کو شکار کیا، اس کار خلاف طبع پر اس مقام کے ہندوستانی لوگ مزاحم ہوئے، مگر افسوس اس معاملے میں بے چارے چار ہندوستانی گولی سے مار دیے گئے، اگر یہ سچ ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اب آئندہ کو بے چارے ہندستانیوں کا خدا ہی بھلا، کیونکہ بہت تھوڑے عرصے میں کئی ایسی زیادتیاں ہوئی ہیں۔[2]

---

[1] منشور محمدی، بنگلور، یکم جنوری ۱۸۸۶

[2] نصرت الاخبار، دہلی، ۱۱اپریل ۱۸۷۸ء

انگریز حاکم ہندوستانیوں کی جو بات بھی اپنی حاکمانہ شان کے خلاف دیکھتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور ہندوستانیوں کی جان و عزت کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا، اگر کسی ہندوستانی نے اس کو سلام نہیں کیا تو وہ اس کے لیے نا قابل برداشت بات بن جاتی تھی، چنانچہ وہ اس کے بدلے میں ہندوستانیوں کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا اور عدالتوں کی بھی یہی پوزیشن تھی، وہ انگریزوں کی جان کو جان سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کی جان کو گاجر مولی سے بھی بد تر قرار دیتے تھے۔ چناچنہ کان پور کے ایک اخبار نورالانوار نے اپنے شمارے میں یکم اگست ۱۸۸۵ میں اسی قسم کی خبر چھاپی۔

> کولہا گھاٹ پر دو یورپین گاڑی پر سوار جاتے تھے اور سامنے سے ایک ہندوستانی نوجوان گھوڑے پر سوار آرہا تھا جس نے عمداً یا سہواً صاحب بہادروں کو سلام نہیں کیا۔ یورپین کے خون کے جوش نے زور کیا، سوار مذکور پر چابک پھٹکارنے شروع کیے، جس کے باعث وہ بے چارہ گھوڑے سے گرپڑا اور صاحب بہادر اس کے سر پر گاڑی چلا کر اس کو کچل گئے۔[1]

انگریز ہندوستانیوں کو اس قدر حقیر و ذلیل گردانتے تھے کہ انگریزوں کے مقابلے میں ہندی باشندوں کی توہین اور بے عزتی میں کسی بھی طرح کی کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے، حتی کہ انگریزی جوتے کے مقابلے میں ہندوستانی باشندے کی کوئی عزت نہیں تھی، چنانچہ ایک ہندوستانی کے ذریعہ انگریزی جوتا پہن کر انگریز کے سامنے آنے پر کس قدر اس کی بے عزتی کی گئی اور کیسا ہتک آمیز سلوک اس ہندوستانی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی ایک جھلک اودھ اخبار کے ۶/مارچ ۱۸۷۶ء کے شمارہ میں دیکھنے کو ملتی ہے:

> ممالک مغربی کے ایک حاکم صاحب بہادر نے ایک مختار کی جو جوتا پہن کر صاحب بہادر کی حضور میں حاضر ہوا تھا، یہاں تک تواضع کی کہ انھیں جوتوں کو جو وہ پہن کر آیا تھا، اس کے

---

[1] نورالانوار، کان پور، یکم اگست ۱۸۸۵ء

> پاؤں سے نکلوا کر اس کے سر پر رکھوا کر اور عرصہ تک کھڑا رکھا اور فرمایا کہ اب تم سمجھا کہ ہم اس سے ناراض ہوتے ہیں، اگرچہ یہ خبر صحیح ہے اور قومی امید ہے کہ صحیح ہو گی کیوں کہ کئی تحریریں چند صاحبوں کی اس ضمن میں موصول ہوئیں، تو ہم انگریزی جوتے پہننے والے ہندوستانیوں پر سخت افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی عزت اس جوتے کی ہے جس کی ہم تعریف کرتے ہیں، فی الواقع جوتے کی عزت میں تو اب فرق نہیں آیا بلکہ اس کی عزت بدرجہا بڑھ گئی، گویا ایک انسان کی عزت و آبرو خاک میں ملی۔ بڑے شرم کی بات ہے اور کمال غیرت کا موجب ہے اگر اب بھی اس وضع کے تمام رئیس اور وکیل اور مختار متفق ہو کر اس کا استغاثہ نہ کریں، پس جیسی عزت یا ذلت ایک شخص کی ہوئی ایسی ہی سب کی ہوئی۔[1]

انگریز حکام ہندوستانیوں سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ باوجود دوستانہ تعلقات کے ان سے ملاقات تک نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ہندوستانی انگریز کے گھر پہنچ جائے تو اسے نکال دینے یا بے توجہی کا اظہار کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے تھے، کسی معمولی قسم کے انگریز کے مقابلہ میں کسی معزز ہندوستانی کی بے عزتی اور تذلیل عام بات تھی، ریل میں سفر کرتے ہوئے بے شمار ایسے واقعات پیش آتے تھے جن میں ہندوستانیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ذلت و رسوائی کے معاملات ہوتے رہتے تھے، شکایت کے باوجود انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہندوستانیوں کو ہی مورد الزام ٹھہرا دیا جاتا تھا، ایسے ہی ایک واقعہ کو اخبار مرقعٔ تہذیب لکھنؤ نے شائع کیا:

> پندرہ تاریخ اکتوبر سنہ حال کو اودھ روہیل کھنڈ ریلوے پر نیا ماجرا پیش آیا۔ ایک ہندوستانی رئیس سکنڈ کلاس میں سوار ہوئے تھے ایک بہادر صاحب بھی اسی گاڑی میں تشریف لائے اور ہندوستانی صاحب کے اسباب کو پھینکنا شروع کر دیا۔ آخر میں جب ہندوستانی صاحب نے اپنی خطا دریافت کی تو صاحب بہادر اس کے در جواب گھونسا اور لکڑی سے یہاں تک پیش

---

[1] بحوالہ: امداد صابری، روح صحافت، ص ۳۰۹

آئے کہ اگر ٹرین روک کر کانسٹیبل اور لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو اس کی جان بچنے میں کلام تھا، جزاک اللہ، واہ کیا تہذیب ہے، کیا علم، کیا ادب، کیا حکمت پیشگی کا برتاؤ ہے، شائستگی کا خوب نام روشن ہوا۔[1]

اس دور کی معاشی بدحالی کا ایک نقشہ اودھ پنچ میں مکالمہ کی صورت میں منشی سجاد حسین نے پیش کیا ہے:

فاقہ کش: اے میاں باہر کے غلے ہوت! آتے بھی ہو یا دور سے ٹالے بالے بناتے ہو، یہاں مارے فاقوں کے تراقے کے براحال ہے، اب تو آواز دینے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ ع اے چارہ گر آچک کہ دم چارہ گری ہے۔

غلہ: آیا، آیا، گھبراؤ نہیں بھائی صاحب، اتنی دور سے آنا منہ کا نوالہ نہیں، ذری دیر ٹھہرو، دم لو، بس اب مجھے تم آیا ہی سمجھو۔

فاقہ کش: (انتظار کرکے) اب تو صبر نہیں ہو سکتا، آؤ یا چولھے بھاڑ میں جاؤ۔ ع

پس از آنکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

غلہ: اے لو، میں چل چکا، منہ دھو رکھو، اب کچھ فکر نہ کرو۔ (ایک آدھ جگہ آیا اور چکی پکی ہو گیا، اونٹ کے منہ میں زیرہ)

فاقہ کش: (بستر مرگ پر) اب تک غلہ نہ آیا، اب آیا بھی تو کیا، ہم تو چلے، غلہ تو آرہے گا، افسوس ہم نہ ہوں گے۔

فاقہ کش دم توڑ کے چل بسا۔[1]

---

[1] مرقع تہذیب، یکم نومبر ۱۸۷۳، بحوالہ روح صحافت، امداد صابری، ص ۳۲۸

مذکورہ بالا مکالمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی معیشت کس تباہ حالی کا شکار تھی، برطانوی حکمرانوں نے ہندوستانی معیشت اور یہاں کے مال وزر کا طرح طرح سے استعمال کر کے اس ملک کو تنزلی کا شکار بنایا اور برطانیہ کی زود افزوں ترقی کا راستہ ہموار کیا، انگریز افسروں اور کارندوں کی تنخواہوں کے نام پر ملک کی خطیر رقم کو خرچ کیا جاتا تھا اور یہاں کے لوگ بدحالی اور فاقہ کشی کا شکار ہو رہے تھے، صنعتی اور تجارتی اعتبار سے وہی اسکیمیں اور پالیسیاں بنائی جاتی تھیں جس کا خاطر خواہ فائدہ انگریزوں اور ان کے ملک برطانیہ کو پہنچے، چاہے اس کے لئے ہندوستان کا جتنا بھی نقصان ہو، طرح طرح سے لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری تھا، انگریزوں کی اسی لوٹ کھسوٹ اور ہندوستانی مال و زر کے ناجائز استعمال کو دیکھتے ہوئے مشہور شاعر مصحفی نے کہا تھا:

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی　　　کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کی اس لوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند برسوں میں ہندوستان کی حالت ایک دم توڑتے ہوئے انسان کی طرح ہو گئی تھی، جس کے نتیجے میں ملک میں فاقہ کشی، افلاس، بدامنی اور سماجی و اخلاقی زوال کی بدترین صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ذیل میں اودھ پنچ کی فائل سے ایک مختصر اقتباس پیش ہے جسے عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل مقدس کے تحریری اسلوب میں لکھ کر انگریزی حکومت کے متعصبانہ رویے پر طنز کا تیز وار کیا گیا ہے، اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> مبارک وہ کالے جو ستائے جاتے ہیں، کیوں کہ آسمان کی راحت انہیں کے لیے ہے۔ مبارک وہ جو سول سروس کے لئے رنجیدہ ہیں کیوں کہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی، مبارک وہ جو قحط کے بھوکے پیاسے ہیں کیوں کہ پادریوں کی بدولت مسیحی مذاہب سے مشرف ہوں گے۔

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بستم، ۱۹ نومبر ۱۸۹۶

مبارک وہ جو سنگ دل ہیں کیوں کہ بعض خوشامدی رحم دل کہیں گے۔

مبارک وہ جو راست بازی کے لئے دھمکائے جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔[1]

منشی سجاد حسین نے حکام وقت اور والیان ریاست کے نام 'کھلے خط سربستہ مضامین' کے نام سے فرضی خطوط کا سلسلہ جاری کیا تھا، یہاں ایک ایسے ہی خط کا اقتباس پیش ہے جس میں نظام حیدر آباد کو حکومتی امور میں مشورہ دیتے ہوئے ان کے مصاحبین پر زبردست طنز کا وار کیا ہے:

... جب گدھوں کی کافی تعداد بن چکی اور بہت سا تخم باقی رہا تو ملائکہ نے خداوند تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا اس کو کیا کرنا چاہیے، حکم ہوا ان کو صورت انسانی میں لا کر اور کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر زمین پر برسا دو، چنانچہ چار مینار سے ان حضرات کی بارش ہوئی غالباً انہیں میں سے دو چار تمہاری مصاحبت میں آ گئے ہیں۔۔۔ تم کو یہ بات ہر وقت ملحوظ رکھنی چاہیے کہ رئیس ریاست کے واسطے بنا ہے، نہ عیش و آرام، لہو لعب کے واسطے، کسی سے ناچاقی، عداوت، شکر رنجی کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی وجہ نہیں انتظام ریاست کی باگ ڈور چھوڑ دی جائے، ملک کی رونق رعایا کے دل سے فرحت اس طرح فرار ہو، جیسے تمہارے دیوان کے دماغ سے تمہاری عظمت، تم خفا ہو، خوش ہو، لڑو، جھگڑو، جو چاہو کرو، مگر ملک کی جانب سے غفلت نہ کرو اور خدا کے یہاں گنہ گار نہ ہو، مردم شناسی کرو۔ قدر دانی میں مشق بڑھاؤ، ملک کے رنج و راحت کو اپنا رنج و راحت بناؤ تب حق سے ادا ہو گے۔[2]

وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کے نام ایک ایسے ہی خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد اول، ۱۱ ستمبر ۱۸۷۷

[2] "کھلے خط سربستہ مضامین بحضرت نظام دکن"، اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و سوم، ۷ ستمبر ۱۸۹۹

میں نے تمھاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی، رفاہ و فلاح، آرائش و زیبائش، ظاہری ٹیم ٹام، اوپری لیپ پوت کے واسطے تمھاری ذات مخصوص ہے۔ مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم ہو جیسے ہندوستانی جودت سے، تم پولیٹیکل دستر خوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو، پکا پکایا کھانے طیار (تیار) ہانڈی سے تم خوبی سے چن سکتے ہو مگر ہانڈی پکانے اور چیز طیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول، تم نہیں جانتے کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون مصالح کیونکر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے، کبابوں میں کس چیز سے گلاوٹ آتی ہے، پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں، فارن پالیسی کا مزعفر اور تنجن کیوں کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے، کہتے ہیں جو کوئی چھچھوندر مار ڈالتا ہے اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے، شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ مگر اب یہ ضرورت بیشک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی اور رکاب دار سب تیار کرے پھر دستر خوان لگانے اور خاصہ چننے کو تم بلائے جاؤ۔[1]

ملک کی معیشت اور امن و امان کی اس وقت جو صورت حال تھی اسے اودھ پنچ میں شائع خبر میں ملاحظہ فرمایئے:

ہندوستان پر صدہا سال سے پردیسی حکومت کرتے آئے ہیں، لیکن آج کل جو خاک اڑ رہی ہے، ان کے زمانے میں نہیں تھی، یہ سچ ہے کہ پرانے حاکم اپنے خزانے رعایا میں نہ بانٹ دیتے تھے لیکن رعایا میں یہ کنگالی بھی نہ تھی، کیوں کہ ملک کا روپیہ ملک میں رہتا تھا، بادشاہ کے ہزاروں ملازم جن کے پاس لکھو کھا روپیہ تھا وہ رعیت کے ساتھ باپ دادا کا سا سلوک

[1] "کھلے خط سربستہ مضامین بنام گلیڈاسٹون"، بحوالہ اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، مصباح الحسن قیصر، ص ۱۳۲

کرتے تھے، لیکن اب تو رعایا سے کروڑوں روپیہ لے لیا جاتا ہے، جب تک حکومت یہ تہیہ نہ کرلے کہ ہندستان کی دولت باہر نہ جائے گی تب تک امن قائم نہ ہوگا۔[1]

انگریزوں کے ہاتھ ہندوستانیوں پر ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کے واقعات تو ہمیشہ ہی پیش آتے رہتے تھے اور ان ظالمانہ رویوں کے خلاف اس وقت کے بہت سے اخبارات میں ملامتیں اور تنقیدیں شائع ہوتی رہتی تھیں، لیکن اس طرح کے واقعات و حادثات کے موقع پر اودھ پنچ کی مذمت کا انداز ہی کچھ اور ہوتا تھا، طنز اور غصے سے بھرپور جملے ایسے مزاحیہ انداز میں پیش کئے جاتے تھے جو مجرم کو شرم و عار دلانے کے لئے کافی تھے، ایسے ہی ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جو پہلے 'تلی بڑھتی تھی اب زخم بھی بڑھنے لگے' کے عنوان سے لکھا گیا تھا، اقتباس یہ ہے:

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی بڑے مکار، بات کا بتنگڑ، سوئی کا بھالا، رائی کا پہاڑ بنانے والے ہوتے ہیں، شاعری واعری میں تو خیر مبالغہ بے ضرر گناہ ہے جس کا جتنا جی چاہے صرف کرے، اس سے کوئی سوشل یا پولٹیکل خرابی براہ راست پیدا نہیں ہوتی، مگر ستم تو یہ ہے کہ یہ مقدمات معاملات میں اپنی صفت دکھاتے اور اس سے بڑے بڑے نقصانوں کا اندیشہ پیدا کر دیتے ہیں، اب ایک اسی بات کو دیکھیے کہ جہاں کسی گورے یا صاحب بہادر نے ان کو ٹھونکا، ڈگ مارا یا ٹھوکر لگائی یا کسی ہتھیار سے زخم لگا یا بس یہ فوراً مر گئے اور اس بیچارے پر مقدمہ خون کا قائم کرا دیا، یہ مانا کہ اکثر ملازم چھوٹ جاتا یا خفیف سی سزا پا کر خاطر خواہ کیفر کردار کو نہیں پہنچتا مگر انصاف شرط ہے، آخر اس کو چند روز بیم ورجا میں رکھنا، مقدمے کی کشاکش جھیلنا، عدالت کی تکلیف اٹھانی تو پڑتی ہے۔[2]

[1] اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد نہم، ۲۸ مئی ۱۸۷۶،

[2] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بستم، ۱۶ جولائی، ۱۸۹۶

انگریز حکمرانوں اور دیگر عام برطانوی باشندوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کو مختلف انداز میں موقع بہ موقع قہر وعتاب کا شکار بنایا جاتا تھا، ذیل میں اودھ پنچ کی فائل سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی حکمرانوں کی ظلم و زیادتی کے خلاف اودھ پنچ کا کیسا رویہ ہوتا تھا اور اس کے طرز تحریر میں کس طرح کی غضبناکی ہوتی تھی، اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> جو لوگ حکومت، دولت، رشوت کے مردافگن نشے سے بدمست الو کی دم فاختہ ہو کر غرباء کے خون ناحق کو سبیل کا پانی جان کر خون ریزی اور سفاکی کو اپنے مقطع چہرے کا غازہ بناتے ہوں، بے گناہوں کا گلا گھونٹ کر بے جان کرنا ان کی نام وری کا سبب ہے، خون ناحق نے ان کے چہرے کو سرخ نہیں سیاہ کر دیا ہے، بے ایمانی کے کیچڑ میں جس کی بدبو سے شیطان کا دماغ بھی پراگندہ ہو جائے لت پت ہیں، دنیا میں ان حکام کو جو بندۂ طمع اور غلام حرص ہی، گرم گرم سبزی اور پہلی نوالے کھلا کر شرابین پلا کر رجا مند کر لین، بعض بے گناہوں کو گولیوں سے اڑائیں، پھانسیاں دیں، کسی کے ہاتھ پر بچھو سے ڈنک لگوائیں، مرچوں کے توبڑے ان کے منہ پر چڑھائیں، کولھو میں ڈال کر پیسیں، ان کے خون کا گارا بنایا جائے، ان کی ہڈیوں کی دیواریں چنوائی جائیں، لیکن دنیا فانی ہے، ان سختیوں کا زمانہ عنقریب ختم ہو جائے گا، مگر عقبی کے وبال کا پنسارہ ان کے کاندھوں پر ہو گا۔[1]

درجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ تھا اور وہ کس طرح ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے تھے، اور ان تمام کے باوجود وہ خود کو حق بجانب سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کو غلطیوں کا مرتکب اور مجرم گردانتے تھے، ان معاملات میں اودھ پنچ کا رویہ کس قدر سخت ہوتا تھا وہ ما قبل کی تحریر سے پتہ چلتا ہے، سرکاری محکموں پر مزاحیہ انداز میں تنقید کی بہت سی مثالیں اس اخبار میں ملتی ہیں، اس مقصد کے لئے مخصوص کالم

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد شانزدہم، ۲۸ جولائی ۱۸۹۲

متعین تھے، ذیل میں ایک ایسے کالم کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس میں ایک ہندوستانی سقے (گھر گھر پانی پہچانے والا) اور واٹر ورکس (حکومت کا محکمہ آب رسانی) کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے، اس مکالمہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس خوبصورت انداز میں مزاحیہ صورت اختیار کرتے ہوئے حکومتی عملہ پر طنز کا تیز وار کیا گیا ہے، اس مکالمہ کا عنوان ہے، 'سقے اور واٹر ورکس' اس میں واٹر ورکس کے لئے 'و' اور سقے کے لئے 'س' کا استعمال کیا گیا ہے، مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

(و) ول، تم کون ہو؟

(س) حضور ہم سقے بہشتی لوگ۔

(و) آہا! تم بڑے خراب شریر آدمی ہو۔ تم گرمیوں میں خلقت کو بڑی تکلیف دیتے ہو۔

(س) مجھ پر کیا موقوف ہے، آپ نہیں تکلیف دیتے ہیں۔

(و) تم بعض وقت شرارت کرتے ہو کہ باوجود نوکر ہونے کے آقا کے گھر میں پانی نہیں پہنچاتے، کبھی کہتے ہو مشک پھٹ گئی، کبھی کہتے ہو ڈول کنویں میں گر گئ۔ کبھی رسی سے ڈول مع گراری کنویں میں جارہا، کبھی مشک چھوٹی کرکے پانی کم کردیتے ہو۔

(س) آپ بھی تو باوجود ٹکس لینے اور وعدہ کرنے کے کبھی کبھی پانی کے عوض صرف ہوا روانہ کرتے ہیں، کبھی عذر رہے کہ کل بگڑ گئی، کبھی نل مرمت طلب ہو گیا، دو، دو چار چار دن نل میں قفل لگا رہتا ہے اور خلقت پانی کے لئے ترستی ہے۔

(و) ول، ہمارا کارخانہ بڑا ہے، ہزاروں جھگڑے رہتے ہیں، پورے پورے شہر کو پانی پہنچانا ہوتا ہے، اگر ذرا سی بات ہو گئی تو ایسی بڑی شکایت نہیں چاہیے۔

(س) تو جناب آپ میری تنخواہ کے مقابلے میں محصول ہزاروں لاکھوں نہیں لیتے، بلکہ تنخواہ تو بعد میں ملتی ہے آپ پیشگی وصول کر لیتے ہیں، اور اگر کبھی ناغہ کرتا ہوں تو مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ موقوف کرے، جرمانہ کرے، اتنے دن کی تنخواہ مجرا لے، اور آپ تو بڑے مزے میں رہتے ہیں بھلا جس محلے میں پانی نہیں پہنچتا اس کو ٹیکس واپس دیتے ہیں، سچ پوچھیے تو ہر بات میں آپ مجھ سے ہزاروں درجے بڑھے ہوئے ہیں، میں اگر دس کو تکلیف دیتا ہوں تو آپ ہزاروں کو، فرق صرف اتنا ہے کہ میں چھوٹا شریر ہوں تو آپ بڑے، ورنہ کام، خدمت اور شرارت میں تو یکساں ہی ہیں۔ اور مجھے تو مالک سزا بھی دے سکتے ہیں اور آپ سب سے بری ہیں، پھر فرمایئے میں زیادہ قابل ملامت ہوں یا آپ، میں اگر قزاق ہوں تو آپ سکندر، میں شرارت کا قطرہ ہوں تو آپ سمندر۔

(و) چپ رہ بد معاش، گستاخ، باغی، ہماری برابری، ہمارے شان میں گستاخی کرتا ہے، ہم میونسپل بورڈ کی حمایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، تیرا بھی کوئی پشت پناہ ہے۔[1]

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے مختلف آئین و قوانین نافذ کئے اور مختلف قسم کے بل بھی منظور ہوئے۔ ان میں سے ایک بل 'البرٹ بل' بھی ہے، جو اپنے زمانہ میں کافی مشہور ہوا۔ اس بل کی تفصیل یہ ہے کہ انگریزی حکومت میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے فوجداری مقدمات میں امتیاز برتا جاتا تھا، کسی انگریز کا مقدمہ کسی ہندوستانی جج کی عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس دور میں انگریزوں نے اقتدار کے نشہ میں مست ہو کر ایسے جابرانہ اور ظالمانہ رویے اختیار کئے کہ معمولی معمولی باتوں پر بہت سے ہندوستانیوں کا قتل کر دیا گیا اور معمولی سزا یا جرمانہ پا کر یا بغیر کسی سزا کے مجرم آزاد گھومتے رہے، ان جیسے متعصبانہ اقدام اور قومی امتیاز کے پیش نظر یہ بل پیش کیا گیا تھا لیکن انگریزی اخبارات اور بااثر انگریزوں کے واویلا مچانے اور اینگلو انڈین باشندوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ بل

---

[1] اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد نوازدہم، ۲۳ مئی ۱۸۹۵

بغیر منظوری کے واپس لے لیا گیا۔اس موقع سے ہندوستانی اخبارات نے اپنے اپنے طور پر اس موضوع پر بہت کچھ لکھا، اودھ پنچ نے بھی اپنے صفحات میں اسے جگہ دی اور طویل مضمون لکھا،اس مضمون کا ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

> لو سارا طلسم ٹوٹ گیا، ایک چھلاوا تھا جو چشم زدن میں نظروں سے او جھل ہو گیا، یکا یک بلائے آسمانی پھٹ پڑی، ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی، پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا۔ کلیجہ دھک سے ہوا، مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو، ہندیو! دشمنوں سے سبق لو، کچھ کھو کے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا بھی کام آتا ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اگر ہم بھی گورنمنٹ ہاؤس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی جاتا۔[1]

انگریزی حکام ہمیشہ یہ کہا کرتے کہ ہم ہندوستانیوں پر ظلم و زیادتی نہیں کرتے جب کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس تھی، وہ ہر امور میں ہندوستانیوں کے ساتھ معتصبانہ رویہ اپناتے تھے اور ہندوستانیوں کو دق کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، انگریزی حکام کا کہنا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہب کی تبدیلی کے لئے عیسائی مشنریوں کو کسی بھی طرح کی مدد فراہم نہیں کرتے، جب کہ معاملہ اس کے سراسر خلاف تھا، ایسا ہی ایک واقعہ مہاراجہ ہولکر کے ساتھ پیش آیا کہ انگریز ریزیڈنٹ اور حکام مہاراجہ سے اس وجہ سے سخت ناراض ہو گئے کہ انہوں نے عیسائی مشنریوں کو عیسائیت کی حمایت اور دیگر مذاہب کی تکذیب کی اجازت نہیں دی تھی، اس حوالے سے اودھ پنچ نے خبر شائع کی جس کا اقتباس اس طرح ہے:

> بھلا یہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ مذہب عیسوی کی اشاعت میں کسی جگہ زبردستی کی جاتی ہے یہ تو اصول مذہب ہی کے خلاف ہے، مسلمانوں کا جہاد ہر طرح سے قابل الزام ہے، لیکن

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، بحوالہ، عبدالرزاق فاروقی، اودھ پنچ کی ادبی خدمات، ص ۴۳

عیسائیت میں جس وجہ سے چاہو، یہ بات غیر ممکن سمجھ لو، اگر مہاراجہ ہولکر پر سرکار کی جانب سے اس امر کا تشدد ہوتا ہے کہ وہ اپنی ریاست میں پادریوں کو وعظ کہنے دیں تو یہ کوئی زبردستی نہیں ہے، ریزیڈنٹ 'بے ٹرمن' اس پر خفا ہیں تو یہ کوئی زبردستی نہیں ہے، حکام سرکار کشیدہ ہیں تو یہ کوئی زبردستی نہیں، یہ صرف وحشت اور ناتعلیم یافتگی کے خیالات ہیں کہ عیسائیت میں اگر جبر نہیں ہے تو مہاراجہ ہولکر سے ناچاقی یعنی چہ۔[1]

ما قبل میں لکھا جاچکا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانی مال و دولت کو ہڑپنے اور اسے برطانوی مفاد میں کام میں لانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے، ان ہی حربوں میں سے ایک 'ٹیکس' ہے، انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی باشندوں پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے اور بڑی سختی سے وہ ٹیکس وصول کیے جاتے تھے، اس ضمن میں اکثر اوقات ظلم وزیادتی کو روا رکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے باشندگان ہند بڑے پریشان رہا کرتے تھے، اس دور کے اخبارات میں اس حوالے سے خبریں اور تبصرے شائع ہوا کرتے تھے، اودھ پنچ بھی اپنے مخصوص انداز تحریر میں اس موضوع پر لکھا کرتا تھا، اس سلسلہ میں نظم و نثر دونوں کا سہارا لیا جاتا تھا، ذیل میں ایسی ہی دو نظموں کے چند اشعار پیش ہیں، جن میں حالات کی ترجمانی اور حقیقت کی معنیٰ آفرینی ملاحظہ فرمائیں:

پاجی ہوں میں قوم کا اور ٹیکس ہے میرا نام　　　چھری گلے پہ پھیرنا سدا ہے میرا کام

سدا ہے میرا کام اجاڑوں شہر اور منڈی　　　بچے نہ کوئی ذات، بھڑوا ہو یا رنڈی

نام ہے ٹیکس میرا، قہر خدا کا ہوں میں　　　چشم بد دور کہ دجال کا باوا ہوں میں

عرضی پڑھتا ہوں، نہ سنتا ہوں کسی کی فریاد　　　آنکھوں سے اندھا ہوں اور کانوں سے بہرا ہوں میں۔[2]

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد ہشتم، ۲۳ جون، ۱۸۸۴

[2] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد اول، ۸ مئی ۱۸۷۷

ایسی ہی ایک دوسری نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں، اس نظم کا عنوان ہے "ٹیکس پر واویلا"

کہتے ہیں جسے ٹکس وہ ہے قہر الٰہی　　　　دیکھیں ہمیں کب ہوتی ہے اس سے رہائی

روٹی ہی نہیں صبح سے تا شام میسر　　　　اس حال میں ہو ٹکس کی کس طرح سمائی

کانٹا سا کھٹکتا ہے یہ آنکھوں میں ہماری　　　　نشتر سا چبھا دل میں ہے جانوں پہ بن آئی

کونسل سے چلا ٹکس ادھر چرخ سے ہیضہ　　　　دونوں نے پہنچتے ہی عجب دھوم مچائی

وہ مال کا جج ہے تو یہ جانوں کا کلکٹر　　　　منظور ہے دوں کو سر رشتے کی صفائی

کھٹکا ہے کہیں شعر پہ بھی ٹکس نہ بندھ جائے　　　　خاموش ہوں اصغر کہ اسی میں ہے بھلائی۔[1]

ملکہ برطانیہ کو 'قیصرۂ ہند' کا خطاب دینے کے لئے ۱۸۷۷ء میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں دربار منعقد ہوا، اس دربار میں ریاستی حکمرانوں نے خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ خوب سرگرمی دکھائی اور بے تحاشہ مال و زر خرچ کئے، انگریز حکمرانوں نے بھی ملکہ کے سامنے اپنی طاقت و قوت اور عوامی مقبولیت کے مظاہرے کے لئے نہایت منظم اور مستحکم کوشش کی تھی، ملک کا بے شمار مال و زر بے دریغ بہایا گیا تھا، لہذا دربار کے اختتام پر اودھ پنچ نے اپنا تبصرہ شائع کیا جس میں ریاستی حکمرانوں، رئیسوں اور امیروں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

> صاحبو! دربار تو جس طرح ہوا گزر گیا، جہاں سرکار نے آنکھ بند کر کے اپنے خطاب قیصری کی تصدیق میں ہندوستانی امراء و رؤسا کو بڑے بڑے لمبے چوڑے بے بہا خطاب عطا فرمائے، تمغے دئے، جھنڈے پکڑائے، سلامیاں کسی کی بڑھائیں، کس کو تازہ دیں، وہاں رئیسوں نے بھی جان پر کھیل کر قرض سے، دام سے، علاقے رہن کر خوب دولت صرف کی، سونے،

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد اول، ۲۹ مئی ۱۸۷۷

چاندی، جواہرات کی اچھی چمک دکھائی، مگر اب طوفان خطاب قیصری تمام ہوا، دربار کے نشے کا خمار آیا، والی جودھ پور جو علاقہ رہن کر روپیہ لائے تھے اس کی سوچ میں ہیں، سرسالار جنگ بہادر برار کی آس لگائے بیٹھے تھے وہ بھی اپنا منہ لے کر رہ گئے، وہ شکستہ خاطر ہیں جو معزز عہدے پانے کے متوقع تھے، ان کی کمر ٹوٹ گئی، ہمارے چیف کمشنر صاحب بہادر جب سے آئے ہیں پیچش میں مبتلا ہیں، خدا جانے دعوتوں میں کیا بے عنوانی ہوئی، تماشائی، ناخواندہ مہمان جو دہلی گئے تھے، چار آدمیوں کے سامنے تو خوب دون کی لیتے ہیں مگر دل کا یہ حال ہے کہ مصارف بے سود کا انگ جدا، تکالیف بالا یطاق کا غم الگ، دہلی کے دھکوں کا مزا زبان پر، دہلی کی خاک پھانکنے کی ندامت دل میں، اپنے ہی جی میں شرمندہ ہیں کی لاحول ولا لوگوں کے بھرے میں آکر ہم بھی حماقت کر بیٹھے۔ [1]

جو لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی حکومت کی طرف سے اپنی جان کی بازی لگا کر فوجی خدمات انجام دیتے تھے ان کے تئیں ان حکمرانوں کا کیا رویہ تھا وہ اس تحریر سے واضح ہوتا ہے۔ درج ذیل تحریر دو ہندوستانی فوجیوں کے درمیان مکالمے کی صورت میں ہے:

"چھتر سنگھ: رنبیر سنگھ کے مر جانے پر اس کی بیوہ چاند کماری کی پرورش کے لیے کیا کمپنی نے کوئی وظیفہ نہیں دیا؟

امر سنگھ: بھائی یہ بات خیال کرتے ہی اس احسان فراموش، خود غرض ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوکری کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک انگریز اگر لڑائی میں مارا جاتا ہے تو اس کی بیوی اور لڑکوں کے لیے ہمیشہ کو وظیفہ مقرر ہو جاتا ہے۔ مگر کوئی دیسی سپاہی جب ان کے لیے میدان جنگ

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد اول، ۱۱ ستمبر ۱۸۷۷

میں جان دیتا ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ بڑا ظلم ہے کہ اس کی بیوی بچوں کی پرورش کا کمپنی کی طرف سے کوئی بندوبست نہیں کیا جاتا ہے۔"[1]

انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانی خزانہ کی لوٹ کھسوٹ اور یہاں کے باشندوں کی مفلوک الحالی کو دیکھتے ہوئے یہ اخبار انگریز حکمرانوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ہم ملک ہندوستان کی رعایا کو تباہ حال اس وجہ سے پاتے ہیں کہ اس ملک کا زر محاصل جو انگلینڈ کے خزانے میں جاتا ہے پھر کسی طرح سے واپس نہیں آتا، صرف اسی قدر ہندوستان میں رہ جاتا ہے جو کہ تنخواہ ہندوستانی ملازمین میں دیا جاتا ہے، اور وہ لوگ معدودے چند ہیں۔ جس قدر حصہ یورپین کی تنخواہ سے رہ جاتا ہے جو کہ ان کے کھانے کے لیے ہوتا ہو، باقی کل ولایت کو جاتا ہے جو کسی حیلہ سے واپس نہیں آتا ہے، اس کے علاوہ بہت روپیہ تجارت کے وسیلے سے انگلینڈ میں پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی کسی ذریعہ سے نہیں آتا ہے۔ کیونکہ یہاں کوئی تجارت نہیں، تجارتیں یہاں بھی ہو سکتی ہیں یا کوئی پیشہ ہندوستانیوں سے ممکن بھی ہے تو اس میں سرکار خود تاجر بن جاتی ہے، پس جب کہ ہر صورت سے ہندوستان کا روپیہ نکل جاتا ہے اور کوئی چشمہ آمدنی کا باقی نہ رہے تو کیوں کہ کر رعایا کی قوت نہ گھٹ جائے، پتلی دال کھانے والے کو ایک فاقہ بھی بہت ہے۔[2]

اودھ پنچ کی نوآبادیات مخالف خدمات کی یہ چند مثالیں پیش کی گئیں ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس اخبار نے اس ضمن میں کتنا اہم کردار نبھایا ہے، نوآبادیات کی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دراصل نوآبادیاتی نظام کا اپنا ضابطہ، قانون اور اصول ہوتا ہے۔ محکوم طبقہ ہر طرح سے مجبور ہوتا ہے، ان کے لئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ

---

[1] اودھ پنچ، جلد چودہ، ۳۰ جنوری ۱۸۹۰ء

[2] اودھ پنچ، جلد چہاردہم، ۲۵ مئی ۱۸۹۰ء

وہ نہ زندہ ہوتے ہیں اور نہ مردہ، قانون سازی میں بھی محکوم طبقے کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، لیکن قانون کی فرمانبرداری ان پر لازم ہوتی ہے۔ نوآبادیات کی اصل بنیاد اقتصادیات پر ہوتی ہے اور اس کا مقصد مفتوح ملکوں سے دولت حاصل کر کے اپنے ملک کے ترقی کی راہیں ہموار کرنا ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں محکوم ملک مالی اعتبار سے کمزور اور وہاں کی عوام دن بدن غریب ہوتی چلی جاتی ہے۔

باب چہارم

نوآبادیاتی تہذیبی اور معاشرتی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ

- انگریزوں سے پہلے ہندوستانی معاشرت
- انگریزوں کے ذریعے تہذیبی و معاشرتی تبدیلیاں
- ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر انگریزی حملے کے خلاف اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ

نوآبادیاتی تہذیبی اور معاشرتی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ

انگریزوں سے پہلے ہندوستانی معاشرت

عہد قدیم سے ہندوستان تہذیب و تمدن، طرز معاشرت، اچھے اخلاق اور باہمی میل جول کے لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہاں پر بسنے والے لوگوں کی فطرت میں قدرت نے مہمان نوازی، سماجی اقدار کا پاس ولحاظ اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک ہونے کا جذبہ موجزن فرمایا ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب و برادری کے اعتبار سے مختلف قسم کی رنگارنگی اور تنوع کے باوجود یہاں کے لوگ آپس میں مل جل کر زندگی گزارتے اور ایک ہی ساتھ رہتے رہے ہیں۔ ہندوستان قدیم زمانہ سے روحانی پیشواؤں اور اعلی اقدار کے حامل رہنماؤں کا مرکز رہا ہے اور انہیں کا اثر تھا کہ انگریزی اقتدار کے عروج سے پہلے تک یہاں کے عام باشندے اعلی کیرکٹر اور عمدہ اخلاق کے عادی تھے۔ سر تھامس منروجو کہ شہنشاہ جہاں گیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا وہ ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن کو دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ اسی بناء پر وہ اپنے ایک مقالہ میں ہندوستانیوں کے اوصاف ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے:

> ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجو ہو اور سب سے زیادہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو، اس کی عزت، عصمت، عفت کا لحاظ رکھا جاتا ہو، یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کم تر قرار نہیں دیا جاسکتا، اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے کامل یقین

ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہو گی اس سے انگریزوں کہ بہت
فائدہ پہنچے گا۔[1]

یہ الفاظ صاف طور سے بتلا رہے ہیں کہ ہندوستانیوں میں اس نے ایسے اخلاق جمیلہ اور اعمال حسنہ کا مشاہدہ کیا تھا جن کے حاصل کرنے کی وہ اہل انگلستان کو ترغیب دیتا ہے اور ان کے حاصل ہونے سے انگریزوں کے لیے بہت فائدہ دیکھتا ہے۔اس زمانہ میں عام طور سے ہندوستانیوں میں مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، غرباء اور مصیبت زدوں پر شفقت اور رحم، عہد و پیمان کا تحفظ اور پابندی، خدا پرستی اور سچائی، امانت داری اور سخاوت و وفاداری، صداقت و دیانت داری اور عدل، بلند حوصلگی اور شرافت، بیدار مغزی و جفاکشی، چستی اور بیداری، شجاعت اور مردانگی وغیرہ اوصاف جمیلہ بڑے پیمانے پر پائے جاتے تھے۔سچ بولنا تو اس قدر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جرائم پیشہ اشخاص بھی اس کے بہت زیادہ پابند ہوتے تھے۔کرنل سلیمان ہندوستانیوں کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

میرے تجربہ میں صدہا مثالیں ایسی آچکی ہیں کہ آدمی کی دولت آزادی اور زندگی جھوٹ سے
بچ سکتی تھی مگر وہ جھوٹ ہی نہ بولا۔[2]

اور یہی وجہ تھی کہ تجارتی بہی کھاتے نہایت معتبر شمار کیے جاتے تھے اور ان کی شہادتیں فیصلوں میں نہایت زیادہ قابل اعتبار سمجھی جاتی تھیں۔سر ارسکن پیری ایک سب کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتا ہے:

تجارتی کھاتوں کی وہ حرمت تھی کہ کسی متنازعہ لین دین کے بارے میں ان کا پیش ہو جانا
عدالت کے نزدیک ناقابل تردید شہادت سمجھا جاتا تھا۔[3]

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص، ۴۴

[2] بحوالہ، ایضا، ص، ۴۴

[3] حکومت خوداختیاری، بحوالہ، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، حسین احمد مدنی، ص، ۴۵

اس دور میں ان مقاموں کے بسنے والے ہندوستانیوں میں جو انگریزی تمدن اور برطانوی نظام سے بہت دور تھے، پرانے اخلاق جمیلہ کی تیز جھلک دکھائی دیتی تھی۔ مصنف حکومت خود اختیاری لکھتا ہے:

> جو لوگ پہاڑوں پر جاتے ہیں وہ روزانہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑیوں میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی قابلیت اب تک پیدا نہیں ہوئی جو مال ان کے سپرد کر دیا جاتا ہے اسے وہ راستہ میں ہاتھ نہیں لگا سکتے اور اگر صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا تو اسے پولیس کی سپردگی میں دے دیتے ہیں جن کی دیانت داری خود مشتبہ ہوتی ہے۔ یہ عادات ان کی اس وجہ سے قائم ہیں کہ ان کا اصلی وطن پہاڑوں میں موجودہ تمدن سے دور ہے۔[1]

مشہور انگریز حکمراں لارڈ ولیم بنٹنگ جو کہ ابتداء میں مدراس کے گورنر اور اس کے بعد ہندوستان کا مشہور وائسرائے رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں اس کے بیان سے زیادہ کوئی سند باوقعت یا وزنی نہیں ہو سکتی، اس نے ۱۸۸۲ء میں کمپنی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

> بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں، مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے جسے انہوں نے فتح کیا تھا، وہ ہندوستانی باشندوں سے گھل مل گئے، ان میں شادی بیاہ کرنے لگے، مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیے، فاتح اور مفتوح کے مذاق دل چسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی، کوئی فرق نہ تھا۔ برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے، اب سرد مہری، خود غرضی، بے پروائی ہے جس میں ایک طرف

[1] حکومت خود اختیاری، بحوالہ، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، حسین احمد مدنی، ص،۴۵

حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔[1]

بنگال کے مشہور مؤرخ سرپی سی رائے ۱۹۳۸ء میں بنگال کی مسلم فیڈریشن کے ایک جلسہ میں بحیثیت صدر جلسہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اورنگ زیب کے عہد میں بنگالی ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمین دار بنادیے گئے، اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، وائسرائے بنایا، یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب دارالسلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔[2]

پنڈت سندرلال الہ آبادی اپنی کتاب 'بھارت میں انگریزی راج' میں فرماتے ہیں:

اکبر جہانگیر، شاہ جہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں تھیں۔ آج تک ہندوستان میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کے تذکرے ہیں۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ

---

[1] مالیات عامہ، ص،۱۵، بحوالہ برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، حسین احمد مدنی، ص،۴۸

[2] اخبار خلافت، بمبئی، ۲ نومبر ۱۹۲۳

آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔[1]

شہنشاہ جہانگیر نے اورنگ زیب کے متعلق لکھا ہے:

اور راجہ بکرماجیت کو کہ ہندوستان کے معتبر راجاؤں میں سے ہے اور رصد نجوم کی ہند میں اس نے بنائی ہے خطاب دے کر میر آتش اپنا بنایا، یعنی افسری توپ خانہ کی عنایت کی اور حکم کیا کہ ہمیشہ توپ خانہ میں پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپ عمدہ آراستہ تیار رہیں۔ یہ بکرماجیت کھتری ہے، میرے باپ کے فیل خانہ کے داروغہ مشرقی سے خدمت دیوانی اور مرتبہ امرائی کو پہنچا تھا، فن سپہ گری اور تدبیر جنگ کو خوب جانتا ہے۔[2]

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں ہندو امراء کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ہفت ہزاری	۲ نفر
شش ہزاری	۲ نفر
پنج ہزاری	۵ نفر
چار ہزاری	۵ نفر
ساڑھے تین ہزاری	۴ نفر
تین ہزاری	۱۳ نفر

---

[1] اخبار خلافت، بمبئی، ۲ نومبر ۱۹۲۳

[2] انتخاب لاجواب، لاہور، بحوالہ، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، حسین احمد مدنی، ص، ۴۹

ڈھائی ہزاری	۵ نفر
دو ہزاری	۱۶ نفر
ڈیڑھ ہزاری	۲۷ نفر
ایک ہزاری	۱۵ نفر

مسٹر ظہیر الدین فاروقی بیرسٹر مندرجہ بالا فہرست نقل کر کے فرماتے ہیں:

ان مختلف فہرستوں اور پھر دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب مرحوم ہندؤوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے لحاظ سے ہمیشہ بڑھاتا رہا، ہندؤوں کو اپنی سرکار میں ملازم رکھنے کے سلسلہ میں اس کا خیال تھا کہ مذہب کو دنیاوی امور کے بیچ میں لانا بے معنی ہے اور اس قسم کے معاملات میں مذہبی عصبیت کو راہ نہ دینا چاہیے۔[1]

دوسری فہرست اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کے ہندو امراء کی حسب ذیل ہے:

ہفت ہزاری	۳ نفر
شش ہزاری	۳ نفر
پنج ہزاری	۹ نفر
چار ہزاری	۵ نفر
تین ہزاری	۱۳ نفر

[1] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص، ۲۴،

ڈھائی ہزاری	۹ نفر
دوہزاری	۵ نفر
ڈیڑھ ہزاری	۴۰ نفر
ایک ہزاری	۸ نفر
۷ صدی	ا نفر
پانچ صدی	ا نفر
ایک صدی یعنی یوز باشی	ا نفر

ان منصب داروں کے علاوہ اکتالیس اور مختلف عہدوں پر ہندو امراء تھے، ہفت ہزاری منصب سب سے اونچا ہوتا تھا جس کے لیے حسب ذیل اشیاء مقرر تھیں:

گھوڑے ۴۹۰، ہاتھی ۱۴۱، اونٹ ۱۰۰، خچر ۲۰، چھکڑا ۱۶۰، تنخواہ ماہوار تیس ہزار روپیہ

نمبر دوم پنج ہزاری کی تنخواہ انیتس ہزار روپیہ تھی اور نمبر سوم کی تنخواہ اٹھائیس ہزار ماہوار تھی۔

اسی طرح ہر امیر کے حسب درجہ تنخواہیں اور وظائف تھے کہ آج وہم و خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ ہفت ہزاری ہندو امراء میں سے ساہو پسر مہاراجہ سیتا بھی تھا، اور پنج ہزاری امراء میں سے شیوا جی کا داماد راجندر جی اور مالوی بھونسلہ بھی تھا، اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں راجہ جے سنگھ (جس کے نام پر شہر جے پور ہے) پنج ہزاری منصب داروں میں سے تھا، راجہ جسونت سنگھ کابل کا گورنر تھا۔

چونکہ اورنگ زیب مرحوم کا زمانۂ سلطنت دراز اور طویل ہوا ہے، اس لیے امراء کی فہرستوں میں کمی زیادتی اور اختلاف ہونا لازمی امر ہے، ہر مؤرخ نے اپنے زمانہ کے اعداد و شمار کا ذکر کیا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم اپنے ایک فرمان مؤرخہ ۲۵ جمادی الاولی ۱۰۶۵ھ میں لکھتے ہیں:

ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیمی مندروں کو گرایا جائے، ہماری اطلاع میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اپنے گرد و نواح کے ہندؤوں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں سے ہے ان کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے، لہذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندؤوں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کرے۔[1]

یہ فرمان ابوالحسن حاکم بنارس کے پاس سلطان محمد بہادر کی معرفت بھیجا گیا تھا۔

کیپٹن الگزنڈر ہملٹن، جو کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا اور ۲۵ برس ہندوستان میں رہا تھا مگر کمپنی کا ملازم نہ تھا، سورت شہر کے بارے میں کہتا ہے:

اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن ان میں کبھی کئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات و طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذاہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔ پارسی بھی ہیں اور اپنے رسوم

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۲۱

مذہب زرتشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔[1]

عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ وہ پارسی ملازموں کو جو کہ تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کسی تجربہ کار متعبر مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے: "یا ایھا الذین آمنو لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء۔(ترجمہ: اے مومنو، تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ)

عالمگیر مرحوم نے عرضی پر مندرجہ ذیل حکم لکھا:

مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی "لکم دینکم ولی دین" (ترجمہ: تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین)۔ بادشاہ نے لکھا جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا، پادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔[2]

مندرجہ بالا شہادتیں صاف صاف روشنی ڈالتی ہیں کہ مسلمانوں کا عہد حکومت مذہبی تعصب اور فرقہ واریت سے پاک تھا۔ اس میں مساوات اور برابری کا سلوک تھا، ہر ہندوستانی کو خواہ کسی مذہب اور کسی برادری اور نسل سے تعلق رکھتا ہو حسب قابلیت حصہ ملتا تھا، کسی عہدہ انتظامی، فوجی، ملکی کا دروازہ کسی کے لیے بند نہ تھا۔ سب سے لطف و

---

[1] ظہیر الدین فاروقی، اورنگ زیب اور ان کا عہد، ص، ۲۰۲

[2] سید محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد اول، ص، ۱۲۳

احسان اور رحم و کرم اور ہمدردی کا معاملہ کیا جاتا تھا، تمام مذاہب کے ساتھ دریادلی اور رواداری کا معاملہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ مختلف مذاہب رعایا کو ملاجلا رکھا جائے اور ان میں اتحاد عمل پیدا کیا جائے۔ سب کی ترقی اور خوش حالی فارغ البالی کا انتظام اور خیال رکھا جاتا تھا، ظلم و ستم، ستانا اور تنگ کرنا بغیر کسی جرم قانونی کے روانہ رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان بادشاہوں نے رعیت کے دلوں میں جگہ کرلی تھی، بادشاہ لوہے کی سنگینیوں اور تلواروں اور آگ و بارود کی بندوقوں اور توپوں سے حکومت نہیں کرتا تھا۔ تمام امور حکومت میں رعایا کو دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں ہندوستان دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا اور ضرب المثل امن عام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔

میجر باسو لکھتا ہے:

> رعایا کی خوش حالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، دولت مندی اور آرام وچین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا، حالانکہ اس زمانہ میں رسل ورسائل کے طریقے اس زمانے جیسے ملک میں نہ تھے۔ ریلیں اور تار، موٹریں اور ہوائی جہاز، دخانی جہاز اور ٹیلیفون وغیرہ معدوم تھے، مگر انگریزی حکومت بالکل اس کے برعکس تھی، جیسا کہ ہم اوپر لارڈ ولیم بنٹنگ وائسرائے ہند کا قول نقل کر آئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔" اب سردمہری، خودغرضی، بے پروائی ہے جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔[1]

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۵۴

سر جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے:

وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائیگی کے لیے وہ مجبور کیے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے، قوانین کو جن کی تعمیل ان پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے انتظام میں ان کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان حقوق کے دیے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض کے انجام دینے کے لیے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔[1]

مگر افسوس ہے کہ انگریزی راج نے ہندوستان کی ان تمام خوبیوں کو (جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا) تقریباً مٹا دیا۔ اور ان کے بجائے تمام بداخلاقیاں اور برائیاں پیدا کر دیں۔ لارڈ میکالے کہتا ہے:

زمانہ سابق میں جس طرح زوردار اور بااثر لوگوں کو افیوں کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا انظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بے کار کر دے گا۔[2]

مسلم سلاطین حقیقت شناس تھے، وہ جانتے تھے کہ مذہبی اختلافات اور آپسی عناد کی بنا پر کسی بھی قوم کا جڑ سے اکھاڑ پھینکنا نہ آج ممکن ہے اور نہ پہلے ممکن تھا، لہذا سب ہی سلاطین نے ہندؤوں کے ساتھ نرمی اور رواداری کا برتاؤ اختیار کیا، انہیں اپنے کاموں میں شریک کیا، حکومتی معاملات میں انہیں اپنا مشیر کار بنایا، کیوں کہ ان کے تعاون کے بغیر ہندوستان میں حکومت کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر تاراچندر قم طراز ہیں کہ

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۵۵

[2] بحوالہ، روزنامہ خلافت، بمبئی، جلد، ۵، ۱۸ اگست ۱۹۲۶ء

جب فتحیابی کا طوفان تھم گیا اور ہندو مسلمان ایک پڑوسی کی طرح رہنے لگے تو بہت دنوں تک ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے انہوں نے ایک دوسرے کے خیالات، عادات واطوار اور رسم و رواج کے سمجھنے کی کوشش کی اور بہت جلد ان دونوں قوموں میں اتحاد پیدا ہو گیا۔[1]

مسلمانوں کے عدل و مساوات کے نظریہ نے ہندوستان میں حکمرانوں کی کامیابی میں بڑی مدد کی، انہوں نے ذات پات اور اونچ نیچ کی سماجی برائیوں کا خاتمہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سماج کا ہر طبقہ ان سے جڑ گیا، اور ان کے لیے یہاں حکومت کرنا آسان ہو گیا، پروفیسر حبیب نے تحریر کیا ہے کہ

رایوں (ہندو راجاؤں) نے اپنی حکومت میں ہندوستانی دستکاروں اور پیشہ وروں کو شہر کی فصیلوں کے باہر چھوڑ رکھا تھا، ترک شہروں میں داخل ہوئے تو یہ نچلے طبقے کے پیشہ ور بھی ان کے ساتھ داخل شہر ہوئے اور وہ پھر وہاں سے باہر نہیں آنا چاہتے تھے۔[2]

مذہب اسلام کی کشش اور جاذبیت، حکمراں طبقہ کے برتاؤ، دونوں قوموں کے اتحاد، صوفیوں اور سنتوں کی تعلیمات نے یہاں کے باشندوں کے دل جیت لیے، اب دین دھرم، زبان، علاقائی ذات اور نسل کے امتیازات ختم ہونے لگے، اور ہندو مسلم ایک ساتھ خوشگوار زندگی جینے لگے، ایک دوسرے کی خوشی میں شریک اور ایک دوسرے کے غم کو بانٹنے لگے، اور ایک خوشگوار سماج کی اچھی مثالیں دیکھنے کو ملنے لگیں۔ اس سلسلے میں بابر کی وہ نصیحت جسے اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو کی تھی، اس کا ایک ایک لفظ بابر کی روشن خیالی اور دور اندیشی کو بتاتا ہے، اسی طرح مسلم حکمرانوں کی رواداری، فراخ دلی اور رحم دلی کی عمدہ مثالیں پیش کرتا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر تاراچند، ہندوستان کے کلچر پر اسلام کے اثرات، ص، ۱۳۷،

[2] بحوالہ محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص، ۱۸۳

> اے فرزند، ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ تم اپنی لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹادو اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کو دلوں کو تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرنا، عدل وانصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ سے رعایا اور رعایا سے بادشاہ خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعہ اور سنیوں کے اختلافات کو نظر انداز کرتے رہو ورنہ اسلام میں اس سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، اختلافات رکھنے والے لوگوں کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملنے دو جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، تزک تیموری کا مطالعہ برابر کرتے رہو تاکہ سلطنت کے نظم ونسق کا تجربہ حاصل ہو۔[1]

بابر کو مؤرخوں نے وسیع النظر، دریادل، حوصلہ مند، بہادر، جاذب نظر، بذلہ سنج، مہذب، مہربان، رحم دل، عہد کا پکا، وعدہ کا پابند اور ضرورت مندوں کا مددگار جیسے اوصاف کا حامل بیان کیا ہے، کچھ مؤرخوں نے بابر کو قلندر کے نام سے بھی تحریر کیا ہے۔ فرشتہ اور دیگر مؤرخوں نے بابر کو موسیقی اور شعر وانشاء میں وحید العصر لکھا ہے۔ موسیقی میں اس نے نئے نئے سر اور تال ایجاد کیے ہیں، مذہبی لوگ، صوفیاء ومشائخ اور علماء کی بڑی قدر کرتا تھا، وہ رقص وسرود، ساز وآواز اور شراب وکباب کا بھی شوقین تھا۔ وہ ترکی اور فارسی زبان کا اعلی درجہ کا ادیب وشاعر تھا، ترکی زبان میں شاعری 'رسائل عروض' نامی کتاب لکھی، اس نے تحریر میں ایک خط جو 'خط بابری' کہلاتا تھا ایجاد کیا، بابر کا ایک قلمی دیوان 'استنبول' کے نام سے مشہور ہے جو رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

---

[1] محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص،۱۹۶

مسلم حکمرانوں کا ہندوستانی باشندوں کے ساتھ جو اچھا رویہ اور مساویانہ برتاؤ رہا ہے، اس کا سبھی نے اعتراف کیا ہے، چنانچہ کپتان الیگزنڈر ہملٹن سندھ کے ایک شہر ٹھٹہ کے بارے میں لکھتا ہے:

> یہاں ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے، لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے، ہندؤوں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح برتی جاتی ہے، وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے اگلے زمانے میں مناتے تھے، جب کہ بادشاہت خود ہندؤوں کی تھی، وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مردوں کے ساتھ ستی ہوں، صرف بنیوں کے پچاسی فرقے ہیں اور گو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زرتشت کے بموجب ادا کرتے ہیں، عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ وہ گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، اور بعض مرتبہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق عموماً شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے بدتر ہو جاتے ہیں۔[1]

احترام مذہب، احساس وطنیت، احترام علماء اور باہمی رواداری جو کہ ہندوستانیوں کے قدیم امتیازات تھے ان کی مسلمان بادشاہوں نے بھی پوری طرح حفاظت کی، انگریزوں کی طرح ان کا مقصد ہندوستان میں حکومت کرنے سے ہندوستان کو لوٹنا اور برباد کرنا نہیں تھا، مسلمان فاتحین اور انگریزوں میں ایک خاص فرق تھا، اور وہ یہ کہ مسلمان فاتحین کی خوش حالی اور بربادی ان کے نئے وطن ہندوستان کی خوش حالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھی اور ان کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے پھولے گی، اسی طرح ان کے بیٹوں کو بھی اپنے اسلاف کی

---

[1] سید محمد میاں، علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ص، ۹

یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں، وہ کاشتکار اور صنعت کاروں سے بھاری محصول تو لیتے تھے، لیکن وہ ان کی جیبوں کو جن سے دوبارہ فائدہ اٹھانا تھا از سر نو بھر بھی دیتے تھے لیکن انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا۔

جب انگریزوں کا نظریہ ابتدا ہی سے یہ تھا کہ ہندوستان سے زیادہ زیادہ فائدہ یورپ کے لیے حاصل کرے تو قدرتی طور پر ہندوستان کا مفاد اس مفاد کے مخالف تھا، اس کا فائدہ صرف اسی صورت میں تھا کہ ہندوستان بے کس اور بے حس مزدور کی حیثیت سے روپیہ کماتا رہے اور یورپ کے حوالے کرتا رہے، اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے لامحالہ انگریز کو صرف وہی صورتیں سوچنی اور عمل میں لانی تھیں جن سے ہندوستانیوں میں احساس وطنیت ختم ہوں، جن با حمیت حریت پسند جماعتوں یا افراد کا عام ہندوستانیوں پر اقتدار ہے اس کو ہٹایا جائے، ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کر دیے جائیں جن کی بنا پر وہ بھوکے اور قلاش ہو کر بھی انگریز کے وفادار رہیں، ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے اتنا خائف کر دیا جائے کہ وہ انگریز کے وجود ہی کو اپنی سلامتی تصور کریں۔ ان کی پالیسی تھی کہ ہندوستانیوں کی تعلیم کو ختم کر دو، ان کے فکر وتدبیر کے سرچشموں کو خشک کر دو، تاکہ یہ بہتر مزدور ثابت ہوں اور ابد الآباد کے لیے ان کی قسمت پر غلامی کی مہر لگ جائے، یہ تھا نظریہ خود غرض، کمینہ طبیعت گورے ساہوکاروں کا جو تجارت کے ساتھ قزاقی بھی کرتے تھے۔

برطانوی قبضے سے پہلے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور معاشرتی خوبیوں کا نقشہ سر تھامس رو نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، وہ لکھتا ہے:

> ہندوستان کا طریقہ کاشتکاری، بے مثل صنعت و دستکاری کے معاملے میں ان کی استعداد اعلی، ہر قریے میں ایسے مدارس جن میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہو ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد، اس کی عزت و عصمت و عفت کا پورا پورا لحاظ۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے

> ہوئے ہم غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے، ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستانیوں کو یورپی اقوام سے کسی طرح کم تر قرار نہیں دیا جاسکتا، اگر ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تہذیب وتمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔[1]

جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری کردیا، محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے جو اس کی حمایت میں وسط ایشیا میں جاکر لڑے، اس کے ہندو فوجی کمانڈر تلک نے اس کے ایک مسلمان عہدیدار کی بغاوت فرو کی، اور جب قطب الدین نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں ہی کو مقرر کیا اور ان کے بغیر سارا نظام درہم برہم ہوجاتا، مسلمان ہندوستان میں محاسبوں اور محرروں کو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، ہندوؤں ہی نے ان کی عمارتیں بنائیں جن میں پرانی چیزیں نئے حالات کے مطابق شامل کی گئیں، ہندو سناروں ہی نے مسلمان حکمرانوں کے سکے ڈھالے اور ہندو محاسبوں نے ہی ان کا حساب کتاب درست کیا، پنڈتوں نے ہندو قوانین پر عمل درآمد کرانے میں ان سلاطین کو مشورے دیے اور برہمن نجومیوں کی رائے سے حکومت اور دربار کے مختلف کام انجام پاتے تھے، مسلمان ہندوستان آئے تو انہوں نے اسے اپنا وطن بنالیا اور ہندوؤں کے قریب ہوئے، میل جول بڑھایا، اس لیے کہ دائمی مخاصمت وعناد کے ساتھ ان دونوں کے لیے زندگی بسر کرنا ممکن نہ تھا، اس میل جول سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی، ہندو مسلمان دونوں نے ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہم سایہ کی طرح زندگی بسر کرسکیں۔

---

[1] سید محمد میاں، علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ص، ۱۵

سیاسی نظام کی اچھائی برائی کا انحصار غلبہ و اقتدار کی قوت پر نہیں بلکہ ملک کے اچھے نظم و نسق پر ہے، لیکن ملک کا نظم و نسق ہر زمانے کے لیے یکساں نہیں ہو سکتا، بلکہ زمانہ اور ماحول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے،اس لیے ہر زمانہ میں مسلم حکمرانوں نے اسی زمانے کے معیار کے مطابق نظم و نسق قائم کیا۔ یہ سلاطین فاتح بن کر ہندوستان میں ضرور داخل ہوئے لیکن مفتوحین سے ان کا میل جول جیسے جیسے بڑھتا گیا ان دونوں کے جنگ جوانہ جذبات مٹ کر خوشگوار تعلقات پیدا ہوتے گئے۔ معاشرتی اور ثقافتی امتزاج کے ساتھ سیاسی تعلقات کا بہتر ہونا ضروری تھا،اس لیے مسلم حکمراں سیاسی نظم و نسق کو جلد سے جلد بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہے، تمام فرماں رواؤں کی یہی کوشش رہی کہ سرحدوں کی توسیع کے ساتھ ملک کے عام نظم و نسق میں ترقی ہوتی رہے۔

ہندو مسلمان کے میل جول سے نہ کوئی نیا مذہب بنا اور نہ بننا چاہیے تھا لیکن جیسے صنعت، فن تعمیر، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دونوں کے مذاق نے مل کر ایک معیار قائم کیا، جیسے دونوں کے میل جول نے گفتگو اور صحبت کے آداب مقرر کیے، ویسے ہی ان کے دلوں نے مل کر انسانیت کا ایک تصور بنایا جس کے سامنے سب کے سر جھکتے تھے اور جو سب کو برابر عزیز تھا،انسانیت کا یہ تصور اس زمانے میں ایک سہارا تھا جب کہ مغل سلطنت برباد ہو چکی تھی،اس پر اس وقت بھی اعتبار رہا جب لوگوں نے عام طور سے ایک دوسرے پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا،اس دور کی سماجی اور تہذیبی قدر و قیمت ہماری بہترین فنی یادگاروں سے کچھ زیادہ ہی ہے، ضرورت ہے کہ اپنی آخری محفل کے اس چراغ کو ہم پھر سے جلائیں اس کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھیں اور پہچانیں تاکہ ہمارے دلوں میں یہ اس پرانی بھولی ہوئی محبت کی یاد پھر سے تازہ کر دے۔

انگریزوں کے ذریعہ تہذیبی ومعاشرتی تبدیلیاں

انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب بھی ہندوستان پر حاوی ہونے لگی۔ انگریزوں نے ہندوستانی زندگی کے سبھی شعبہ جات میں اپنے اثرات چھوڑے۔ ہندوستان پر انگریزوں سے پہلے بھی غیر ملکیوں نے حکومت کی لیکن ان کا عمل دخل صرف انتظامیہ تک محدود تھا، ہندوستانی تہذیب وثقافت سے انہوں نے کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی، بلکہ یہاں کے بعض رسم ورواج کو اپنایا بھی اور بہت سے رسم ورواج میں اضافہ بھی کیا۔ یہاں تک کہ بعض راجاؤں اور بادشاہوں نے تو یہیں اپنی شناخت بھی بنائی۔ لیکن انگریز ان سے مختلف تھے، ان کی زبان، ان کا کلچر، رہن سہن اور رسم ورواج بھی مختلف تھے، اور وہ ہندوستان میں اپنا قانون، اپنا کلچر اور اپنی زبان کے تحت حکومت کرنا چاہتے تھے۔

۱۷۶۵ء سے لے کر ۱۸۳۲ء انگریزوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ تجارت بھی جاری رکھی جس پر ۱۸۳۳ء میں پارلیمنٹ نے پابندی عائد کر کے صرف حکومت کرنے کا حق رہنے دیا، لیکن انگریزوں نے کہا کہ یہ مخلوط عہد حکومت ہندوستان کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، نہ صرف اس لیے کہ اس عہد میں انگریزوں کے ہندوستانی مقبوضات میں تیزی سے اضافہ ہوا، بلکہ اس لیے بھی کہ اس عرصہ میں ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر انگریزی تہذیب و تمدن کا بہت گہرا اثر پڑا جس سے ہمارے ملک کی زندگی میں وہ تبدیلیاں واقع ہوئیں جنہوں نے مستقبل میں ہماری معاشرت کی کایا پلٹ دی،

انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کی اخلاقی بربادی اور سماجی بے راہ روی کی چند وجوہات ہیں، اول یہ کہ ابتداء میں جن انگریزوں کی آمد ہوئی اور جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور تھی وہ اصل میں گھٹیا اخلاق و کردار والے تھے اور اکثر ایسے لوگ بھی تھے جو کہ یہاں آکر ایسے ہی بد ترین اخلاق واعمال قصداً اختیار کر لیتے تھے، کمپنی کے ذمہ

دار لوگ ایسوں ہی کو اپنے اغراض کے لیے چنا کرتے تھے، چنانچہ مدراس کے ایک بڑے پادری نے ۱۶۷۶ء میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے:

> آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظروں میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہ جائیں، جو لوگ آتے ہیں ان میں بعض تو قاتل ہیں، بعض آدمیوں کو بھگالے جانے کا کام کرتے ہیں اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں:[1]

۱۶۰۰ء میں جب کہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ انگلستان کو درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تب گورنمنٹ کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا تھا کہ تم اپنی مہم میں سر ایڈورڈ مائیکل بوردن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں کمپنی کا عجیب و غریب حسب ذیل ریزولیوشن بھیجا گیا:

> کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لیے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفاء کو نوکر رکھنے سے کمپنی کے حصہ دار شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔

مذکورہ بالا شہادتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے چھٹے ہوئے بدمعاش، بدکار، غنڈے اور جرائم پیشہ لوگ ہندوستان بھیجے جاتے تھے، ایسے لوگوں کے اقتدار اور ان کی کثرت سے جو کچھ نتائج قبیحہ پیدا ہوں گے وہ ظاہر و

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص،۸۸

باہر ہیں۔ علاوہ ازیں جو انگریز انگلستان میں جرائم پیشہ نہیں بھی تھے، ان لوگوں کی صحبت اور مال دار بننے کی شدت حرص اور طمع اور سزا سے بے خوفی کی بناء پر یہاں بدترین جرائم پیشہ بن جاتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز (جو کہ ہندوستان کا مشہور گورنراور ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھنے والوں میں سے نمبر اول شمار کیا جاتا ہے) کہتا ہے:

> انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے، جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔[1]

یہ ہیسٹنگز وہی ہے جس نے انتہائی وحشت اور بربریت سے روہیلہ قوم اور ان کی حکومت کو محض تھوڑے سے لالچ میں نواب اودھ سے ساز باز کر کے برباد کر ڈالا، جس کی ملعون بداعمالیوں کا پول اس مقدمہ کی تفصیل سے کھلتا ہے جو ان پر انگلستان میں قائم کیا گیا تھا۔ مگر ایسے وحشی درندے بھی اس زمانہ کے انگریزوں کی بداعمالیوں کے شاکی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ یہاں آئے اور انہوں نے کیسی کیسی زہریلی گیس ہندوستان میں پھیلائی۔

ہسپانیوں وغیرہ کے شرمناک مظالم امریکہ وغیرہ میں تو مشہور ہیں ہی، مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے جو مظالم اور ملعون بداعمالیاں ہندوستان میں کی ہیں وہ ڈچوں، پرتگیزوں، ہسپانیوں وغیرہ کے مظالم سے بدرجہا زائد اور ننگ انسانیت تھے، اور ان کا کیریکٹر سب سے زیادہ گرا ہوا تھا۔ ایسے کیریکٹر والوں کی وجہ سے جو کچھ اخلاق و اعمال کی بربادی اور جس قدر ان کی وجہ سے ملک میں ابتری پیدا ہو سکتی تھی، وہ ظاہر و باہر ہے۔

ان بداعمال اور بداخلاق کیرکٹر والے انگریزوں نے حسب طبع اپنے گرد اگرد ہندوستانیوں میں سے بھی ایسے ہی بداطوار لوگوں کو جمع کر لیا اور ان کے ذریعہ سے لوٹ، مار، غارت گری اور انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم کر دیا، ان

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص،۱۴۶

ہی ہندوستانی لوگوں میں ایک بنیا لوگوں کی جماعت بھی تھی، جس زمانہ میں کمپنی کی مشغولیت محض تجارتی تھی اور کمپنی کے ملازمان ملک کے حالات سے ناواقف تھے تو اکثر چھوٹے ملازموں سے جو بنیے کہلاتے تھے کام لیا کرتے تھے۔

مسٹر برک ان بنیوں کے متعلق مندرجہ ذیل کلمات لکھتا ہے:

> بینا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے، وہ ان تمام چال بازیوں، فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم کی سزا سے بچنے کے لیے ایک غلام استعمال کرتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے، استحصال بالجبر کرتا ہے، غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں سے اپنے صاحب کو بھی دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر برباد کر دیے ہیں، ملک کو برباد کر دیا ہے اور سرکاری مال گزاری کو بھی سخت نقصان پہنچایا ہے۔[1]

خود حکام وقت انگریز ان کے ذریعہ ذاتی نفع حاصل کرتے تھے، چنانچہ بہت سے علاقے بنیوں کے نام ٹھیکے پر دیے جاتے تھے، لیکن اصلی ٹھیکہ داروں کی بدولت پرانے پرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمین داریوں سے بالجبر اور ملک کے دستور کے خلاف بے دخل اور محروم کر دیے گئے، اس وقت کے قانون کی رو سے ایک شخص کو ایک لاکھ سے زیادہ مال گزاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا، مگر بڑے بڑے انگریزوں کے بنیے قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکہ دار تھا، ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند بھی وارن ہیسٹنگز کا آلہ کار تھا اور اس کی نسبت دارالعوام میں جولائی ۱۷۸۵ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رو سے گنگا گوبند سنگھ کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپیے کے قریب پہنچتی تھی۔

[1]حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۴۷

اسی گورنر ہیسٹنگز کے دیوان رام چند کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا، مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ روپے کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے مرنے پر نوے لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہی وہ بنیے تھے جن کو خاک سے اٹھا کر انگریزوں نے آسمان پر پہنچادیا، پہلے ٹھیکوں کے ذریعہ بڑی جائیدادوں پر قابض ہوئے اور پھر دوامی بندوبست کے بعد مالک بن گئے۔ آگے چل کر سود وغیرہ محدود کر دیا گیا اور قرضوں میں آراضیان اور جائیدادیں نیلام ہونے کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ ان قوانین سے قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہو گئے اور بڑے بڑے علاقے ان نئے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ پرانے زمین داروں پر ان بنیوں نے جو ظلم کئے اور جن جن فریبوں کے ساتھ انہیں لوٹا اس کا اندازہ صرف دیبی سنگھ کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ دیبی سنگھ بھی کلکتہ کی حکومت کے محبوب بنیوں میں سے تھا، چنانچہ بنگال کے بڑے بڑے علاقے اسی کو ٹھیکہ پر دیے گئے تھے، دیبی سنگھ باعزت لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات میں رکھتا اور اضافہ کا اقرار کراتا تھا۔ اس نے مال گزاری کے علاوہ نئے نئے محصول اور ابواب ایجاد کر لیے تھے، اور جب زمیندار پر بقایا ٹوٹتی تو اس کی زمین داری سستے داموں نیلام کرا کر خود مول لے لیتا اور یہ قیمت بھی اسی روپیہ سے ادا کرتا جو ان ہی زمین داروں سے پیشگی وصول کر چکا ہوتا۔ اس بنیے نے اکثر معافیاں چار چار آنہ بیگھ کے حساب سے مول لے لی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے اور بقول مسٹر برک زمیندار گھر بار اور نوکر چاکر سب چھوڑ کر نکلے اور بھاگنے سے پہلے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ او قاف نیلام ہو رہے ہیں جو خود انہوں نے یا ان کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لیے دے رکھے تھے کہ ان کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے لولوں اور اپاہجوں کی امداد کی جائے۔ وہ جائدادیں بھی جو انہوں نے کفن دفن اور مرنے کی رسموں کے لے علیحدہ کر رکھی تھیں فروخت کر دی گئیں، افسوس کہ جاں کنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گزر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا، قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا۔

انگریز حکمرانوں کو اپنے خلاف مزاج سچی باتیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں اور اس وجہ سے وہ اچھی اور حق بات کہنے والے لوگوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے تھے، اور اپنی مراعات و نوازشات ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھتے تھے جو خوشامدی، انگریزوں کے مفاد کی باتیں کرنے والے اور ہندوستانیوں کے مفاد تیئں غیر سنجیدہ ہوتے۔ پھر یہی نہیں ہوا کہ ایسے جرائم پیشہ بداخلاق اور بداعمال لوگ ایک مرتبہ آکر ملک میں بس گئے بلکہ ایسے لوگوں کی آمد کا دوامی طور پر تانتا بندھ گیا۔ ہر سال ایک جماعت اپنی حرص و طمع پوری کر کے اور چند سال یہاں لوٹ مار، غارت گری اور وحشیانہ درندگی عمل میں لا کر لوٹتی تھی اور دوسری جماعت ویسی ہی آدھمکتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ ایسے بدکردار انگریزوں کے اقتدار، ملک کے گوشہ گوشہ میں ان پھیل جانے اور آزادانہ طور پر ایسی بداعمالیاں کرنے سے ملک کی ثروت اور دولت تو برباد ہوئی ہی تھی، ان ہندوستانی لوگوں کے اخلاق اور اعمال بھی بہت زیادہ بگڑ گئے جو انگریزوں کے حاشیہ نشیں اور کارکن تھے۔ وہ انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے ہر قسم کے خطروں سے اپنے آپ کو محفوظ پاتے تھے اور من مانی کاروائیاں کرتے تھے۔ نیز عام ہندوستانیوں پر یہ اثر پڑا کہ جو عادتیں اور اخلاق پہلے سے بری سمجھی جاتی تھیں ان کی برائی ان کے دلوں سے جاتی رہی۔ اس لیے عام طور پر جعل سازی، بداخلاقی، ظلم و ستم کا ماحول پورے ملک میں پھیل گیا۔

ہندوستانیوں کی اخلاقی اور سماجی زوال کی دوسری وجہ یہ بنی کہ کہ انگریزوں کی بے آئینی، لوٹ اور غارت گری، دولت اور ذرائع دولت کی بربادی کی بناء پر لاکھوں اور کروڑوں افراد اور خاندان فاقہ مست اور کنگال ہو گئے۔ اس لیے جان بچانے اور اپنی اور بال بچوں کی زندگی کو سنبھالنے کے لیے وہ مختلف قسم کے جرائم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان اخلاق اور عادات میں مبتلا ہو گئے جو کہ شرافت انسانی کے لیے موجب ننگ و عار ہیں، اور جن کو وہ مذہبی یا اخلاقی حیثیت سے برا سمجھتے تھے، ملعون غلامی اور ہلاک کر دینے والے فقر و فاقہ نے ان کو ایسی عادتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ انگریزوں نے جو طرز حکومت قائم کیا، اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے گئے،

اور یہی سبب ہے کہ یہاں کے پرانے تاجروں پر بہت جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

مسٹر سیول میرٹ ممبر کونسل ۱۸۳۶ء میں لکھتا ہے:

> برطانیہ کا دور حکومت مہربان و مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے، اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت لوگ خوش حال تھے، یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔[1]

افلاس اور غربت کے انتہائی درجہ پر پہنچ جانے کے بعد طبعی طور پر انسان ایسے اخلاق اور اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے جو کہ نہ صرف شرافت اور اعلی معیار کے مخالف ہوں بلکہ وہ عموما انسانیت سے گزر کر درندگی اور وحشت و بربریت کے بدترین مظاہروں پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ چوری کرنے اور اچکے پن کو عمل میں لانے، ڈاکے ڈالنے، لوگوں کو قتل کرنے، ٹھگی اور دھوکہ بازی کو اختیار کرنے، بے حیائی اور فواحش کے کرنے اور کرانے اور اس قسم کے دیگر گھٹیا اور مکروہ اعمال کا بیشتر ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ انگریزوں نے عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا کبھی خیال نہیں کیا، روپیہ کمانے اور ہندوستان کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرنے کا نصب العین دن ورات ان کے سامنے رہتا تھا۔ ان کو ہندوستانیوں کی بھلائی کی طرف کوئی التفات نہ تھا، ہندوستانی جئیں یا مریں، ان کا کیریکٹر بنے یا بگڑے، اس سے انہیں کچھ لینا دینا نہیں تھا، ان کو تو اپنا الو سیدھا کرنا تھا، سو انہوں نے کیا۔

ہندوستانی باشندوں کی اخلاقی اور معاشرتی بے راہ روی کی تیسری وجہ یہ ہوئی کہ حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں سے ہندوستانیوں کو یک قلم خارج کر دیا گیا، تمام بڑے عہدوں پر انگریزوں نے انگریزوں ہی کو مقرر کر دیا،

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۵۱

بلکہ جس ادنی سے ادنی عہدے کو بھی انگریز قبول کر سکتا تھا اس پر انگریز ہی کو مقرر کیا گیا، ہاں جو عہدے بہت چھوٹے تھے ان پر ان ہندوستانیوں کو باقی رہنے دیا گیا جو انگریزوں کی پوری طرح چاپلوسی اور مخبری کرتے تھے، خواہ وہ ہندوستانی قوم کے لیے کیسی ہی اور کتنی ہی مضر کیوں نہ ہوں۔

انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کو روزگار سے ہٹایا جانا نہ تو اخلاقی طور پر اور نہ ہی قانونی طور پر کسی بھی طرح صحیح نہیں تھا۔ اس لیے کہ شہنشاہ دہلی سے جو فرامین انگریزوں نے حاصل کیے تھے اور جن کے ذریعہ سے دیوانی کے اختیارات ان کو ملے تھے ان میں شرط تھی کہ وہ ان شاہی نظامات کی جو کہ پہلے سے چلے آرہے تھے پوری طرح حفاظت کریں گے۔ مگر انگریزوں نے ان نظامات کی بہت تھوڑے دنوں تک مراعات کی اور پھر رفتہ رفتہ ان کو توڑنا شروع کر دیا۔ کیوں کہ ان کے باقی رکھنے میں انگریزوں کی وہ لالچ اور طمع پوری نہیں ہوتی تھی، جس کو وہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے اور جس کے لیے وہ تمام ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کر انگلستان کے خزانوں کو پر کر سکتے تھے اور اپنی خواہشات کو پوری کر سکتے تھے۔

اسی کے بارے میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' میں لکھتا ہے:

> سو سب سے بڑی ناانصافی وہ ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں ان کا یہ دعوی ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقت ور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔[1]

[1] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص، ۲۲۸

بہر حال انگریز بحیثیت ملازمت شہنشاہی فرمانوں، معاہدوں اور شروط کے ذریعے سے مالیات کے ناظم بنائے گئے تھے جن میں اسلامی نظام کر برقرار رکھنا مشروط تھا۔ مگر انہوں نے رفتہ رفتہ سب کو توڑ ڈالا اور تمام عہدوں سے ہندوستانیوں کو نکال کر انگریزوں اور خوشامدی لوگوں سے بھر دیا، اور نیا نظام ایسا بنایا کہ جس کا خرچ بہت زیادہ تھا اور انگریزوں کے لیے ہندوستانیوں کے خون چوسنے کا بہت زیادہ سامان ہاتھ آتا تھا۔ مگر انگریزی عیاری یہ تھی کہ خلاف واقعیت پرانے نظام کو یک طرفہ، اصول انسانیت کے خلاف، ناکارہ اور تہذیب کے لیے باعث ننگ مشہور کر کے اسے ختم کیا جائے۔ حالاں کہ یہ بات انگریزی نظام میں پائی جاتی ہے، پرانا نظام جب تک رہا ہندوستان باتفاق پھیلتا اور پھولتا اور ترقی پذیر رہا، اور جب سے نیا نظام انگریزی قائم ہوا ہندوستان روز بروز بربادی کے بھینٹ چڑھتا رہا اور بالآخر ہلاکت کے انتہائی مرحلہ پر پہنچ گیا، جیسا کہ مسٹر فلب فرانسس، جو کہ بنگال کاؤنسل کا ممبر تھا، لکھتا ہے:

> ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے، میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز رہا، مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔[1]

بہر حال انگریزوں نے عروج اور قوت پاتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ذمہ دار عہدوں سے خارج کر دیا، قوانین بنانے میں، ملک کے باشندوں کے درمیان انصاف کرنے میں اور اس طرح کے دیگر معاملات میں ان کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا، عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سر ٹھامس منرو کو بھی بخوبی ہوا، جس کا اظہار انہوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

---

[1] حکومت خود اختیاری، ص،۹۷، بحوالہ برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۵۳

> قوانین کے عمل درآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے، بہ استثناء چند نہایت چھوٹے عہدوں کے کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول، نہیں پہنچتے، وہ ہر جگہ ایک ادنی قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں، تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینز کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے۔[1]

اس طرح ذمہ دار عہدوں سے نکل جانے کی بناء پر ہندوستانیوں کے کیریکٹر اور اخلاق پر نہایت مضر اور ہلاکت خیز اثرات پڑے اور وہ گندے اخلاق میں مبتلا ہو گئے۔ انگریزی نظام حکومت نے ہندوستانیوں کو اخلاقی اور سماجی حیثیت سے انتہائی پستی میں ڈال دیا۔ سینکڑوں زمین دار، ہزاروں سپاہی اور بے شمار ملازم بے روزگار ہو گئے اور انھوں نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ملک کے تمام ذمہ داری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کے خارج ہونے اور بے روزگاری کے عام ہو جانے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اعلی انتظامی قابلیت کی نشو و نما کرنے کے مواقع جاتے رہے اور جو کچھ بھی ان کی قابلیت تھی وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہوتی گئی، اس کے ساتھ ان کے مالی تنزل نے ان کے اخلاق و کیریکٹر کو اس درجہ تک گرا دیا جس پر مظلوم اور محکوم قومیں پہنچ جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں کی اخلاقی بربادی کی چوتھی وجہ نظام عدلیہ اور قانون کی تبدیلی ہے۔ خاص طور سے وہ قوانین جن کا تعلق مالیات سے یا فوجداری یا انتظامی امور وغیرہ سے ہے۔ یہ سب قوانین عدل و انصاف اور ان کی عملی کاروائیاں زمانۂ سابق میں نہایت سادہ اور بے خرچ تھے، ان میں فریقین کو نہ تو دور دراز کے اسفار کی زحمتیں پیش آتی تھیں، نہ مہینوں اور سالوں کے انتظار اور دوڑ دھوپ تکالیف ہوتی تھیں اور نہ ہی سرمایہ اور دولت کی بربادی کی مصیبتیں سامنے آتی تھیں۔ ان قوانین کی رو سے عموماً حقیقی اہل حق اپنے حق کو پہنچ جاتے تھے۔ عیاری، مکاری، فریب و دھوکہ بازی، رشوت اور جعل سازی وغیرہ پاس بھی نہیں پھٹکتی تھیں۔ اس نظام عدلیہ کے اجراء کے دو طریقے تھے، ایک

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۵۴

رعایا کی طرف سے دوسرا بادشاہوں کی طرف سے، ہر دو طریق میں رعایا پر ایک پیسہ کا بھی بوجھ نہیں پڑتا تھا، اول الذکر کا معاملہ یہ تھا کہ رعایا کی طرف سے گاؤں گاؤں میں پنچایتیں قائم تھیں جو کہ بمنزلہ حکومت خود اختیاری کے تھیں، گاؤں کے پنچ مدعی اور مدعا علیہ کے چال چلن، ان کی عادتوں اور اخلاق، مقامی رسوم اور حالات سے بخوبی واقف ہوتے تھے، گواہوں اور قسم کھانے والوں کو بخوبی پہچانتے تھے، فریقین کی زبانوں کو جانتے تھے اس لیے عموماً فیصلے صحیح اور حق ہوتے تھے، ہر گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ وہیں یا اس کے قریبی مقام میں ہو جاتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی بد چلن یا بد معاش گاؤں میں رہ سکے کیوں کہ گاؤں کی پنچایت کو اختیار تھا کہ وہ بد معاش، بد چلن اور چور کو سزا دے سکے۔

سر ٹھامس منر و اسی پنچایتی نظام کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے:

> ہر موضع مع اپنے بارہ پوردوں کے مثل ایک چھوٹی سی ریاست کے ہے جس میں اس کے مقدم پٹیل یا راڈی بطور اس کے سردار کے ہیں۔ اور ہندوستان اسی قسم کی ریاستوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے، جنگ کے زمانہ میں باشندوں کی نظر اپنے گاؤں کے سردار کی طرف ہوتی ہے، جب تک کہ ان کا موضع محفوظ اور سالم ہے گاؤں کے باشندے سلطنتوں کے ٹوٹنے اور تقسیم ہونے کے بارے میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے، وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے کہ ملک کس ہاتھ میں منتقل ہوتا ہے، ہر صورت میں اندرونی نظام غیر مبدل رہتا ہے۔ ان تمام حالات میں گاؤں کا سردار بدستور اپنے گاؤں کا کلکٹر مجسٹریٹ اور کاشتکاروں کا سردار رہتا ہے۔ [1]

ثانی الذکر یعنی بادشاہوں کی طرف سے جو انصاف کا طریقہ جاری تھا اس کی کیفیت یہ تھی کہ بادشاہوں کی طرف سے ایسی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جو کہ برائے نام شاہی تھیں، ان پر بادشاہ کا اثر نہیں تھا۔ ان میں مسلمانوں کے معاملات قرآن شریف اور فقہ اسلامی کی رو سے اور ہندوؤں کے معاملات دھرم شاستر کی رو سے طے ہوتے تھے، اور

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۵۶

ان کی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی امور میں بادشاہ بھی شرعی فیصلوں کے تابع ہوتے تھے۔اس مضمون کو انگلستان کے مشہور مقرر اڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں خوب واضح کیا تھا۔ جس کے چند الفاظ حسب ذیل ہیں:

> جناب والا میں ایشیا کی حکومتوں کی نسبت جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو خود سری کے اختیارات حاصل نہ تھے، اور اگر کسی کو تھے تو وہ انہیں کسی دوسرے کو سپرد نہ کر سکتا تھا، میں پر زور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ مشرقی ممالک کی حکومتیں خود مختارانہ کا نام تک نہیں جانتیں، ایشیاء کا بڑا حصہ مسلمان حکمرانوں کے تحت میں ہے اور اسلامی حکومت کے معنے ہی قانونی حکومت کے ہیں، عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس لیے رعایا سے لے کر بادشاہ تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب دونوں کے پابند ہیں، اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی اس مضمون کی دکھادے کہ اس کی رو سے کسی کو خود مختارانہ اختیارات حاصل ہیں تو میں تسلیم کروں گا کہ میں نے اس کا اور ایشیا کے حالات کا بیکار مطالعہ کیا ہے، قرآن شریف میں ایک لفظ بھی اس بارے میں نہیں ہے، برخلاف اس کے اس قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے، اس قانون کی شرح کرنے والے علماء یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضگی سے محفوظ ہے، جسے بادشاہ ہاتھ نہیں لگا سکتا ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے، بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے۔[1]

برخلاف اس کے انگریزی نظام میں بجائے مواضعات کے صدر مقامات میں جو گاؤں سے تیس چالیس میل یا کم و بیش فاصلہ پر ہوتے، وہاں جا کر عدالتیں قائم ہونے لگیں۔اور پھر انصاف ہونے کا انحصار اس امر پر ہوتا کہ مدعی اور

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص،۱۹

مدعاعلیہ کے پاس کافی روپیہ اور اثر ہو،اور جو شخص جائز و ناجائز طریقوں سے روپیہ کما کر عدالتوں میں اور حکام کے یہاں حاضری دیتا رہتا وہ تمام گاؤں پر غالب ہوتا۔ پھر متوسط لوگوں کی آمدنی چونکہ بہت زیادہ گھٹ گئی اور گھٹتی ہی جارہی تھی، اس لیے وہ عدالتی کاروائیوں کے اخراجات نہیں اٹھا پاتے۔اب کلکٹر صاحب کے ہاتھ میں سب اختیارات ہو گئے، وہ گاؤں سے بہت دور کے فاصلہ پر رہتے، ہندوستانیوں بالخصوص غیر انگریزی تعلیم یافتہ اور دیہاتیوں سے خلط ملط اپنی کسر شان اور خودداری کے خلاف اور اپنے لیے ہتک عزت سمجھتے تھے، اس لیے وہ ہندوستانیوں کے چال و چلن سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے، گاؤں کا بدترین شخص حکام رسی کر کے اپنا اثر اور رسوخ قائم کر لیتا اور کلکٹر صاحب سے پروانہ وغیرہ حاصل کر کے لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتا۔ کاش یہ حالات حکام اور عدالتوں تک ہی محدود رہتے تب بھی ضرر اور نقصان برداشت کیا جاسکتا تھا، مگر افسوس ہے کہ عدالتیں تمام ملک کے لیے مرکز اور نمونہ بن گئیں تھیں۔ مثلاہر روز ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے اشخاص کسی نہ کسی حیثیت سے انہیں عدالتوں کی طرف کھنچے چلے جاتے۔لوگ جب صبح اٹھتے توان میں سے کچھ لوگ تو حاکم اور عمال، بیرسٹر اور وکیل، مدعی مدعاعلیہ، عرضی نویس اور محرر، گواہ اور دلال کی شکل میں کچہریوں کا رخ کرتے،اور جو لوگ پیچھے رہ جاتے وہ تمام دن مقدمات کے نتیجوں کے انتظار میں رہتے،اور رات کو بیٹھکوں اور چوپالوں میں بیٹھ کر بقایا لگان اور اضافہ لگان، پٹوارہ اور داخل خارج کے چرچوں میں مصروف رہتے اور ان معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سازشیں کرنے اور جھوٹی شہادتیں مرتب کرنے میں مصروف رہ کر بدترین بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔انگریزوں کے ذریعہ متعارف کئے گئے اس نظام عدلیہ کے بارے میں لارڈ میکالے لکھتا ہے:

> بہت کم انگریز ایسے ہوں گے جو اس امر کو تسلیم نہ کریں گے کہ انگریزی قانون باوجود حال کی ترقیوں کے نہ تو سستا ہے اور نہ اس کی رو سے فیصلے جلد ہوتے ہیں، پھر بھی ہمارے ملک یعنی انگلستان میں اس کا نشو و نما ہو گیا، بعض امور میں وہ ہمارے محسوسات کے مطابق ڈھال دیا

> گیااور بعض امور میں ہمارے محسوسات رفتہ رفتہ اس کے مطابق ڈھل گئے ہیں، ہمیں اس کے بد ترین نقائص کو برداشت کرنے کی بھی عادت ہوگئی اور اس لیے اگرچہ ہم اس کی شکایت کیے جاتے ہیں، تاہم اس کی ہم پر ایسی ہیبت طاری نہیں ہوتی جیسی کہ ایک معمولی سی نئی تکلیف دہ چیز کی ہوتی ہے، مگر ہندوستان میں بالکل مختلف حالت پیدا ہوگئی ہے، انگریزی قانون جو انگلستان سے لایا گیا ہے اس میں وہ تمام برائیاں ہی موجود نہیں ہیں جن سے ہم انگلستان میں تکلیف اٹھا رہے تھے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہیں اور وہ ایسی برائیاں ہیں جن کے مقابلے میں انگلستان کی بد ترین برائیاں ہیچ ہیں، وہ قانون جو کہ انگلستان میں دیر طلب ہے، اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ دیر طلب ہے جہاں کہ ہر جج کو اور ہر بیرسٹر کو ایک مترجم کی امداد درکار ہوتی ہے۔[1]

انگریزوں کے اس نظام کی وجہ سے ہندوستان میں قانون اور اس کا اجرا بہت زیادہ مہنگا ہو گیا۔ ہندوستان میں ہر انگریز کا معاوضہ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف سے لے کر ایک سائیس یا گھڑی ساز تک کا انگلستان کی شرح سے کہیں زیادہ ادا کیا جاتا۔ چنانچہ ہندوستان میں وکیلوں کی جو فیس ادا کی جاتی وہ انگلستان کی فیس سے کم از کم تین گنا زیادہ ہوتی، ہندوستان کے لوگوں کو جو تکلیف دہ تاخیر اور بے جا خرچ انگریزی قانون کی وجہ سے پیش آتا ہے وہ اس کو ان نقائص کے مقابلے میں جو اس قانون کے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے پیش آتے، زیادہ اہم نہیں سمجھتے۔ ان کی عزت، ان کی فطرت، ان کے مذہب، ان کی عورتوں کی عفت کے قومی محسوسات کو اس انگریزی نظام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مال کی کاروائیوں میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ مال گزاری کے بقایا میں لوگ گرفتار کیے جانے لگے، دراں حالیکہ ایک معزز ہندوستانی کے لیے گرفتاری محض نظر بندی نہ تھی، بلکہ بد ترین ذاتی بے عزتی تھی۔ ہر مقدمہ کی ہر منزل پر حلف لیے جانے لگے، دراں حالیکہ معزز ہندوستانیوں کے نزدیک یہ طریقہ بہت برا اور تکلیف دہ تھا، مشرقی ممالک میں معزز گھرانوں کے

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۵۸

زنان خانہ میں غیر آدمی کا داخل ہونا یا عورتوں کے چہرہ کو دیکھ لینا ایک ناقابل برداشت زیادتی سمجھی جاتی تھی، بنگال، بہار اور اڑیسہ کے نہایت معزز خاندانوں کو اس قسم کی بے عزتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان عدالتوں اور ان کے قوانین سے ہندوستانیوں کے اخلاق اور اعمال پر نہایت ہی زہریلا اثر پڑا اور ان کے اخلاق انتہائی درجہ میں گرتے چلے گئے اور ہر طرف بداخلاقیوں اور بداعمالیوں کا دور دورہ ہو گیا۔

ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر انگریزی حملہ کے خلاف اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ

انگریزی تہذیب و تمدن کے پھیلنے اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور سماجی ہم آہنگی کے ختم ہونے سے ہندوستانی باشندے ایک بے چینی اور تشویش کی کیفیت سے گزر رہے تھے، اپنے سماجی اور معاشرتی نظام کی حفاظت کے تئیں وہ کافی سنجیدہ نظر آنے لگے تھے اور حفاظتی تدابیر کے لیے فکر مند تھے، سماج کے مختلف طبقات اور گروہوں کی طرف سے اس ضمن میں کوششیں جاری تھیں، ان میں سے ایک جماعت اردو ادیبوں اور صحافیوں کی بھی تھی۔ اردو صحافت نے اس ضمن میں لگاتار قابل تعریف کوششیں کیں، مختلف اخبارات نے انگریزی چال سے لوگوں کو باخبر کیا، انگریزی کلچر کے مضر اثرات سے عوام کو روشناس کرایا اور انگریزی مظالم سے بے پرواہ ہو کر اس موضوع پر خوب لکھا۔

اس دور کا ایک اہم اخبار طوطیٔ ہند ہے، یہ اخبار ۱۱/مارچ ۱۸۸۱ء کو میرٹھ سے جاری ہوا، یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا اور اس کے مدیر میرٹھ کے مشہور شاعر محمد مرتضی یزدانی تھے۔ اس میں یوں تو سبھی طرح کی خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے، لیکن ایک اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ انگریزوں کے آنے کے بعد مشرقی و مغربی تہذیبوں کے مابین جو تصادم کی صورت پیدا ہوئی تھی، اس اخبار میں ان مباحث پر کافی مضامین شائع ہوئے تھے، طوطیٔ ہند انگریزی حکومت کا حامی اور مغربی تہذیب کی خوبیوں کا قائل ہونے کے باوجود مشرقی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پوشاک کے موضوع پر اخبار لکھتا ہے:

فرض کیجیے اگر یورپی پوشاک ہم نے اختیار کی تو ہمارے دینی تعلقات کو تقویت پہنچ سکتی ہے، ہرگز نہیں بلکہ خلاف شرع اطہر تبدیلی و تنسیخ پوشاک سے دینی خیالات میں خلل واقع ہوتا ہے جو محض بے سود و ناحق ہے، ۱۵۰۰ برس پیشتر تک لوگوں کے ایسے خیالات نہ تھے جیسا کہ زمانہ موجودہ میں پائے جاتے ہیں، جوں جوں مغربی تہذیب کو ترقی ہوتی جاتی ہے خود ہم کو اپنی حالت سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ اس انقلاب زمانہ کا خدا ہی حافظ ہے۔ کسی ملک کی تہذیب سیکھنے میں اگر اپنی قدیمی تہذیب ہاتھ سے چھوڑ دی جائے تو محض خلاف فطرت انسانی ہے، بشریت تو وہی خوب ہے کہ اپنی متاع میں دیگر ممالک کے سرمایے کو افزوں کریں نہ یہ کہ اپنا لباس اتار کر جامہ عاریت سے نئی سج دھج پیدا کریں۔[1]

ایک جگہ اور اس اخبار نے اسی موضوع پر لکھا:

چند روز سے اخباروں میں یہ بحث نظر سے گذرتی ہے کہ آیا اپنی قدیم پوشاک استعمال میں لائی جائے یا جدید جو مغربی شائستگی نے ایجاد کی ہے، ایک فریق اس بات پر رضامند ہے کہ مغربی پوشاک بہ اعتبار چند فوائد اعلانیہ کے عمل میں لائی جائے اور فریق ثانی مخالف اول کا ہے، ہمارے بزرگوں نے عام اس سے کہ وہ اہل اسلام ہوں یا ہنود، پوشاک موجودہ کی ایجاد جس میں بہت سی ترمیم و تنسیخ بڑے بڑے دین کے اصولوں سے کی ہے ممکن نہیں کہ ہم اس میں ردوبدل کر سکیں، ہاں بے شک کر سکتے ہیں مگر ناخلفی و کافری کی تہمت سے نجات نہیں پا سکتے۔[2]

---

[1] طوطیٔ ہند، ۱۰ جون ۱۸۸۱ء

[2] بحوالہ، طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص، ۶۲۸

تہذیب ہی کی بحث کے سلسلے میں ایک اور مضمون اس اخبار میں شائع ہوا، اس کے راقم کوئی ریحانی صاحب (غالباً سید سجاد حسین ریحانی) ہیں۔ مضمون میں مسئلے کو ایک اور رخ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

> میں اپنے ملک کے ان اصلاح کنندوں سے اتفاق نہیں کرتا جو ہمیشہ مشرقی اور مغربی تہذیب کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں، یعنی مشرق سے مغرب کو کیا حاصل ہوا اور مغرب سے مشرق کو کیا ملا۔ بخوبی خیال کر لینا چاہیے کہ قومی تہذیب یا سیویلائیزیشن کے اصول نہ تو مشرقی ہیں نہ مغربی۔ نہ وہ انگلستانی ہیں نہ ہندوستانی۔ نہ وہ گوروں سے مخصوص ہیں اور نہ کالوں کی میراث ہے۔ وہ تو انسانی ہے۔ انصاف صداقت، جرآت آزادی، خود مختاری اور محنت انسان کے حقوق ہیں اور انہیں سے قوم صاحب عظمت ہو جاتی ہے۔ حب الوطنی بے شک بڑی قوی ہے۔ مگر ایسی حالت میں جب وطن کی معقول اور بجا محبت ہو۔ حقیقی حب الوطنی اپنے ملک کی کمزوریوں اور غلطیوں کے پاس اور طرفداری کا نام نہیں۔ بلکہ ملک کی نیکوئی اور راستی کی سچی محبت کا نام حب الوطنی ہے۔ ورنہ حب وطن اور ہٹ دھرمی میں کیا فرق؟[1]

اخبار نے واضح الفاظ میں لکھا کہ نئی تہذیب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگرکھے، کرتے، عمامے، چوغے وغیرہ اتار کر کورٹ، پتلون، جیکٹ اور ترکی ٹوپی زیب تن کر لیں، اپنی رسوئی اور دسترخوان کو چھوڑ دیں اور چھری کانٹے سے میز کرسی پر کھانا کھائیں، لاحول ولا قوۃ۔ اخبار کے نزدیک نئی تہذیب کے معنی یہ تھے کہ انگریزی علوم کو کلیتاً اپنا لیا جائے اور ان علوم کو اردو زبان میں منتقل کیا جائے، تاکہ آنے والی نسلیں ان علوم کی مدد سے اپنی حالت کو بہتر بنائیں، ان میں غور و فکر کا مادہ پیدا ہو، نیز کلیں ایجاد کریں، زراعت و تجارت کے اصول قائم کریں، تعلیم کو ترقی دیں، کیوں کہ قوم کی نیک نامی اور بلند پروازی کا یہی وسیلہ ہے، جو لوگ انگریزی پوشاک پر مرمٹے ہیں، ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ یا

---

[1] طوطیٔ ہند، ۳ جون ۱۸۸۱ء

حضرت آج تک کسی انگریز کو بھی آپ نے ہندوستانی پوشاک پہنے ہوئے دیکھا ہے یا آپ ہی ان کی تقلید پر دل دیے پھرتے ہیں۔

اودھ اخبار جو اردو زبان وادب کی خدمت اور اسے فروغ دینے میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، وہ مغربی تہذیب اور کلچر کا ناقد بھی تھا، انگریز خود کو مہذب سمجھتے تھے اور ان کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے کچھ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں بھی ان کی تہذیبی برتری کا تصور تھا، اس اخبار نے ایک موقع سے انگریزی تہذیب کی اصلیت اور حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

> ولایت کا تو ہم ذکر نہیں کرتے کیوں کہ وہ مرکز تہذیب ہے، ہندوستان ہی میں ان کی تہذیب نے وہ غضب ڈھایا ہے کہ الامان والحفیظ۔ ہمارے کان میں ہر مہینہ یہ آواز پہنچتی ہے کہ فلاں صاحب کی میم صاحبہ کو فلاں صاحب لے کر بھاگ گئے، اور ان پر وہاں نالش ہوئی اور فلاں پہاڑ پر یا فلاں بنگلہ پر گرفتار ہوئے۔ میم صاحبہ نے بعد گرفتاری کے اقرار کیا کہ ہم خوشی سے چلا آیا، ہم اپنے صاحب سے راضی نہیں ہیں، یہ صاحب ہم کو پسند ہے اور یہ واقعات کچھ مزدوروں، قلیوں میں نہیں ہوئے، بلکہ کوئی فوج کا کپتان صاحب یا کرنل صاحب ہوتے ہیں۔ کوئی کسی محکمہ کے افسر ہوتے ہیں، کوئی کسی جگہ کے رئیس ہوتے ہیں، پس جب ایک مہذب قوم کے جنٹلمین اور شرفا کا یہ حال ہو کہ اغوائے عورت اور جرم زنا میں سزایاب ہوں اور پھر ہمیشہ اس کے ارتکاب میں ثابت قدم و پختہ دم رہیں تو اس قوم کے ارزال اور غیر مہذب لوگوں کا کیا حال ہوگا۔"[1]

[1] بحوالہ: ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ۴۸۴

اودھ پنچ جس وقت منظر عام پر آیا اس وقت تک پورا ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا، ایک طرف تو سیاست واقتدار کے اعتبار سے ہندوستان غلامی کے دور سے گزر رہا تھا، دوسری طرف تعلیم، تہذیب اور بود و باش کے عام طور طریقوں میں بھی انگریزوں کی اندھی تقلید کرتے ہوئے انگریزی کلچر کا غلام بنتا جا رہا تھا، ہندوستانیوں کے ایک مخصوص طبقہ کی وکالت کی وجہ سے یہ احساس عام ہو رہا تھا کہ تہذیب و تمدن کے صحیح وارث انگریز ہی ہیں اور ان کے مقابلے میں ہندوستانی غیر مہذب، اجڈ اور وحشی ہیں، لہٰذا ہندوستانیوں کو متمدن اور مہذب ہونے کے لئے مغربی تہذیب و تمدن کو آنکھیں بند کر کے پورے طور پر اپنا لینا چاہیے تاکہ دنیا میں ان کا بھی شمار مہذب لوگوں میں ہونے لگے، اودھ پنچ اس غلامانہ ذہنیت کا مخالف تھا، مشرقی اقدار وروایات کی پاسداری اس کا نصب العین تھا، اس لیے اس نے انگریزی تہذیب و تمدن اور طرز زندگی کی سخت مخالفت کی اور جو لوگ اس جدید تہذیب کے حامی و طرف دار تھے ان پر بھی تنقید کے زبردست وار کئے، اس اخبار نے مغربی تہذیب کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کر کے ان میں پائی جانے والی خامیوں اور اخلاق سوز گوشوں کو عیاں کیا اور اس طرح اس نے مغرب زدگی کے انتہا پسندانہ رجحان پر گرفت کر کے اعتدال و توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، یوں تو اودھ پنچ کی فائلوں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے مضامین موجود ہیں جو انگریزی تہذیب و تمدن کے خلاف لکھے گئے ہیں لیکن ان تمام کے ذکر کرنے کا نہ تو یہ موقع ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش، ذیل میں ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس میں طنز و ظرافت کے تیز تیر چلائے گئے ہیں:

> شیک ہینڈ کرتا ہوں میں اس ریفارمر سے دنیاوی ترقی حاصل کرنے کی غرض سے، عہد کرتا ہوں کہ تجاوز نہ کروں گا ایک قدم بھی اس راستے سے جو راستہ میرا ریفارمر مجھے بتلائے (چاہے وہ جہنم کا راستہ ہو)، نہ واسطہ رکھوں گا دین اور ایمان اور کل مذہبی خیالات سے کسی طرح، مقدم سمجھوں گا خوشنودی یورپ والوں کی خدا کی خوشنودی پر، تعمیل کروں گا ان کے احکام کی احکام الٰہی کو چھوڑ کر، نہ فرق کروں گا حلال حرام میں قولاً یا فعلاً، نہ گرد پھٹکوں گا

> ان ڈھکوسلوں کے جن کو فرض، واجب یا سنت مستحب کہتے ہیں، جھٹلاؤں گا حدیثوں کو، باطل سمجھوں گا اس کلام کو جس کو نادان اللہ کا کلام سمجھتے ہیں، حقیر سمجھوں گا ان لوگوں کو جو پابند ہوں گے مذہب کے، پلٹا دوں گا قرآن وحدیث کے معنیٰ کو۔[1]

درج بالا مضمون میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جنہیں مغرب کی ہر چیز میں خوبیاں ہی خوبیاں اور مشرقی اقدار میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی تھیں، وہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تہذیبی، سماجی اور مذہبی امور میں بلا جھجھک کمیاں بیان کرتے اور انگریزوں کی تعریف وتوصیف کر کے اپنے مذہب پر اعتراض کرتے، اس اخبار کے مضمون نگاروں نے مغربی تہذیب وتمدن اور اس کی ظاہری چمک دمک کے کھوکھلے پن کو واضح کرنے کے لئے ہر طرح کے طنزیہ ومزاحیہ نمونے پیش کئے، اس اخبار میں فرضی خطوط کی اشاعت کا ایک سلسلہ جاری کیا گیا تھا جس میں مغربی تہذیب اور وہاں کے بود وباش کو بیان کر کے بڑے خوبصورت انداز میں اس کی خرابیوں اور کمیوں کو منظر عام پر لایا جاتا تھا، ذیل میں ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں مغربی طرز معاشرت اور وہاں کے رہن سہن کو بڑے پُر لطف انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس خط کو نواب سید محمد آزاد نے 'سعید ازلی' کے فرضی نام سے لکھا ہے، وہ خود کو لندن میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے ایک طالب علم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، اور انہوں نے 'مائی ڈیر عفت بیگم' کے نام یہ فرضی خط لکھا ہے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ خط ہندوستان میں ہی بیٹھ کر لکھا گیا ہے چوں کہ آزاد کبھی لندن نہیں گئے تھے، اس خط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد انگریزی تہذیب ومعاشرت سے کس قدر واقف تھے اور اس کے تمام گوشوں پر ان کی کیسی نظر تھی، خط کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

> مائی ڈیر عفت بیگم!

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد اول، ۱۰ جولائی ۱۸۷۷

میرا پہلے پہل بسم اللہ مجریہا و مرسیا کہہ کر دریائے فراق میں کشتی ڈالنا اور بندرگاہ بمبئی سے جہاز دخانی پر چڑھنا کہ تمھاری فرقت مجھ پر سوار ہوئی، اکثر راتوں کو جہاز میں تمھارے گیسوئے مشکیں، موباف سرخ اور گرمئی ملگجے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا مگر جب سے اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا ہے، روز بروز صدمۂ مفارقت گھٹتا گیا اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی، اب بخدا تمھاری محبت اسی قدر اور اسی طرح کی مجھے ہے کہ جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا یا کسی پیارے جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے، اس کے معنی یہ نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمھاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمھاری حالت کا جب کہ میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو تم بالکل ایک نیم وحشی چارپایہ بن کر میرے دیدۂ تصور میں آتی ہو اور میں نہایت اس سے پچھتاتا ہوں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی، کیوں نیم وحشی گوشت کے ایک ہلنے ڈولنے والی چیز کو میرا باپ بنایا گیا اور کیوں تم سی معصوم نیم وحشی آدمی کے دائمی عیش و آرام کا میں ضامن ٹھہرا، کوہ قاف، سبز پری، لال پری، زرد پری، نیلم پری، سڑ پٹر پری کے قصے لڑکپن سے سنا کرتا تھا اور ان قصوں کو خیالی باتیں جانتا تھا مگر تمھاری جان کی قسم پریوں کا ملک یہی ہے۔ یہاں کی عورتیں آزادی کی ہوا کھا کر جیتی ہیں، ہر قسم کی تعلیم پاتی ہیں، ہر مجلس و محفل میں بے تکلف جاتی ہیں، گاتی ہیں، بجاتی ہیں، ناچتی ہیں، ہر قسم کے مردوں کو خوش کرتی ہیں، عمدہ سے عمدہ شرابیں پیتی ہیں، سواریوں پر سیر کو نکلتی ہیں....۔

میں تو یہاں پڑھنے کو آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں، کوئی آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینہ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا، جب کسی فرنگی کی واٹر سلک گون پر آنکھیں پڑ جاتی ہیں مجھے تمھارا گرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے، جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلف ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمھاری شرم ایک تیر کی

طرح دل کے پار ہو جاتی ہے، جب ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار اور ذہانت جودت سے بیس بیس جنٹل مین یعنی شریف مردوں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت اس کا تاسف ہوتا ہے کہ تم میرے عزیز مردوں کو دیکھ کر اس طرح سے مرجھا جاتی تھیں جس طرح سے لجالو... بھلا تم ہی خیال کرو کہ تم میں اور ایک جانور میں کیا فرق ہے، کھانا، پینا، سونا یہ سب کچھ تو ایک حیوان کو بھی نصیب ہے، تم اگر تھوڑا سا کام اپنی موٹی عقل سے لو تو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ دنیا ایک قدرتی عیش خانہ ہے اور بندگان خدا اس میں عیش و آرام کرنے آئے ہیں نہ کہ قیدی بن کر پاگل خانے اور مرغی خانے میں رہنے۔[1]

مغربی تہذیب اور اس کے چرچے سے اس اخبار کو کس قدر الجھن ہوتی تھی اس کا تھوڑا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

تہذیب! تہذیب!! تہذیب!!! سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے ہیں، جدھر دیکھو تہذیب ہی تہذیب، اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب، ہگنے موتنے میں تہذیب، یا الٰہی! تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہو گئی۔ ادھر انگریزی ہوئی ادھر دنیا میں تہذیب پھیلی، شرابی مہذب، بھنگیری مہذب، اس سرے سے اس سرے تک سب مہذب، دنیا میں بڑے فعل چاہے کیوں نہ کرے تہذیب میں وہ نہیں آئیں گے، یہ سب تو درکنار بعضے خدائی فوج دار ملکی ڈھنڈورچیوں کی تہذیب نے ناک میں دم کر دیا، روز نصیحت کے بہانے خدائی بھر کی آئیں بائیں شائیں بکا کرتے ہیں۔[2]

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد دوم، ۳۰ جولائی ۱۸۷۸

[2] اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد اول، ۸ مئی ۱۸۷۷

آزادیٔ نسواں اور بے پردگی، عورتوں میں انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے حامیوں اور علمبرداروں کی تحریکوں اور کوششوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہوئے منشی سجاد حسین نے اس اخبار میں ایک مضمون 'سہل لٹکہ' کے عنوان سے لکھا، مضمون سے ایک اقتباس پیش ہے:

> آج کل بعض خواہ مخواہ کے روشن خیال گروہ میں اس بات کی سخت کوشش ہو رہی ہے کہ جس طرح ہو عورتوں کا پردہ اٹھادیا جائے، ساری برکتیں اس میں مخفی ہیں اور مسلمانوں کی یہ ردی حالت اسی کی بدولت پہنچی ہے۔ بی صاحب نے پردہ اٹھایا، چہرہ بے نقاب کا جلوہ دکھایا اور دنیا کی بہبود و ترقی گدا گد آسمان سے گرنا شروع ہوئی، مردوں کا پڑھنا، لکھنا، کام کاج ہونا، کچھ ضروری نہیں، صرف عورتوں کو پردے سے نکالیں، درشتی ہنڈیاں بھنانا شروع کریں، چنانچہ اس گروہ کے ٹنڈیل ہمارے میاں محب حسین صاحب حیدرآبادی اٹھ کھڑے ہوئے اور لگے کوشش کرنے، آپ جانئے مدتہا مدت کی پرانی زنگ خوردہ رسم کو اٹھانا کوئی ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں، ایک ذری سا قفل ہوتا ہے اس کے کھولنے میں لوہے لگ جاتے ہیں اور یہ تو آہنی دیوار ہے، کٹتے کٹتے کٹے گی۔ پس ایں جناب نے آسانی کے خیال سے ایک ایسا نسخہ تجویز کر دیا ہے اگر محب حسین صاحب بجائے اس جھگڑے فساد کے جاری کر دیں تو پردہ آپ سے آپ پھٹ کے جگر عاشق یا چھوٹی ہوئی مہتاب یا چاندی مار اکتاں ہو جائے، پھر نہ مردوں کو غیرت، نہ عورتوں کو حجاب، تہذیب و ترقی کا مرغا آٹھوں پہر ککڑوں کوں بولا کرے۔[1]

اسی طرح کے ایک اور مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> روشن خیال ریفارمروں کو چھچھوندر کہاں گھسیٹ لے گئی، کس بل میں گھس رہے، ذرا ادھر وار کو آئیں، زبانی جمع خرچ، خالی خولی بتولے بازیوں، بے کار کی ٹھائیں ٹھائیں، مفت خدا کی

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و چہارم، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۰۰

جھائیں جھائیں سے کام نہیں چلتا۔ تعلیم تلقین کا نہیں عملی کاروائی کا زمانہ ہے، آتش فشاں پہاڑ کے مادے کی طرح زور شور سے خروج کر آیا۔ اگر اس موقع پر کاندھی دی تو سمجھ لیں کہ اصلاح کی بدھیا بیٹھ جائے گی۔ تہذیب اور شائستگی کا مزہ دار پھل جو سوسائٹی کے درخت میں آیا ہے اسے وحشت کا کیڑا کھوکھل کر ڈالے گا۔[1]

اودھ پنچ کے مشہور نامہ نگار نواب سید محمد آزاد نے فرضی خطوط کا جو سلسلہ اس اخبار جاری کیا تھا، اسی سے ماخوذ ایک خط کا اقتباس پیش ہے، اس خط میں ڈیر پاپا (والد بزرگوار) کو خطاب کر کے لندن کی تہذیب و معاشرت کا جس طنزیہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

... یہاں کے ہوٹلوں اور مکانات عام میں اکثر نوکروں کی جگہ خوبصورت، طرح دار، تربیت یافتہ، چست اور چالاک کم سن عورتیں ہیں اور یہی لوگ ہر قسم کا کام، دن کو اور رات کو دیتی اور کرتی ہیں، اور اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش کرتی ہیں کہ آدمی ان پر جان دینے لگتا ہے۔ حضور کے سر مبارک کی قسم، میری تو یہ کیفیت ہے کہ بے اختیار ان کو مارے محبت اور اخلاق کے گلے سے لگانے کو جی چاہتا ہے، حضور اگر دس ہزار روپیے سے میری تائید کریں تو میں یہیں شادی کر سکتا ہوں اور ایک بڑی قابل، حسین اور صاحب جائداد دلہن کو لے کر وہاں آسکتا ہوں، اس کی طرف سے کورٹ شپ کے لیے اصرار ہے مگر میں نے چونکہ حضور کی مرضی اس بارے میں دریافت نہیں کی، اس لیے مجھ کو اب تک انکار ہے، اگر میری شادی میری پسند کے موافق ہو جائے اور میں اپنی بی بی کو لے کر وہاں آؤں اور چورنگی میں برلب میدان ایک ہوادار اور پر شوکت ایوان میں رہوں تو اس وقت حضور دیکھ سکتے ہیں کہ میری ولایتی بی بی اپنی لیاقت اور اخلاق سے کلکتہ کی اعلیٰ درجہ کی صحبتوں میں کیسی رسائی پیدا کر سکتی

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد بست و ششم، ۲۴ جولائی ۱۹۰۲

> ہے، روز کتنے دیسی، سویلین اور ملٹری، جن کو خداوند کہتے کہتے آپ کی زبان خشک ہوتی ہے، میری میز پر صبح و شام کھاتے پیتے اور ناچتے گاتے ہیں، اور ہم لوگوں سے اور یورپین لوگوں سے کیسی بے تکلفی اور دوستی رہتی اور ہوتی ہے۔[1]

انگریزوں نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے اور حکمراں بننے کے بعد غلاموں کی طرح ہندوستانیوں کو دیکھا، ان سے ملاقات کرنا اپنے پاس بیٹھانا گوارہ نہیں کیا، ان کو طرح طرح سے ذلیل کیا، ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک روا رکھے، عدل و انصاف میں بھی ہندوستانیوں کے مقابلے میں انگریزوں کو فوقیت دی، چنانچہ ان توہین آمیز سلوک کے خلاف ہر موقع پر ہندوستانی اخبارات نے لکھا احتجاج کیا، لیکن حکمراں طبقے نے کوئی اثر نہیں لیا۔اس طرح کے واقعات تہذیب کے دعویدار انگریزوں کا غیر مہذب، غیر جمہوری اور انسانیت سوز برتاؤ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

انگریزی عمل داری میں جھوٹ، بے ایمانی، بے شرمی اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے بیزاری جس طرح سے عام ہورہی تھی، ہندوستانیوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ ان کی عدم ترقی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قدیم طریقوں سے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں، اس لیے ان کی یہ حالت ہے۔اس کے متعلق زیر نظر مضمون میں بات کی گئی ہے،

> قاعدے کی بات ہے کہ بازار میں جس جنس کی طلب ہوتی ہے لوگ اسی کی ہم رسانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔یہی حال آج کال کے زمانے میں ہمارے طرز تعلیم کا سمجھیے۔جب تک ہندوستانی عملداری رہی لوگ عربی فارسی کی تکمیل پر جان دیتے رہے۔ اب زمانہ نے کروٹ لی۔ انگریزی علوم کا چرچا مدارس میں ہونے لگا۔اسی طرح طرز معاشرت نے بھی ایک عجیب پلٹا کھایا ہے۔لباسوں میں، بات چیت میں، روزانہ میل جول میں فرق بین نظر آتا ہے۔کلی دار

---

[1] "مائی ڈیر پاپا"، آزاد، بحوالہ طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی، ص ۷۷-۷۸

پائیجامہ، چپکنی قبائیں، اب کسی کے بدن پر نظر نہیں آتیں۔ علی ہذاالقیاس، بازار عالم میں اب اگلے زمانہ کے اخلاق وآداب معاشرت بھی کھوٹے روپیہ سے زیادہ وقیع نہیں۔ نیا سکہ ہے۔ نیا چلن ہے۔ مگر ہمارے ہندوستانی بھائی جن کے مزاجوں میں جودت اور طبیعتوں میں ایجاد پسندی اور اختراع کامادہ بہت کم ہے ابھی اسی پرانے گھرے پر چلتے نظر آتے ہیں۔ میری رائے میں ہم ہندوستانیوں کی منزل ترقی تک پہنچنے کی سد راہ اور قومی ادبار کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر بنے ہوئے اگلوں کے اخلاق کی کتابوں پر حد درجہ مرے دہرے ہیں کہ عالم بھر تو اپنا کام ایمانداری بی ایمانی، جائز ناجائز صورتوں سے بے دھڑک بلا شرم ولحاظ نکال رہاہے اور یہ اسی طرح خواب خرگوش میں پڑے ایمانداری ایمانداری پکار رہے ہیں۔ زمانہ بھر تو جھوٹ سے بے تکلف فوائد کمایئنبغی حاصل کر رہاہے۔ مگر آپ زمانے سے بے خبر سچ بولو سچ بولو کے وعظ سے کان کے پردے اڑائے ڈالتے ہیں۔[1]

انگریز ہندوستان میں سماجی اور معاشرتی برائیوں کے فروغ دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے، اور بعض مرتبہ بہت ہی گھٹیا اور خسیس حرکات بھی کر جاتے تھے، ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جسے اودھ پنچ نے اپنی خبر بنا کر انگریز حکمراں کی خبر لی:

۶ فروری ۱۸۷۷ کو صاحب سیٹی مجسٹریٹ بہادر کے اجلاس میں نواب محمد جعفر علی خان صاحب عرف پیارے صاحب ساکن بناگاؤں پر ایک خواص کی جانب سے نان ونفقہ دلا پانے دعوی دائر ہوا۔ مدعیہ کے بیان سے ثابت ہوا کہ مدعیہ نواب صاحب کے محل میں خواصوں میں نوکر تہی (تھی) حسن اتفاق سے نواب صاحب سے آشنائی ہو گئی۔ جب حمل رہا تو بیگم صاحبہ کے رشک وحسد سے اوس (اس) کو برطرف کر دیا۔ آخر الامر نوبت بعدالت پہنچی۔

[1] اودھ پنچ، جلد چہاردہم، ۱۲جون ۱۸۹۰ء

حاکم منصف مزاج نے ماہوار کی ڈگری دی۔ خبر مندرجہ بالا سے اس شہر کے ایک عالی خاندان شخص کی وضع پر دو الزام واجبی عائد ہوتے ہیں۔ اول تو آقا ہو کر خادمہ سے ملوث ہونا، دوسرے بعد حرکت ناشائستہ ایسی بے حمیتی کرنا کہ جس سے معاملہ طشت از بام ہوا۔ پس جس شہر کے امراءورؤسا کے چال و چلن کی یہ صورت ہو تو اوس شہر کی نیکنامی کا خدا حافظ۔[1]

ہر طرف تہذیب تہذیب کے ہنگامے اور شور سن کر اودھ پنچ کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے:

آپ کے اخبار گوہر بار میں اکثر تہذیب کا ذکر دیکھنے میں آیا۔ مگر اب تک ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کس تہذیب کس جانور کا نام ہے، کس پہاڑ پر بسیرا لیتی ہے۔ کس کھیٹ کی مولی ہے۔ کس درخت کا پھل ہے۔ کس زبان کا لفظ ہے۔ کیا اس کے معنی ہیں۔ بندہ پرور تہذیب ایسی زبردست ظالم چیز ہے کہ اس کے نام سے تمام خلقت ایسا خوف کھاتی ہے جیسے مسلمان روزہ سے یا ہندو برت سے۔ ڈینگو فیور کی والدہ ہے۔ حیضہ کی خالہ تخفیف کی پردادی، ٹیکس کی نانی، خلقت کی تباہی کا سبب جہاں کی بربادی کا موجب اور لکھنو میں تو چاروں طرف سے لگی چلی آتی ہے۔ مہتممان ریل اور خدامان جہاز کا دم ناک میں ہے کہ خشکی و تری کی راہیں مسدود، الٰہی تہذیب ہے یا روس کا لشکر۔ بالفعل ہم کو ایک ضرورت سے سفر کا اتفاق ہوا۔ وہاں تہذیب کے معنی بخوبی معلوم ہو گئے۔[2]

اسی طرح کا ایک اور مضمون 'بندر کی تہذیب' کے عنوان سے اخبار میں شائع ہوا:

یوں تو ہندوستان بھر کو بندر انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ مگر آج کل دہلی والوں کو ایک بندر نے خوب تگنی کا ناچ نچایا ہے۔

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۳ فروری ۱۸۷۷ء

[2] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۲ جون ۱۸۷۷ء

صاحب تحفہ کشمیر فرماتے ہیں کہ دہلی میں ایک وہم لوگوں کو یہ ہوا ہے کہ ایک بندر یہاں چند روز سے آیا ہے وہ عورات کے گال کاٹ لیتا ہے۔اسی خوف سے ہر عورت اپنے گالوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے۔۱۹جون کو ایکبار گی شہر میں ہلچل پڑ گئی۔لینا، لینا، یہ آیا، وہ آیا، ہا، ہا، ہٹو، ہٹو، ایک طرف یہ غل، ایک طرف چھت سے چند مرد اور ایک حاملہ عورت اڑادھڑیم سے نیچے آرہی۔

حضرت اودھ پنچ کا قول ہے کہ دہلی قابل افسوس ہے۔اس جلسہ قیصری کی برکت نے بیچاری دہلی کی عورت کے ماتھے گئی، اچھی طبیلے کی بلا بندر کے سر پر پڑی۔ مگر واللہ وہ بھی کیا ہی مزیدار جانور ہے۔اجی کہیں فسانہ عجائب کے عاشق تن، جان عالم نہ ہوں۔ یا کسی انگریز کی روح ہو گی کیونکہ انہیں سر محفل بوسہ باسی کی لت ہوتی ہے۔ یا کوئی افیونی گورا پلٹن سے پٹہ توڑ کر بھاگ آیا ہو گا۔[1]

انگریزوں کی ہر بات کی اندھی تقلید کرتے ہوئے ان کی ہر چیز میں خوبی ہی خوبی کا شور مچانے والوں پر طنز کرتے ہوئے اخبار لکھتا ہے:

تعجب ہے کہ حال کی شائستہ قوم اور اس زمانے کے نئی روشنی والے بے چارے ٹھیٹھ ہندوستانیوں پر بڑا اعتراض یہی کرتے ہیں کہ وہ زمانے کی موافقت نہیں کرتے اور بڑے شدو مد سے یہ اصول گویا کسی نئے علمی مسئلے کی طرح سکھایا جاتا ہے کہ زمانے کی موافقت کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہر چیز کی تہذیب کی ترقی ہوئی ہے کہ یعنی خدا کی تہذیب، نیچر، رسول کی تہذیب، اپنی رائے، حج کعبہ کی تہذیب، سفر لندن، عمامہ کی تہذیب، کھلی ہوئی چپت گاہ، پاجامہ کی تہذیب، پتلون، مسواک کی تہذیب، پر کا قلم، قدم چوں کی تہذیب،

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۰ جولائی ۱۸۷۷ء

پاٹ آبدست کی تہذیب بھی بڑھ گئی ہے۔یعنی زمانے کی موافقت یوں کرو کہ اگر کوئی کہہ دے کہ کوا کان لیے جاتا ہے تو کوے کے پیچھے دوڑو اور کان کو نہ ٹٹولو۔ یہاں تک کہ کوے کو گرفتار کرو، اس کی تلاشی لو، جب کان نہ ملے تب اور جگہ ڈھونڈو، جب کہیں پتہ نہ لگے تب اپنے کان کو ٹٹولو اور پھر ایک اشتہار جاری کرو کہ تجربے سے معلوم ہوا کہ کان کے واسطے کوے کے پیچھے دوڑنا فضول ہے۔ پہلے اپنے کان ٹٹول لو، بعد اس کے دوڑو۔ اس پر تمام دنیا میں تعریف ہو کہ سبحن اللہ کیا حکیمانہ خیالات ہیں۔ دیکھیے کیا اچھا تجربہ ہاتھ آیا۔[1]

ہر میدان میں ہندوستانیوں کی تذلیل اور انگریزوں کی توقیر کے معاملہ کو سامنے رکھتے ہوئے 'پند نامہ' کے عنوان سے اس خوبصورت تحریر کو ملاحظہ کریں:

چار چیزوں کو چار چیزیں ضرور ہیں، کالوں کو ذلت، گوروں کو بے جا حکومت، روم کو نصرت، روس کو ہزیمت۔ چار چیزیں بے چار چیزوں کے بے رونق ہیں، پاوں بے بوٹ، سر بے ہیٹ (انگریزی لمبی ٹوپی)، جسم بے کوٹ پتلون، منہ بے چرٹ۔ چار چیزیں ہندوستان کی تبرک ہیں، گرانی، خشک سالی، تخفیف اور ٹیکس۔ چار چیزیں سبب نیک بختی ہیں، چندہ دینا، چوں نہ کرنا، ہاں میں ہاں ملانا، دیوالہ نکالنا۔ چار چیزیں سبب بد بختی ہیں، راست گوئی، صاف دلی، کالا رنگ، اطاعت۔ چار چیزیں محال ہیں، سول سروس کا عہدہ، دیسی ریاستوں میں خوش انتظامی، انگریزوں میں میل جول، ہندوستانیوں سے بے وفائی۔ چار چیزیں آب حیات ہیں، مدد، چنڈو، افیون، شراب۔ چار چیزیں موجب ذلت و خفت ہیں، اولاد کو پیار نہ کر کے تعلیم میں ہلاک کرنا، بیواوں کی شادی، اولاد کا چھوٹ پن میں نہ بیاہنا، ایجاد۔ چار چیزیں مخصوص چار چیزوں کے لیے ہے، پڑھان نوکری کے واسطے، اتفاق ولایت کے لیے، نفاق ہند کے واسطے۔ ذات کی

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۲۲ جولائی ۱۸۷۷ء

زنجیر ہندؤوں کے واسطے۔ چار چیزیں بے فائدہ ہیں، اخباروں کی خریداری، کتابوں کی سیر، حال کی طرز تعلیم، گورنمنٹ سے التجا۔ چار چیزیں ہندوستان کے لیے مخصوص ہیں، جاہلی، کاہلی، غلامی، بے پروائی۔ چار چیزیں برائے نام ہیں۔ نئی روشنی، روسیوں کی جواں مردی، انگلینڈ کی دوستی، حکام کی خوشنودی۔ چار چیزیں بالکل بے مصرف ہیں، شکر گذاری، دربار دہلی کے خطاب، لارڈ لیٹن کے اسپیچ، روسی سردار۔ چار چیزیں چار جگہ کم ہیں، بادلوں میں پانی، ہندوستان میں غلہ، گورنمنٹ ہند میں رعایا کی رعایت، روس کی شجاعت۔ چار چیزوں کو زوال نہیں، حکام کی خودرائی کو، ہمارے مسائل کو، رشوت کے بازار کو، اودھ پنچ اخبار کو۔"[1]

اس طرح اودھ پنچ نے انگریزی تہذیب و تمدن کے خلاف بہت کچھ لکھا اور ہندوستانی باشندوں کی تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کی پاسداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مذکورہ بالا اخباروں سے ماخوذ اقتباسات کے علاوہ بھی انیسویں صدی کے بہت سے اخبارات ہیں جنھوں نے اردو صحافت کی تاریخ میں نوآبادیات مخالف کردار ادا کیا ہے۔ انگریزی حکام کے ذریعہ کئے جانے والے تہذیبی، معاشرتی اور معیشتی حملوں سے ہندوستانی عوام کو باخبر کیا اور انگریزی تہذیب و کلچر کی حقیقی اور مہلک خرابیوں اور گندگیوں سے باشندگان ہند کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جو کہ اردو صحافت کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۶ نومبر ۱۸۷۷ء

باب پنجم

نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ

- انگریزوں سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی صورت حال
- انگریزی دور اقتدار میں ہندوستان کی تعلیمی صورت حال
- مسلم دور حکمرانی میں روزگار کی حالت
- انگریزی دور اقتدار میں روزگار کی حالت
- برطانوی تعلیمی و ملازمتی پالیسی کے خلاف اودھ پنچ کا رویہ

نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی اور اقدام اور اودھ پنچ کا رویہ

انگریزوں سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی صورت حال

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی بھی حکومت کے اولین فرائض اور بنیادی اصولوں میں یہ امر شامل ہے کہ وہ اپنی حکومت کے باشندوں کے لیے حصول علم کے مواقع فراہم کرے اور رعایا میں علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلائے، اور اس کے ذریعہ وہاں کے باشندوں کے اخلاق و کردار، تہذیب و ثقافت، ملکی معیشت اور وسائل روزگار و معاش میں ترقی دے۔ ان کی جہالتوں، بے روزگاری اور بد کرداریوں کو دور کرے، ان کو مہذب، شائستہ، متمدن اور تعلیم یافتہ بنائے۔ سماج کے ہر طبقہ اور ہر خاندان کے افراد کو یکساں طور پر تعلیم پانے کی سہولتیں اور مواقع فراہم کرے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار سے پہلے ہندوستان میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلی تعلیم تک اس کا انتظام بغیر فیس اور معاوضے کے کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں، نوابوں، امراء اور اہل ثروت کی طرف سے جائدادیں تعلیمی مصارف کے لیے وقف کر دی جاتی تھیں، اس طرح صوبۂ بنگال میں صوبہ کا چوتھائی حصہ اسی کام کے لیے وقف تھا، سرکاری خزانوں سے ان کی امداد ہوتی تھی۔ جیسا کہ مسٹر جیمس کرانٹ کے حوالہ سے 'برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟' میں یہ تحریر ہے۔

> اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ والیان ملک اور امراء تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے، اس کے لیے جاگیریں دیتے اور جائدادیں وقف کرتے تھے، دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی اضلاع روہیلکھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور حافظ رحمت خان (مرحوم) کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔[1]

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۴۶

ہر ایک قصبہ، گاؤں اور دیہات میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں لکھنے پڑھنے اور حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی، کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفر نامے میں شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کی حالت بتلاتا ہوا لکھتا ہے کہ صرف شہر ٹھٹہ (سندھ) میں مختلف علوم وفنون کے چار سو کالج تھے۔

وہ لفظ کالج لکھتا ہے۔ اسکول، پرائمری اسکول یا مکتب نہیں لکھتا۔ جب دارالسلطنت دہلی سے ایک ہزار میل سے زیادہ دوری پر بسنے والے شہر میں اس قدر کالج تھے تو پھر شہر دہلی، آگرہ اور یوپی، بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس، بمبئی، سندھ، پنجاب وغیرہ کے دوسرے بڑے شہروں کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کی تعلیمی حالت کیا ہوگی۔ مقریزی نے کتاب الخطط میں لکھا ہے کہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں مدارس سے مراد ہمارے زمانے کے روایتی مدرسوں کی شکل نہیں تھی، بلکہ مدارس سے مراد پاٹھ شالائیں اور اسکول ہوا کرتے تھے جن میں مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ اس وقت کے مروجہ عصری علوم وفنون بھی پڑھائے جاتے اور انھیں مدرسہ ہی کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ اسی باب میں آگے چل کر اس وقت کے مدارس میں پڑھائے جانے والے مضامین کے ذکر سے معلوم ہوگا۔ مسٹر کیر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے:

> انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے، اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔[1]

خلاصہ یہ کہ یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ انگریزی دور حکومت کے مقابلہ میں زمانۂ سابق میں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہوتے تھے، اس کی تصدیق امور مذکورہ بالا کے علاوہ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر لیٹنر کے قول سے بھی ہوتی ہے،

---

[1] تاریخ باسو، جلد ۵، ص، ۱۴ بحوالہ، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۴۷

لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب 'ان ہیپی انڈیا' میں انگریزی سررشتہ تعلیم کے افسروں کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ پہلے زمانہ میں ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد انگریزی زمانہ سے زیادہ تھی۔

جنرل سولمن جو کہ ہندوستانی تاریخ میں ایک ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا ہے، وہ ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہونگی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا مقصدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو، جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں وہی یہ لوگ عربی اور فارسی میں سیکھتے ہیں۔ سات سال کے درس یعنی درجہ فضل کے بعد ایک ہندوستانی طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے دستار فضیلت باندھتا اور اسی طرح روانی سے سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بو علی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب علم۔[1]

سر ولیم ہنٹر نے انگریزی اقتدار سے پہلے ہندوستان میں تعلیمی نظام کی خوبیوں اور تعلیم کے متعلق مسلم حکمرانوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> قبل اس کے کہ ملک ہمارے ہاتھوں میں آئے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہن اور فراست کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے، ان کا نظام تعلیم اعلی درجے کی

---

[1] مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص، ۴۰۴

ذہنی تربیت کر سکتا تھا، مسلمانوں کا نظام تعلیم ہندوستان کے دیگر تمام نظاموں سے بدرجہا فائق تھا۔[1]

پنجاب کے سر رشتہ تعلیم کی رپورٹ سب سے اول ۱۸۵۶-۵۷ میں شائع ہوئی تھی، اس وقت مسٹر آرنلڈ سر رشتہ تعلیم کے افسر اعلی تھے، انہوں نے مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا:

بحیثیت معلمی کے میدان مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، مسلمانوں کے اسکولوں میں فارسی پڑھنے کے لیے بے شمار ہندو لڑکے ان پر اعتماد کر کے پڑھنے آتے ہیں، اس کے بعد ۱۸۶۰-۶۱ کے رپورٹ میں کپتان فیلر ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم لکھتا ہے: مسلمان اساتذہ کی بیشی جو ان درسگاہوں میں ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں بالکل عیاں ہے، ۳۳۴ مسلمان استاذ اور ۱۱۱ ہندو اور ۶ دوسری ذاتوں کے ہیں۔[2]

مغل حکمراں جہاں ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشاں رہے اور اس کے لیے انہوں نے مواقع بھی فراہم کیے، وہیں خصوصیت کے ساتھ ہندوستانیوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بھی فکر مند رہے اور ملک میں بڑی تعداد میں انہوں نے تعلیمی ادارے بھی قائم کیے۔ چنانچہ مشہور مغل شہنشاہ اکبر کی علم و کتاب سے دلچسپی بارے میں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے لکھا ہے:

معلوم ہوتا ہے کہ نصاب تعلیم کو بہتر اور منظم کرنے کے لیے قدرت نے اکبر کو چن لیا تھا۔ اکبر نے اعلی تعلیم کے لیے نامور اساتذہ کی تلاش اور پھر ان کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے بچوں کی تعلیم کے لیے ہدایات جاری کیں جن کی رو سے ہر بچہ سب سے پہلے

---

[1] سید محمد میاں، علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ص، ۱۵

[2] بحوالہ، ایضا، ص، ۱۶

> حروف تہجی اور ان کی مختلف شکلوں کو لکھنا سیکھتا، دو دن میں حروف اور ان کی صورتوں کا نام سیکھتا، ایسے ہی لفظوں کا جوڑنا، ایک ہفتے کی مشق کے بعد وہ نثر یا نظم کے کسی قطعے کو جو اخلاق ہوتا یا خدا کی حمد پر مشتمل یاد کرتا، بچے عموماً استاد کی مدد کے بغیر بھی پڑھنے کی کوشش کرتے، جب وہ روانی سے پڑھنا شروع کر دیتے تو ہر استاد انہیں روزانہ کام دیتا، ان کے نصاب میں جسے وہ مرحلہ وار پڑھتے اخلاق، حساب، جیومیٹری، زراعت، فلکیات، طب، منطق، تدبیر منزل، آئین سلطنت، نیچرل فلاسفی، الہیات اور تاریخ کے مضامین شامل ہوتے۔[1]

بچوں کی تعلیم سے متعلق اکبر کی کوششوں کے متعلق ابو الفضل نے لکھا ہے کہ ان سے مدارس کو نئی زندگی ملی۔ تعلیم سے متعلق اکبری فرمان کا آخری جملہ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے یہ تھا کہ "کسی کو وقت کے تقاضوں سے تغافل برتنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" نصاب تعلیم میں سنسکرت کی مندرجہ ذیل کتابیں مقرر کی گئیں: بیاکرن، ویدانتا، پتنجلی۔ نصاب تعلیم میں سنسکرت کی کتابوں کو داخل کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم حکومت نہ صرف اپنے غیر مسلم ہندو شہریوں کی ادبی و ثقافتی میراث کی قدر کرتی ہے بلکہ وہ مسلم شہریوں کو بھی اپنے وطن کی کلاسیکی روایت سے آگاہ دیکھنا چاہتی ہے۔

یہ اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے دربار میں ہر فن کے یگانۂ روزگار لوگ یکجا ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض ایک ہی وقت میں قلم اور تلوار کے دھنی تھے، ان ہی میں سے ایک فتح اللہ شیرازی تھا جو علم کے مختلف شعبوں پر عبور رکھتا تھا۔ چنانچہ کبھی وہ ہمیں کندھے پر بندوق اٹھائے اکبر کے ہم رکاب نظر آتا ہے اور کبھی بزم علم میں الہیات، فلسفہ اور ریاضیات پر داد تحسین دے رہا ہے، وہ امرائے دربار کے بچوں کو بھی پڑھاتا تھا اور فلسفہ کی کلاسیکی کتابوں پر حاشیے

---

[1] رشید احمد جالندھری، برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، ص ۷۵

بھی رقم کرتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہوا سے چلنے والی چکی، آئینۂ حیرت، گیارہ فائر کرنے والے بندوق بھی بنائی تھی۔

اسی بزم علم کی ایک دوسری شخصیت عبد الرحیم خان خاناں کی ہے جو اپنے علم و ادب، حکومتی نظم و ادب، سپاہیانہ استقامت کی وجہ سے بادشاہوں کے لیے قابل رشک تھی۔ خان خاناں عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کا فاضل تھا اور جب ۱۵۸۰ میں اکبر کی دعوت پر گوا سے عیسائی وفد آیا تو اکبر کے حکم پر اس نے اس وفد سے لاطینی اور پرتگیز زبانیں سیکھنا شروع کیں، خان خاناں کی علمی سرگرمیاں اس کے سپاہیانہ ولولوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ کہتے ہیں کہ احمد نگر کی ایک مہم میں اس کی فوج کے ایک کمانڈر دولت خان نے دشمن کی غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر عبد الرحیم سے پوچھا کہ اگر کل کو کچھ ہو گیا تو آپ کو کہاں تلاش کریں، خان خانان نے جواب میں کہا، لاشوں کے نیچے۔

مدارس کے قیام اور علمائے وقت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اکبر نے ایک نادر لائبریری بھی قائم کی۔ایسی نادر لائبریری بقول اسمتھ اکبر سے پہلے کبھی وجود میں نہیں آئی تھی۔

مذکورہ بالا تحریروں اور اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا حق بجانب ہو گا کہ کمپنی کی ان تمام مخالفانہ اور جابرانہ کاروائیوں کے باوجود جن کا کچھ تذکرہ آگے آئے گا، ۱۸۵۷ تک ہندوستانی باشندوں اور خاص کر مسلمانوں کی تعلیمی اور ذہنی حالت جو کچھ باقی رہ گئی تھی اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے ہندوستانی باشندے انگریزوں سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ علاوہ اس کے ان میں انتظامی کاموں کی اہلیت بھی موجود تھی، لیکن انگریزوں نے منظم طور پر تمام میدانوں میں ترقی کے راستے ہندوستانیوں کے لیے بند کر دیے اور نتیجتاً ترقی کے ہر شعبے میں وہ پیچھے ہوتے چلے گئے۔

انگریزی دور اقتدار میں ہندوستان کی تعلیمی حالت

انگریزوں نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس ملک اور یہاں باشندوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کے لیے کوئی منظم کام نہیں کیا بلکہ ہر طرح سے اسے برباد ہی کیا۔ ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے اور انہیں تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیا بلکہ اسے اور تنزلی کا شکار بنادیا۔ ہندوستانیوں کے تعلیمی انحطاط کی وجہ یہ رہی کہ دراصل انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت کو ختم کردیں گے اور ہماری حکومت زیادہ دنوں تک یہاں قائم نہیں رہ پائے گی، اس لیے انہوں نے تعلیم گاہوں کو ملیامیٹ اور تعلیمی نظام کو نیست و نابود کردیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو ۱۸۳۸ء میں سرکاری قبضہ میں لے کر ہندوستانیوں کی تعلیمی ترقی کی راہ کو مسدود کردیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک سیاسی نظام کی کامیابی یا ناکامی کا تعلق اس نظام کے ماتحت لوگوں کی فکری زندگی سے ہے۔ جوں ہی فکری اور اخلاقی زندگی روبہ زوال ہوتی ہے، سیاسی زندگی کی رونق بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ سقوط بغداد ہو یا سقوط دہلی، بیت المقدس کا المیہ ہو یا دوسرے اسی جیسے حوادث، یہ سارے واقعات ایک ہی داستان حقیقت کی کڑیاں ہیں اور وہ ہے علمی اور اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں سیاسی انتشار۔ چنانچہ عالمگیر کے نالائق جانشینوں کو فکری زوال کی وجہ سے ایک غیر ملکی منظم طاقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا جو اپنی تہذیب، معاشرت اور ثقافت میں اہل ہند سے مختلف تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بنیادی طور پر ایک تجارتی کمپنی تھی جس کا تعلیم، مذہب اور اخلاق سے کوئی تعلق نہیں تھا، چنانچہ جوں ہی مغل انتظامیہ کی بدنظمی نے اسے آگے بڑھنے کا موقع دیا اس نے آگے بڑھ کر سیاسی میدان پر قبضہ کرلیا جس سے اسے یہاں لوٹ مار کرنے کے لیے کھلی چھوٹ مل گئی، اس نے بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جس کی وجہ سے یہاں کے علمی ادارے برباد ہوگئے اور مسلمان اقتصادی طور پر اس قدر تباہ ہوگئے کہ مدارس کی علمی سرپرستی ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی، چنانچہ کمپنی نے اپنے اقتصادی مفاد کو بچانے کے لیے ملک کی تعلیمی رفتار پر متعدد رپورٹیں لکھوائیں،

ان رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان جو حصول علم میں سب سے آگے آگے تھے، اپنے ہی وطن میں بہت پیچھے رہ گئے۔

تعلیم میں مسلمانوں کی پس ماندگی کی ذمہ داری جہاں فکری مسائل سے ان کی بے اعتنائی پر عائد ہوتی ہے وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ان کے اقتصادی اور معاشی استحصال پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی پالیسی نے، جو کہ لوٹ کھسوٹ پر مبنی تھی، اہل ہند کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص بہت نقصان پہنچایا۔ تعلیمی اداروں سے وابستہ جاگیریں چھین لی گئیں جس کی وجہ سے بنگال میں بقول ہنٹر مسلمانوں کی علمی زندگی نے دم توڑ دیا۔

ایک طرف مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اور جہاں وہ ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑے تھے وہاں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق انہیں چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، جیسا کہ پنجاب میں ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار لائٹنر کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں مسلمان محکمۂ تعلیم میں چھائے ہوئے تھے، ان کے قائم کردہ فارسی مدارس میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھتے تھے، ان مدارس میں فارسی کی کلاسیکی کتابیں مثلاً پند نامہ، گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، رقعات ابوالفضل وغیرہ پڑھائی جاتی تھی۔ لائٹنر نے پنجاب سے متعلق سرکاری تعلیمی رپورٹ پر تنقید کی اور بتایا کہ جب پنجاب برطانوی قلم رو میں داخل ہوا تو ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو شعبۂ تعلیم سے خارج کیا گیا، مسلمانوں کے فارسی اور قرآنی مدارس کو تباہ کیا گیا، لیکن خود سرکاری مدارس نے سطحی تعلیم کو پھیلانے میں جو کردار ادا کیا اس کے پیش نظر والدین نے اپنے بچوں کو سرکاری مدارس میں بھیجنا بند کر دیا۔

لڈلو نے تاریخ برطانوی ہند میں لکھا ہے کہ

ہندؤوں کے ہر موضع میں جو قدیم حالت پر قائم ہے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں، حساب میں ان کو خاص مہارت ہوتی ہے، مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گاؤں کا اسکول غائب ہو گیا ہے۔[1]

انگریزی عہد حکومت سے قبل کی ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی حالت کس قدر بہتر تھی، لیکن جنگ پلاسی کے بعد سے ہندوستان کی حکومت اسی کمپنی کے قبضے میں آنی شروع ہو گئی جو تجارت کرنے اور روپیہ بٹورنے کے لیے ہندوستان آئی تھی، کمپنی کے مالک بقول جسٹس سید محمود صاحب صرف یہ چاہتے تھے کہ تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں، اس لیے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اور انہیں ترقی کے مواقع فراہم کرنا اپنا کام نہ سمجھتے تھے۔

تجارتی لوٹ مار، صنعت کی بربادی، کاشتکاروں اور زمین داروں کی تباہی کے ساتھ اس کمینہ اور خود غرض سوداگر حکومت کی خود غرضی اور تعلیم سے قطعاً بے نیازی کا اثر یہ پڑا کہ جیسے جیسے کمپنی کی حکومت بڑھتی رہی علم و فضل کے بجائے جہالت اور بے روزگاری پھیلتی رہی، چنانچہ ۱۸۲۳ میں ایم انفسٹن اور ایف وارڈن نے ایک متفقہ یاد داشت حکومت کو پیش کی، جس کا اقتباس یہ ہے:

انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے، ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیے، بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس الزام کو دور کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔[2]

---

[1] تاریخ میجر باسو، جلد پنجم، ص، ۱۴۴، بحوالہ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، سید محمد میاں، ص، ۱۴

[2] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص، ۱۳۳

انگریزوں نے بالکل منظم سازش کے تحت ہندوستانیوں کو تعلیم سے دور رکھا۔انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ تعلیم کے پھیلنے سے یہاں کے باشندوں میں جو شعور بیدار ہو گا وہ انہیں برطانوی سازشوں سے آگاہ کرا دے گا اور پھر ہندوستان میں زیادہ دنوں تک انگریزوں کی چال نہیں چل سکے گی۔اس لیے انہوں نے تعلیم کی طرف کوئی پیش رفت نہیں کی،اور پہلے سے جو کچھ نظام تعلیم قائم تھا اسے بھی زوال پذیر بنا دیا۔اسی حوالہ سے سر ولیم ڈگبی 'پروسپرش برٹش انڈیا' میں لکھتا ہے:

"سوال: کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو ان کی طاقت کا علم نہ ہو؟

جواب: میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں،اس لیے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے اب تک ہم نے اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے، یعنی مسلمانوں کو ہندؤوں کے خلاف کرنا اور علی ہذا القیاس، تعلیم کا اثر یہ ضرور ہو گا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے، اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔"[1]

اسی بناء پر انگریزوں نے تعلیم اور تعلیم گاہوں کو برباد کیا اور چونکہ ان کا نصب العین زیادہ سے زیادہ مالی منافع حاصل کرنا تھا اس لیے بھی انہوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینا اپنے مقاصد کے خلاف سمجھا، بہر حال تھوڑے ہی عرصہ میں جب کہ تعلیم گاہیں مٹ گئیں اور ان کی جگہ دوسرے اسکول اور کالج وغیرہ قائم نہ کئے گئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگ آہستہ آہستہ وفات پا گئے تو چاروں طرف ہندوستان میں جہالت اور نادانی کا دور دورہ ہو گیا۔

---

[1] ولیم ڈگبی، پروسپرس برٹش انڈیا، ص،۱۰۹

ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اس کو ہمیشہ لوٹتے رہنے کی ملعون خواہش کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی پالیسی رکھتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کر دی جائے، ان میں علمی بیداری پیدا نہ ہونے دی جائے، ان کے ہر قسم کے کمالات فنا کر دیے جائیں، اور ان کو غلامی کی بدترین خدمت گزاریوں کاشتکاریوں وغیرہ ہی میں ہمیشہ مبتلا رکھا جائے، تاکہ ہماری برتری ہمیشہ قائم رہے اور ہم ہندوستان کے اعلی حاکم بنے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۹۲ء جب کہ مسٹر ولبر فورس نے پارلیمنٹ میں اس مضمون کی تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کی عبادت اور تعلیم کے ذرائع مہیا کیے جائیں اور اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً پادری بھیجے جائیں تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجاویز کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ :

> ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگرچند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آجائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح جب نوجوان پادری اندرون ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے۔[1]

تعلیم گاہوں اور علم کا فنا کر دینا اور فنا ہو جانا کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا اس لیے مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی اور عہدہ داران کمپنی کی ہر قسم کی مخالفت کے باوجود آوازیں اٹھتی رہیں اور چیخ و پکار ہوتی رہی۔ بہت سے منصف مزاج انگریز ہندوستانیوں کی موافقت بھی کرتے رہے جس کے نتیجہ میں ۱۸۳۴ء میں تعلیمی ضروریات انجام دینے اور اس کے

[1] میجر باسو، تاریخ تعلیم، ص، ۲۰۳

پروگرام وغیرہ کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں منعقد ہوا اور لارڈ میکالے اس کے صدر بنائے گئے۔ کمیٹی اور اس کے صدر نے ہندوستانیوں کے لیے تعلیم گاہیں بنانے اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا، مگر سازش کے تحت ہر ہر قدم اور ہر ہر شعبہ میں ایسے امور کو لازم قرار دیا جس سے کہ نہ تعلیم عام ہو سکے، نہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ علوم میں کامیابی ہو سکے اور نہ ان کے اخلاق اعلیٰ درجے کے ہو سکیں، نہ ایسی چیزیں اور سہولتیں اس میں رکھی گئیں کہ وہ ایک آزاد قوم کے ممبر شمار کیے جا سکیں۔ لارڈ میکالے جسے اس کمیٹی کا صدر بنایا گیا تھا، اس کی ذہنیت کا اندازہ اس کے اس مشہور بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے جسے مختلف جگہوں پر نقل کیا گیا ہے۔ "موجودہ وقت میں ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایک ایسے طبقہ کو پیدا کریں جو ہمارے اور ہمارے محکوم باشندوں کے درمیان ترجمان بن سکیں جو اپنے خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن اپنے مذاق، فکر اور رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز۔"

اس کمیٹی کے ذریعہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے جو امور طے کیے گیے، ہندوستانیوں کے حق میں اس کے مثبت نتائج مرتب نہیں ہو سکے۔ اس کے پیچھے جو عوامل کارفرما تھے، انہیں بنیادی طور پر درج ذیل باتوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ا۔ تمام فنون وعلوم کی تعلیم انگریزی زبان میں لازمی قرار دے دی گئی۔ ظاہر ہے کہ سات سمندر پار کی وہ زبان جس سے ہندوستانیوں کو کوئی مناسبت نہیں تھی، جب کہ اسے ہی ہندوستانی بچوں کے لیے ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے تو ان کے اذہان پر ان علوم و فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کس قدر ثقیل بوجھ پڑا ہوگا۔ اگر یہ علوم و فنون ان کی مادری زبان میں پڑھائے جاتے اور انگریزی زبان بحیثیت ثانوی زبان تسلیم کی جاتی تو ان کو ان فنون میں کسی قدر جلد مہارت حاصل ہو سکتی تھی۔

۲۔ جو مضامین اور فنون داخل درس کئے گئے وہ ایسے نہ تھے جن میں مہارت حاصل کر کے وہ صنائع اور علمی و معاشی ترقیات کے ایسے درجوں پر پہنچ سکیں جن پر یورپین اقوام جرمنی، برطانیہ، روس، جاپان وغیرہ پہنچی ہوئی تھیں۔

۳۔ فضول اور ضرورت سے زائد کتابیں اور فنون اس قدر بھر دیئے گئے کہ پڑھنے والوں پر بہت ہی زیادہ بوجھ پڑ گیا جس وجہ سے بچوں کا ذہن اور دماغ کمزور ہوتا گیا، اور تعلیم سے ان کی دل چسپی کم ہوتی گئی اور نتیجتاً انہیں کوئی معتدبہ کمال حاصل نہیں ہو سکا۔

۴۔ نصاب میں اس طرح کی کتابیں داخل کی گئیں جن کی خیالی اور موہوم مگر مزین باتوں سے نو عمر بچوں کو مذہب اور عقائد دینیہ سے دوری ہوتی گئی۔

سب سے بڑا مقصد اس کمیٹی کا یہ رہا کہ انگریز حکام کو اپنے اپنے دفاتر میں کلرک اور ترجمان مہیا ہو جائیں اور انگریزی تہذیب اور انگریزوں کا کلچر ہندوستانیوں میں رائج ہو جائے۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اخلاق قدیمانہ کی جگہ انگریزی تہذیب و اخلاق عام ہو جائیں، مذہب بیزاری عام ہو جائے، ہندوستانیوں میں دنیا طلبی، خود غرضی اور نفاق کی ایسی اسپرٹ آجائے جس کی علمبردار تمام دیگر یورپین اقوام سے بڑھ کر برطانیہ واقع ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت لارڈ میکالے کے ان الفاظ سے ملتا ہے جنہیں اس نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھ کر بھیجا تھا، اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> اس تعلیم کا اثر ہندؤوں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا، بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں، مگر بہت سے یا تو مؤحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں، میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم

کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔[1]

چنانچہ ان مقاصد کا ظہور بہت تھوڑے عرصہ میں ہو گیا اور ان کالجوں اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے جو لڑکے فارغ ہو کر نکلنے لگے وہ اپنے اسلاف کے مذہب اور ان کے طریقوں سے بیزار اور متنفر ہونے لگے۔ اور چونکہ مذہب عیسوی میں ایسی معقولیت اور جاذبیت نہ تھی کہ وہ اپنی طرف ان کو کھینچ سکے، نیز خود انگریز بھی عموماً اس مذہب پر در حقیقت قائم نہیں تھے، ان کی عیسائیت صرف قومیت کے درجہ تک تھی، عمل اور عقیدہ میں کوئی اثر نہیں تھا۔ اس لیے وہ الحاد اور لادینیت کے دلدل میں پھنس کر اخلاق حسنہ اور مذہب سے بالکل دور ہوتے چلے گئے۔

الغرض انگریزوں کے ذریعہ ان ہنگاموں، اتنی تعلیمی جدوجہد کے مظاہروں، کمیشنوں، کمیٹیوں اور اسکیموں کے اعلانات، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بلند بانگ دعووں کے باوجود جب ۳۵ برس کے بعد پہلی مردم شماری ہوئی تو تمام ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا، بشمول اردو، انگریزی، فارسی اور ناگری وغیرہ، اوسط 3.2 فیصد پایا گیا۔ وہ انگریزی نظام جو کہ نہایت بلند بانگ دعووں کے ساتھ ۱۷۶۳ء یا اس کے قریبی زمانہ سے شروع کیا گیا تھا اور اس کے محاسن اور خوبیوں اور انسانی خدمات کے راگ گائے جا رہے تھے، سو برس سے زائد مدت میں ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد 3.2 فیصد سے زیادہ نہ پیدا کر سکا، اس سے انگریزوں کی سچائی اور انسان دوستی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ماقبل میں مذکور خود انگریزوں اور دیگر ماہرین تعلیم کی تحریر سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ انگریزی حکومت سے پہلے عام طور پر بکثرت لوگ پڑھے لکھے تھے، لہذا خواندگی کا اوسط کم از کم ۵۱ فیصد ہونا چاہیے تھا، پھر ۱۸۷۱ء میں اس اوسط کا پایا جانا کیا صریح طور پر دلالت نہیں کرتا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے اغراض

---

[1] میجر باسو، تاریخ تعلیم، ص، ۱۰۵

کے لیے علم اور اس کی درس گاہوں کو دشمنی کی نظر سے دیکھ کر برباد کرنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا اور جو کمیشن وکالج وغیرہ کی حکایات سامنے رکھی جاتی تھیں وہ محض دکھاوے اور تسلی کے لیے تھیں۔

انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں جو تعلیم یافتہ ہندوستانی بنائے ان میں سے اکثر کی علمی قابلیت اور صلاحیت کا معیار اس سے زیادہ نہیں تھا کہ وہ دفاتر میں کلرکی کی خدمتیں انجام دے سکیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لیے کہ سائمن رپورٹ کے موافق جب کہ انگلستان میں تعلیم کا صرفہ فی کس سالانہ ۲ پونڈ ۱۵ شلنگ اور امریکہ میں فی کس ۵۶ ڈالر سالانہ تھا تو ہندوستان میں صرفۂ تعلیم فی کس سالانہ ۹ پنس یعنی ۹ پیسے تھا، اور ۱۹۴۳ء میں حسب بیان مسز جان گنتھر جب کہ امریکہ تعلیم پر فی کس سالانہ چار سو ڈالر خرچ کر رہا تھا اور انگلستان فی کس دو سو ڈالر خرچ کر رہا تھا تو ہندوستان میں برطانیہ فی کس سالانہ تین ڈالر خرچ کرتا تھا۔

جب اس قدر خود غرضی اور کوتاہ اندیشی اور ہندوستان دشمنی سے کام لیا جائے تو بجز اس کے کیا نتیجہ ہوگا، جس کی ایک جھلک مذکورہ بالا تحریروں میں درج کی گئی۔ ان ہی ملعون اغراض کی بناء پر ہمیشہ انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیمی مد میں ایسی ایسی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کیں جن کی بنا پر یہ ملک انتہائی جہالت میں پھنس کر رہ گیا۔ ۱۹۲۵-۲۶ میں ہندوستان کی آمدنی میں سے جب کہ ڈیفنس پر 39.5 فیصد اور ملکی انتظام پر 39.2 فیصد خرچ کیا جارہا تھا تو تعلیمی مد میں 7.6 صرف کیا جارہا تھا، جب بھی تعلیمی انحطاط پر سوال اٹھایا گیا تو حکمرانوں کا یہی جواب ہوتا تھا کہ بجٹ میں روپیہ نہیں ہے۔ حالانکہ ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب فوج پر اور اسی طرح بڑی بڑی رقوم پولیس وغیرہ پر صرف کی جاتی رہیں، جن کی غرض صرف اس قدر تھی کہ برطانوی حکومت کی سطوت اور جبروت قائم رہے اور اس سے رعایا کا ایک ایک فرد حکام کے چنگل میں پھنسا رہے، لیکن تعلیمی ترقی کی طرف کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا گیا۔

برخلاف اس کے برطانیہ میں جنگ عظیم کے دوران بھی اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ثانوی تعلیم کو لازمی کر دیا جائے۔ جبکہ وہ وقت ایسا سخت تھا کہ سلطنت کو فوجی اخراجات کے لیے روزانہ لاکھوں روپے کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر عین جنگ کے زمانہ میں ۱۹۱۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے انگلستان کے ہر بچہ کے لیے ہائی اسکول تک کی تعلیم لازمی اور مفت کر دی گئی اور جس طرح بن پڑا اس کے لیے روپیہ فراہم کیا گیا۔ مگر ہندوستان جس کی بدولت وہ اس قدر عظیم دولت کے مالک بن گئے اس کے لیے اس طرح کی کوئی پالیسی عمل میں نہ لائی جاسکی۔

ان ہی وجوہ سے سر ڈی ہملٹن نے کہا تھا کہ :

> اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اس طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہو گی نہ حفظان صحت کا سامان ہو گا اور نہ ہی دولت ہو گی۔[1]

عہد وکٹوریہ کے دوسرے نصف میں اگرچہ کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن تعلیم کا معیار نیچا ہوتا گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے تعلیمی معیار کی اس کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انگریزوں کے ذریعہ قائم کردہ انڈین ایجوکیشن کمیشن جو تعلیمی حکمت عملی وضع کی اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ تعلیم تیزی سے پھیلے، گہرائی پیدا ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ اگلے بیس برسوں میں جو کالج بنے وہ کمزور تھے، ان میں اساتذہ اور کارکنان کم تھے، طلبہ پر انفرادی توجہ نہیں دی جاسکتی تھی، نصابات میں مختلف نوعیت کے مفید مضامین نہیں تھے۔ جب کہ ان سب باتوں کا لحاظ رکھنا پورے ملک میں تعلیم کی صحت مند نشو و نما کے لیے ضروری تھا۔

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، ص۔ ۱۶۸

عہد وکٹوریہ میں اعلی تعلیم کی دوسری کمی یہ تھی کہ جدید ہندوستانی زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح پر نظر انداز کر دیا گیا۔ ۱۸۵۴ کی مراسلت میں صاف طور سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کی ہمت افزائی کی جائے، لیکن سوائے مدراس یونیورسٹی کے جہاں طلبہ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مطالعے کے لیے کسی ایک جدید ہندوستانی زبان کا انتخاب کر سکتے تھے۔ دوسری یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا یا پھر نصاب میں ان کو نیچی حیثیت دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن زبانوں کو یونیورسٹی کے سطح پر ذریعۂ تعلیم کا درجہ مل جانا چاہیے تھا ان کو یہ درجہ مدت تک نہ مل سکا۔ جدید ہندوستانی زبانوں سے غفلت برتنے کی وجہ سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے اور عام ہندوستانیوں کے درمیان خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔

ایک نہایت دل سوز اور انتہائی شرمناک معاملہ صوبۂ بنگال و بہار واڑیسہ کے اوقاف کا ہے، ان صوبوں کے مسلمان امراء نے بڑی بڑی جائیدادیں رفاہ عام اور تعلیم وغیرہ کے لیے وقف کر رکھی تھیں جن سے تمام مصارف اس قسم کے انجام پاتے تھے۔ دیہات اور قصبات اور شہروں میں بے شمار مدارس اور اسکول جاری تھے، جن سے پبلک بغیر کسی قسم کے مصارف اور فیس ادا کرنے کے تعلیم پاتی تھی، ان وقف شدہ زمینوں سے حکومت ایک پیسہ بھی وصول نہیں کرتی تھی اور تمام آمدنی تعلیم وغیرہ کی انہیں مدارس میں خرچ ہوتی تھی۔ حکومت تعلیمی اداروں پر اپنا خزانہ خرچ کرنے سے سبکدوش تھی اور تعلیمی چرچا ملک کے کونہ کونہ میں جاری تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی للچائی ہوئی آنکھیں اور زر طلبی کی انتہائی ہوس کب اس کو برداشت کر سکتی تھی، قبضہ پاتے ہی یہ حرص سوار ہوئی کہ جس طرح ممکن ہو ان زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ اگرچہ نتیجہ میں یہ علمی اور ضروری انسانی فریضہ جس کو ہر متمدن قوم اور حکومت اپنے منصبی فرائض میں سے شمار کرتی اور کروڑوں اشرفیاں خرچ کر کے اپنی رعایا اور قوم کو علم سے آراستہ کرتی ہے، موت گھاٹ اتر جائے۔ طرح طرح سے اس کی کوششیں شروع ہوئیں۔

مسلمانان بنگال کا ہر اعلی خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا، یہ خاندانی اسکول کم ہوتے گئے اور ان کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے، یہ ہمارے عہد حکومت کی دوسری نصف صدی تھی جب ہم نے انگریزی قانون کی ناقابل مدافعت قوت کو ان کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا، زمانۂ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضاجوئی کے لیے زمین کے قطعات وقف کرتے تھے، مالگزاری جمع کرنے والے زمیندار یا مقامی مالک زمین کو اجازت تھی کہ ماتحت زمینوں میں جو چاہے کرے، بشرطیکہ مالگزاری کی مقررہ مقدار ادا کرتا رہے۔

تعلیمی اداروں کو حاصل ہونے والی رقوم کا بہت بڑا حصہ ان زمینوں سے حاصل ہوتا تھا جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہوتی تھیں، انگریزوں کے ذریعہ ان اوقاف کی بربادی سے جو ابتری اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے دستاویزات میں ثبت ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں خاندان تباہ ہو گئے اور ہندوستانیوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار ان ہی اوقاف پر تھا، بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ جو شخص غیر جانب داری سے اس کی تحقیق کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان اوقاف کا اگر ٹھیک استعمال کیا جاتا تو پورے ہندوستان اور خاص کر بنگال میں بعد کے زمانے میں بھی نہایت اعلی اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔

انگریزوں کے ذریعہ برتی جانی والی ان خطرناک پالیسیوں کے نتائج سے فکر مند ہو کر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستانی باشندوں میں ایک خاص قسم کی بے چینی پیدا ہوئی، اور انہوں نے اپنے طور پر تعلیمی میدان میں پیش قدمی شروع کی، چنانچہ مسرور علی اختر ہاشمی نے اسی کے بارے میں لکھا ہے:

> ۱۹۰۵اور ۱۹۱۴ کا درمیانی دور جارحانہ قومی جذبات کا دور تھااور مشترکہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ۱۸۵۷ کے بعد شاید دوسری دفعہ ہندو مسلم اتحاد نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا، اس غیر معمولی قومی اتحاد نے قومی تعلیم کے خیال کو جنم دیا، یہ تعلیم سرکار کے اختیار اور دخل اندازی سے، غلامانہ تقلید سے اور انگریزی زبان کے غلبے سے آزاد تھی۔ مزید یہ کہ اس میں حرفے کی تعلیم پر زور تھا، تاکہ قومی اداروں سے نکلنے والے طلبہ روزگار کے لیے سرکاری ملازمتوں کے محتاج نہ ہوں اور اپنی روزی خود کما سکیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس تعلیم کا مقصد مادر وطن سے محبت پیدا کرنا تھا۔[1]

مسلم دور حکمرانی میں روزگار کی حالت

مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں اپنا اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کو ہی اپنا حقیقی وطن بنالیا اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اس ملک اور یہاں کے باشندوں سے پیار و محبت اور باہمی میل جول کا ربط پیدا کیا، اس ملک اور یہاں کے باشندوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان حکمرانوں نے کسی بھی معاملہ میں ہندو مسلم کے درمیان مذہبی تعصب کو جگہ نہیں دی اور کسی بھی معاملہ میں ان کے درمیان تفریق پیدا نہیں کی۔ تعلیم، ملازمت، عہدے اور ہر طرح کے امور میں سب کو برابر رکھا اور کسی سے بھی رنگ و نسل، مذہب و مسلک اور ذات برادری کی بنیاد پر کسی طرح کے امتیازی سلوک کو روا نہیں رکھا۔

مستند تاریخی کتابوں میں بابر کی مذہبی رواداری اور ہندوؤں سے خوشگوار تعلقات کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بابر نے ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی کے ساتھ انتظامی عہدے سپرد کیے اور فوج میں بھرتی کیا۔ اس زمانے میں نمک حلالی کے اصول کو اپنایا جاتا تھا، جو بھی حکومت کا وفادار ہوتا یا حکومت سے مزاحم نہیں ہوتا، اسے فوج اور شاہی امور

---

[1] مسرور علی اختر ہاشمی، مغربی تعلیم اور مسلمان، ص، ۱۷

میں شامل کر لیا جاتا۔ وہاں ہندو مسلم میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی۔ بابر کی حکومت میں شامل ہندو عہدیداران کی صحیح تعداد تو نہیں معلوم لیکن بابر نامہ اور دوسری کتابوں سے جن چند ناموں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ رام موسی بن دیوا (ساکن پھیرا)

۲۔ بیر سنگھ دیو (جس کا تعلق رانا سانگا سے تھا، پڑھا لکھا شخص تھا، بعد میں بابر کا وفادار بن گیا اور بابر کے خطوط لکھتا تھا)

۳۔ بیر دیو (بابر کا فوجی افسر تھا)

آئینہ تاریخ نما میں شیو پرشاد نے بابر کے مال گذاری محکمہ کے بہت سے ہندو افسران کا ذکر کیا ہے۔

بابر کی وصیت کے مطابق ہمایوں نے بھی ہندوؤں کے ساتھ رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ ہمایوں کے بیٹے اکبر نے ہندوؤں کا بڑے عہدوں پر تقرر کیا اور اس کی فوج میں ہندو مسلم دونوں ہی قوموں کے سپاہی اور اعلی افسران دکھائی دیتے ہیں۔ اکبر نے فوج کی خامیوں کو دور کیا اور اس کو قومی شکل دی۔ قابل لوگوں کو فوجی خدمت کا موقع دیا، مذہب اور ذات کے امتیاز کو بالکل ختم کر دیا۔ اکبر نے منصب داری کی رسم کو رواج دیا، راجپوتوں کا بھی فوج کے اعلی عہدوں پر تقرر کیا، راجہ بھگوان داس، راجہ ٹوڈر مل، راجہ بیربل، رائے لون کرن، رائے سنگھ بیکانیری، راج چندر بدھی، مان سنگھ، جگت سنگھ، رائے رین لقب وکرمادتیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جودھا بائی سے شادی کے بعد فوج میں راجپوتوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی، مان سنگھ کا مرتبہ فوج میں سب سے اعلی تھا، محکمہ مالگزاری میں ہندوؤں کو اعلی عہدوں پر رکھا گیا۔

ہندو عہدے داروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کیول رام کے حوالے سے محمود علی نے لکھا ہے:

> ڈاکٹر کیول رام نے تذکراہ الامراء کے مطابق تحریر کیا ہے کہ ہندو امراء جو راجہ اور رائے کا لقب رکھتے اور وہ راجہ جو ۵۰۰ سے کم منصب رکھتے تھے ان کی تعداد اس طرح تحریر کی ہے، اکبر کے عہد میں ۴۶، جہانگیر کے عہد میں ۹۰، شاہجہاں کے عہد میں ۲۲۵ اور اورنگ زیب کے عہد میں ۱۸۰ تھی۔[1]

جہانگیر اپنے راجپوت سرداروں پر بہت بھروسہ کرتا تھا اور اپنی تزک میں ان کی تعریف کرتا ہے۔ جہانگیر کے نانیہالی رشتہ داروں میں سب ہی راجپوت تھے، اس کی ماں راجہ بہار مل کچھواہہ کی بیٹی اور بھگوان داس کی بہن تھی۔ خود اس کی بہت سی بیویاں راجپوت تھیں۔ اپنے دربار میں ہندو امراء کے لیے اس کے قلم سے محبت اور الفت کے دودھ اور شہد کی نہریں بہتی دکھائی دیتی ہیں، اس نے راجپوتوں کے ساتھ اپنے والد کی طرح فراخ دلی سے کام لیا۔

راجہ مان سنگھ کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے

> راجہ مان سنگھ میرے والد کے بہت ہی معتبر اور معتمد امراء میں تھا، اس خاندان سے اور میرے خاندان سے عظیم الشان نسبت اور لگاؤ رہا، بنگال کی صوبے داری ملی، خلعت، قبضہ شمشیر مرصع اور اسپ خاصہ سے سرفراز کیا، مان سنگھ کے والد کا نام بھگوان داس اور دادا راجہ بہار مل تھے، میری والدہ راجہ بہار مل کی بیٹی تھیں۔[2]

راجہ نرسنگھ دیو بندیلہ: راجہ نرسنگھ بندیلہ کو عہد جہانگیری میں اتنی دولت اور عزت حاصل ہو گئی تھی کہ ہندوستان کے راجاؤں میں کسی اور کو حاصل نہ تھی، اس کے دولڑکے جھجار سنگھ اور پہاڑ سنگھ بھی شاہانہ نوازشوں سے سرفراق کیے گئے تھے۔

---

[1] محمود علی، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، ص،۹۱

[2] تزک جہاں گیری، ص،۸، بحوالہ، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، محمود علی، ص،۹۱

راجہ انوپ بڑگوجر: شیر کے مانے پر جہاں گیر نے اسے انی رائے سنگھ دلن (سپہ سالار اور شیر کے مارنے والا) کا خطاب عطا کیا، اسے بڑی بڑی ذمہ داریاں دی گئیں، ۱۴ اویں سال جلوس میں دوہزاری ذات اور چھ سو سوار کا منصب پایا۔

اوداجی رام: جہاں گیر نے اس کو منصب چہار ہزاری ذات اور چہار ہزاری سوار عطا کیا، خان جہاں لودی کے خلاف لشکر کشی میں بھیجا گیا اور اسے اہم ذمہ داری دی گئی۔

راجہ باسو: جہاں گیر کے عہد میں منصب سہ ہزار و پنج صدی پر سربلند ہو کر مہم دکن پر بھیجا گیا، اس کے دو لڑکے راجہ شوراج مل اور جگت سنگھ مغل دربار میں نوازے گئے۔

رائے بہادر داس بخشی: یہ برہمن تھا، پہلے احدیون کا بخشی پھر برہان پور کا واقعہ نویس اور آخر میں صوبہٴ دکن کا دیوان مقرر ہوا، ستر ہویں سال جلوس میں رائے کرن کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا۔

رائے بنوالی داس: شاہی فیل خانہ کا داروغہ تھا، چودہویں سال جلوس میں منصب شش صدی طبل اور صدی وبست سوار اور رائے کا خطاب پایا۔

رائے سور پھوز بہہ: جہاں گیر کے دربار میں منصب سہ ہزاری۔

راجہ جھجار سنگھ بندیلہ: عہد جہاں گیری میں ۴ ہزار ذات اور ۴ ہزار سوار پر سرفراز تھا۔

راجہ بھرت بندیلی: ساتویں جلوس میں منصب راجہ کا خطاب پایا۔

راجہ جگت سنگھ: اس کو جہاں گیر راجہ مرزا کہتا تھا، دکن میں مامور تھا، پانچ ہزاری منصب عطا کیا گیا، اس کے بڑے بھائی کے پوتے پوتی نے راجہ کا خطاب اور منصب دوہزاری ذات و ہزار سوار عطا کیا اور انبر کی جاگیر دی۔

راجہ جگت سنگھ: یہ راجہ مان سنگھ کا بیٹا تھا، اس کی لڑکی کی شادی جہاں گیر سے ہوئی، راجہ کی سرفرازی کے لیے جہاں گیر نے نوے ہزار روپیہ ساجن میں بھیجے، یہ شادی مریم زمانے کے محل میں ہوئی، جہیز کے سامان میں ساٹھ ہاتھی تھے۔

راجہ کلیان جیسلمیری: راجہ کلیان کا خاندان مغل خاندان کا بڑا خیر خواہ رہا، جب راجہ کلیان دربار میں آیا تو راول کا خطاب عطا کیا اور راجہ کا ٹیکا لگایا۔

رام راج راو رتن ہاڈا: جہانگیر سے سر بلند رائے کا خطاب حاصل کیا اور منصب پنج ہزاری ذات، پنج ہزاری سوار اور رام راج کے خطاب سے نوازا گیا۔

روپ چند گوالیاری: سہ سال جلوس میں گوالیار کی جاگیر عطا کی گئی۔

راجہ سورج سنگھ راٹھور: راجہ اودے سنگھ راٹھور کا بیٹا اور جودھ پور کے راجہ مالدیو کا پوتا تھا، اودے سنگھ کی لڑکی جگت گوسائی شہزادہ سلیم کے ساتھ بیاہی تھی، جہاں گیر کے جلوس میں منصب چار ہزاری ذات، دو ہزار سوار کا منصب پایا، بعد میں پنج ہزاری منصب بھی ملا۔

رائے رائے سنگھ راٹھور: رائے کلیاں والی بیکانیر کا بیٹا تھا، اس کی بیٹی کی شادی شہزادہ سلیم سے ہوئی، منصب پنج ہزاری دیا۔

رائے رایان پتر داس بکرماجیت: اکبر کے زمانہ میں رایان کا خطاب پایا اس کو راجہ بکرماجیت کا خطاب عطا کیا گیا۔

رائے سورج سنگھ المعروف بہ راو سور بھورتیہ: بیکانیر کے راجہ رائے راج سنگھ کا بیٹا تھا، عہد جہانگیری میں اس کو بڑی عزت حاصل ہوئی۔

راجہ رنگ دیو، راجہ سنگرام، ستر سال کچھواہا، راجہ شیام سنگھ، راجہ سکرا، راجہ کشن داس، کشن سنگھ راٹھور، راجہ کلیان، کیشوداس، مارواڑ ٹھور رانا کرن، رائے گوردھن سورج دھج، راجہ گوردہر کچھواہا، راجہ مالی داس، راجہ مان سنگھ، راجہ گج سنگھ، روپ چند گوالیاری وغیرہ سے بلا شبہ تیموریوں نے ہندؤوں کے ملک کو نہیں بلکہ اقلیم دل کو فتح کر لیا تھا اور ہندؤوں کے اخلاص ومحبت نے فاتح کو مفتوح بنالیا تھا۔ (ماخوذ: از عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، محمود علی)

شاہ جہاں کے عہد کے ہندو عہدیدار

شاہ جہاں کا دل ہندؤوں بالخصوص راجپوتوں کے تعلق سے بہت ہی نرم رہا۔ اس کے سارے نانیہالی راجپوت تھے۔ شاہ جہاں نے جب باپ کے خلاف بغاوت کی تو راجہ گوپال اور اس کے بیٹے بہرام نے شہزادے کا پورا ساتھ دیا۔ راجہ مہیش داس راٹھور تو شاہ جہاں کے تخت کے پیچھے کھڑا رہتا تھا، سفر میں بھی وہ برابر اس کے ساتھ رہتا تھا۔

شاہ جہاں نے ہندو سرداروں کو اتنا نوازا کہ سلطنت کا وکیل یعنی وزیر اعظم اور دیوان تن یعنی نائب اول وزیر اعظم بنایا، ہندو عہدیداروں کی فہرست حسب ذیل تحریر کی جاتی ہے جس سے صحیح عہدیداروں کا اندازہ ہو جائے گا۔

رائے رایان دیانت رائے گجراتی: قوم کا برہمن اور وطن گجرات تھا، شاہ جہاں کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا، گیارہویں سال جلوس میں دیوان تن (نائب وزیر اعظم) مقرر ہوا، بارہویں سال جلوس میں رائے رایان کا خطاب ملا اور کچھ دنوں وکیل (وزیر اعظم) رہا، پھر کل صوبہ دکن کا دیوان مقرر کیا گیا۔

رائے رایان راجہ رگھناتھ داس: پہلے دیوان تن مقرر ہوا، پھر خاصہ شاہی کی دیوانی ملی، نواب سعد اللہ خاں کی وفات کے بعد رائے رایان کا خطاب پایا اور دیوان اعلی کا کام اس کے سپرد ہوا، ۱۰۲۸ھ میں کل دیوانی کا کام انجام دینے لگا، سموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔

مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور: جودھپور کے راجہ گج سنگھ کا چھوٹا بیٹا تھا، شاہ جہانی دربار کا معتبر منصب دار ہوا، ۱۰۵۴ھ میں عارضی طور سے دارالسلطنت اکبر آباد کی حکومت بھی عطا ہوئی، اتنیسویں سال جلوس میں شش ہزاری سوار، دواسپہ سہ اسپہ کا منصب اور مہاراجہ کا خطاب پایا، شاہ جہاں کے آخری زمانہ میں دارشکوہ نے ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزار سوار، پانچ ہزار سوار دواسپہ سہ اسپہ کا منصب اور مالوہ کی صوبہ داری عطا کیا، بعد میں خمیر و مضاف کابل کا حاکم مقرر ہوا وہیں وفات پائی۔

راجہ جے سنگھ: پنج ہزاری ذات اور پنج ہزار سوار دوہزار سوار دواسپہ سہ اسپہ کا منصب دار تھا۔

راجہ جسونت سنگھ: پنج ہزاری ذات اور پنج ہزار سوار کا منصب دار تھا۔

راجہ بھٹل داس گوڑ: راج گوپال داس کا لڑکا تھا، شاہ جہاں نے اس کو بیس ہزار اسپہ نقد، خلعت، علم اسپ اور فیل بطور انعام اور راجہ کا خطاب دیا، چوتھے جلوس میں رن تھمبور کا قلعہ دار ہوا، چھٹے میں اجمیر کا فوجدار آٹھویں میں اجمیر کا صوبیدار گیارہویں میں اکبر بار کا قلعہ دار چودہویں میں اکبر آباد کا صوبیدار ہوا۔ آخر میں پانچ ہزاری سوار دواسپہ سہ اسپہ کا منصب پایا۔

راجہ گج سنگھ: پنج ہزاری سوار سے نوازا گیا۔

بالوجی دکنی: پنج ہزاری سوار کا منصبدار تھا۔

راؤامر سنگھ: راجہ گج سنگھ کا بیٹا تھا، چہار ہزاری ذات، سہ ہزار سوار کا منصب پایا۔

راجہ رائے سنگھ: مہاراجہ بھیج سنگھ سیسودیہ کا لڑکا تھا، چہار ہزاری ذات، دوہزار سوار کا منصب پایا۔

ان عہدیداروں اور منصب داروں کے علاوہ ہفت صدی، شش صدی اور پانصدی کے اور بھی دیگر منصب داروں اور عہدیداروں کی ایک لمبی فہرست ہے، اختصار کے پیش نظر یہاں صرف ان کے ناموں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہمران دکھنی، راجہ روپ سنگھ راٹھور، راجہ امر سنگھ راٹھور، ستر سال ہاڈا، مکندر سنگھ ہاڈا، مہیش داس راٹھور، راوت رائے، اوداجی رام دکنی، راجہ انرودھ گوڑ، راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ، مادھو سنگھ ہاڈا، راجہ جگت سنگھ، راجہ منکوجی بنالکر دکنی، رائے کاسنی داس، ہری سنگھ راٹھور، ناناجی دیوریہ، گوپال سنگھ، گوکل داس سیسودیہ، گوردھن راٹھور، رائے مکند داس نارتوی، چندر من بندیلہ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راوودر سیسودیہ، راجہ دوار کاداس کچھواہہ، رام داس نروری، رائے سنگھ چھالا، راو روپ سنگھ چند راوت، سنگھ راٹھور، راجہ رام روپ، راجہ امر سنگھ نروری، راجہ بدن سنگھ بھندوریہ، بہار مل، راوامر سنگھ چندراوت، بلبھدر سخاوت، بہاری داس کچھواہہ، راجہ بھیم راٹھور، رائے بہاری مل دیوان، پرتھی راج راٹھور، راجہ پرتھی چند، رائے تلوک چند کچھواہہ، برسوجی بھونسلہ، پرتاپ چروہ، راجہ ٹور مل شاہجہانی، جادو رائے دکنی، راجہ جے رام بڑ گوجر، راجہ سنگھ، راج سنگھ راٹھور پرہاون، رام سنگھ راٹھور، راوپتی سنگھ چندراوت، رائے با، راوت رائے دکنی، راجہ سبو رام گوڑ، سجان سنگھ سیسودیہ، سبل سنگھ سیسودیہ، سیام سنگھ، راول سرسی، راو کرن نہورتیہ، کشن سنگھ بھدوریہ، گردھر داس گوڑ، اندر سال ہاڈا، راجہ بہروز، بھوج راجہ کچھواہہ، چندر بھان ترکا، راوت دیال راس جھالا، کنور رام سنگھ، چتر بھوج چوہان، جگناتھ راٹھور، سنگرام کچھواہہ، متھرادا کچھواہہ، اوردسان بھان، نراین داس سیسودیہ سبھا، پرتاب سنگھ چوہان، ہیم چند، راجہ امر سنگھ، ہمیر سنگھ سیسودیہ، بلو چوہان، گوبند داس راٹھور جسونت سنگھ، ہراور مہیش داس راٹھور، پرتھی سنگھ، سکت سنگھ بنی داس بندیلہ اگر سین، کیسری سنگھ۔ (مستفاد از: مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، جلد سوم، سید صباح الدین)

اورنگ زیب کے ہندو منصب دار

اورنگ زیب کے بارے میں متعصب مؤرخین کے ذریعہ یہ بات مشہور کی گئی کہ وہ ہندؤوں کا مخالف تھا، جبکہ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح وہ بھی ہندو اور مسلم کے درمیان عہدے اور منصب دینے میں کسی طرح کا کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا، ذیل کی تحریر سے اس کی بخوبی تائید ہوتی ہے۔

رجہ اندر من دھندیرہ: وطن صوبہ مالوہ میں تھا، اورنگ زیب نے منصب سہ ہزاری دو ہزار سوار سے سرفراز کیا، دہرمات کی جنگ میں اورنگ زیب کی طرف سے بڑی بہادری سے لڑا جس کے عوض اس کو علم و نقارہ کا اعزاز ملا، پھر اس کو صوبۂ بنگال متعین کیا گیا۔

راجہ انوپ سنگھ بھورتیہ: راؤ کرن کا بیٹا اور راؤ سورج سنگھ کا پوتا تھا، سترہویں جلوس میں بہادر خان کوکہ اور عبدا کریم میانہ کے خلاف جنگ میں بڑی خدمات انجام دیں، جس کے صلے میں راجہ کا خطاب پایا، دکن کی لڑائی میں بڑا نام پیدا کیا، اکیسویں جلوس میں اورنگ آباد کا صوبہ دار مقرر ہوا اور شیواجی کی جنگی اقدام کو روکتا رہا، تیسویں جلوس میں نصرت آباد کا قلعہ دار اور فوجدار ہوا، تینتیسویں جلوس میں امتیاز گڑھ دونی کی حکومت پر سرفراز ہوا، انوپ سنگھ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بیکانیر کی موروثی حکومت پر سرفراز رہا اور ہزار و پانصدی منصب دار تھا۔

انی رائے: حساب کتاب میں کسی کی رعایت نہیں کرتا تھا، عالمگیر کے صدر دفتر کا صیغہ حساب و تنخواہ کا دیوان اعلی بنایا گیا۔

مرزا راجہ جے سنگھ: (راجہ مان سنگھ کا پوتا) سموگرھ کی لڑائی میں دارا کی جانب سے رہا، لیکن اس لڑائی کے بعد عالمگیر کا وفادار بن گیا، شیواجی کے خلاف لڑائی لڑی اور شیواجی کو عالمگیر کے دربار میں لا کر حاضر کیا، پہلے ایک کروڑ کی مال گذاری محال عطا کی گئی، پھر ہفت ہزاری ذات، ہفت ہزار سوار، دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب عطا کیا گیا، آٹھویں جلوس میں

راجہ جے سنگھ نے اورنگ زیب کی طرف سے بیجاپور پر فوج کشی کی، دسویں جلوس میں راجہ جے سنگھ نے وفات پائی، راجہ کی وفات کا عالمگیر کو بڑا دکھ ہوا اور اس کے لڑکوں کو ہر قسم کی عنایتوں سے نوازا۔

دھیراج راجہ جے سنگھ سیوائی: راجہ جے سنگھ کا بیٹا تھا، راجہ کی وفات کے بعد عالمگیر نے اس کو راجہ جے سنگھ کا خطاب دیا، عالمگیر نے اس کو دو ہزاری ذات دو ہزار سوار کا منصب دیا۔

اندر سنگھ: رانا راج سنگھ کا بیٹا تھا۔ تینتالیسویں جلوس میں منصب دو ہزاری ذات، ہزار سوار پایا، اس کے بھائی بہادر سنگھ کو ہزاری پانصد کا منصب ملا۔

راجہ اندر سنگھ راٹھور: راجہ رائے سنگھ راٹھور کا بیٹا تھا، عالمگیر نے اس کو راجہ کا خطاب دے کر جودھپور کی حکومت عطا کی اور خلعت خاصہ، شمشیر مرصع، اسپ مع ساز طلا، فیل، علم اور نقارہ عطا کیا۔ اڑتالیسویں جلوس میں سہ ہزاری ذات، دو ہزاری سوار کا منصب پایا۔

اسوجی دکھنی: عالمگیر کے عہد کا معزز منصب دار تھا، اس کو ۱۰۹۸ھ میں بیس ہزار روپیہ کا نقد انعام خلعت علم نقارہ اسپ، فیل دیا۔

اچلاجی: شیواجی کا داماد تھا، عالمگیر نے اس کو پانچ ہزاری ذات، دو ہزار سوار منصب کے علاوہ نقارہ علم مرصع پہنچی اور ہاتھی عطا کیا۔

راجہ اودت سنگھ: ایرج کا فوجدار اور دو ہزاری و پانصدی ہزار و پانصد سوار کا منصب دار تھا۔

اودے سنگھ: سینتالیسویں جلوس میں سنخر بنا کا قلعہ دار تھا، سہ ہزاری و ہزار ہفت صد کا منصب دار تھا۔

راہ بہاؤ سنگھ ہاڈا: راؤ ستر سال ہاڈا کا بیٹا تھا، ستر سال ہاڈا اور دارا شکوہ کی طرف سے سموگڑھ کی لڑائی میں بہادری سے مارا گیا، اس کا بیٹا راجہ نہدر سنگھ ہاڈا باپ کی وفات کے بعد عالمگیر کے دربار میں آیا، عالمگیر نے اس کو سہ ہزاری ذات دو ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور اس کے وطن بونڈی کی جاگیر عطا کی، اس نے عالمگیر کے ساتھ آخری وقت نمک حلالی کا ثبوت دیا، وہ لاولد مرا، عالمگیر نے اس کے بھائی بھگونت سنگھ کے پوتے انرودھ سنگھ کو اس کی جگہ پر بٹھایا۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے عہدیداروں اور منصب داروں کی ایک لمبی فہرست ہے، اختصار کے پیش نظر ان کی تفصیل کے بجائے صرف ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

باسدیو، بسونت راو دکھنی، بکرم سنگھ الیاری، بداجی، راجہ بھیم، بھاگوجی بنجارہ، پرسوجی بھوسلا، پرتھی سنگھ، بہرام دیو سیسودیہ، راجہ توڈر مل افضل خاں، مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور، درگا داس راٹھور، دوندی راو، راجہ رائے سنگھ راٹھور، راگھو داس جھالا، راجہ رام سنگھ کچھواہہ، رام سنگھ ہاڈا، رام چند، رگھوناتھ سنگھ سیسودیہ، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، سوہوجی، سوبھان، شواد فلیہ، راو سو بھوکرن بندیلہ، کانہوجی، کشن سنگھ، کشور داس، راجہ کلیان سنگھ، شیو سنگھ، راوکرن پھور تیہ بیکانیر، کیرت سنگھ کچھواہہ، گوپال سنگھ چندراوت، راجہ گوپال سنگھ گوڑ، لعل چند، ماندھاتا، بالوجی بھونسلا، راجہ مہاسنگھ، مان سنگھ راٹھور، راجہ منوہر داس، مانکوجی، رائے رایاں تلوک چند، رائے رایان رگھوناتھ، شیو سنگھ، اندر سنگھ، رگناتھ سنگھ، محکم سنگھ مرہٹہ، بشن سنگھ،

ان ناموں کے علاوہ اور بھی بہت سے نام اس فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں، لیکن سب کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں ہے، یہاں ان ناموں کی فہرست کا مطلب صرف یہ ہے کہ نا سمجھ مؤرخین کا خیال ہے کہ عالمگیر نے ہندؤوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی، اس فہرست سے کوئی بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ عالمگیر کتنا روادار تھا اور لائق لوگوں کا قدردان تھا، عالمگیر نے کبھی بھی اس معاملے میں ہندو مسلم کی تفریق نہیں کی

عالمگیر کے بعد مغل حکمرانوں کے دور کے ہندو علماءادیب، شعراءاور دیگر اعلی مراتب رکھنے والوں کی تفصیل طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کی گئی ہے، مذکورہ مغل شہنشاہوں کے دور کے ہندو علماء، ادیب، شعراء، منصبداروں اور عہدیداروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل اور مغلوں سے پہلے مسلم حکمرانوں نے ہندؤوں کو اعلی عہدوں اور اعلی مراتب سے کبھی محروم نہیں رکھا، اس معاملے میں وہ کشادہ ذہن رکھتے تھے، تنگ نظری اور تعصب سے بہت دور تھے، وہ اہل اور قابل لوگوں کے قدردان تھے چاہے وہ کسی مذہب یا قوم کے ہوں، حقیقت میں مسلم حکمرانوں نے ہر قابل آدمی کی قدر کی اور اس کی اہلیت کے مطابق اس کو نوازا۔

انگریزی دور اقتدار میں روزگار کی حالت

صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ہندوستانیوں کے پاس ایک پیشہ ملازمت کا باقی رہ گیا تھا جس سے وہ اپنی اقتصادی اور معاشی حالت کو کچھ سدھار سکتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے یہاں بھی بے ایمانی، تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا، ہندوستانیوں کو آہستہ آہستہ اعلی ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا اور تمام منفعت بخش اختیارات اور عہدے انگریز سوداگروں اور کلرکوں کو دے دیے گئے۔ بے ایمانی اور تنگ نظری کی انتہا یہ ہوئی کہ ایک ہی عہدے پر کام کرنے والے ہندوستانی اور انگریز میں تفریق کی گئی، خلاف قانون انگریز عہدیداروں کی تنخواہیں ہندوستانیوں کے مقابلے میں بڑھادی گئیں، اور بہت سے عہدے صرف انگریزوں کے ہی لیے مخصوص کر دیے گئے۔ جس کے نتیجے میں یہاں کے باشندوں میں بے روزگاری بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی اور ہندوستانی باشندے محتاجگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

تمام یورپین عموماً اور انگریز خصوصاً تمام ایشیاء اور افریقہ کے باشندوں کے دشمن رہے ہیں، ان کو نیم وحشی، غیر متمدن اور خارج از انسانیت وغیرہ کہتے ہوئے ان کی عزت، مال اور ذرائع دولت وغیرہ پر نہایت بربریت سے چھاپہ

مارتے رہے ہیں، بالخصوص مسلمانوں پر ان کو سیاسی رقابت کا بھی ہمیشہ سے خیال قائم رہااور ان کو سخت ترین دشمنی کی آگ میں ڈالا گیا، جس کی بناء پر مسلمانوں کے برباد کرنے اور فنا کے گھاٹ اتار دینے کا سب سے زیادہ عمل درآمد جاری کیا گیا، بالخصوص اس وقت سے جب کہ ان کو بادشاہ دہلی سے دیوانی کا پروانہ بنگال، آسام، بہار واڑیسہ کے بارے میں دیا گیا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کو پہچانتے اور اس کے ساتھ وفاداری اور نمک حلالی کو عمل میں لاتے مگر رزیلوں کے ساتھ احسان کرنا ہی غلطی تھا۔

نکوئی بابداں کردن چناں است　　　　　　که بد کردن بجائے نیک مرداں

مغل حکمرانوں اور ان کے وارثوں نے انتہائی غلطی کی تھی کہ ان غیر اقوام اور رزیلوں کو اپنے ملک میں اقامت اور حقوق شہریت کی مع تجارت اجازت دے دی اور بابار ان کی نالائقی کو دیکھتے اور تجربہ کرتے ہوئے بھی مراعات بڑھاتے رہے۔

الغرض انگریزوں نے دیوانی پر اقتدار پاتے ہی مسلمانوں کے ساتھ سختی کا معاملہ برتنا شروع کیا اور ہر میدان سے مسلمانوں کو چھانٹنا اور انہیں کمزور کرنا شروع کر دیا، اس زمانہ میں بیشتر ملکی اور فوجی عہدوں پر مسلمان فائز تھے لیکن دھیرے دھیرے ان عہدوں سے دور کر کے انہیں کمزور کیا گیا باوجودیکہ ان میں اعلی سیاسی اور فوجی قابلیت موجود تھی۔

چنانچہ مسلمانوں کے تعلق سے انگریزوں کے رویہ کے بارے میں خود ایک انگریز ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلی قوم تھی. وہ
> دل کی مضبوطی اور بازؤوں ہی میں برتر نہ تھے، بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے میدان میں

بھی سب سے افضل تھے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے، غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔[1]

مسلمانوں کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شعبہ میں متعصبانہ برتاؤ کیا جاتا تھا، چنانچہ اس بارے میں ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:

لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں ان پر مسدود کر دی ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی اور مذہبی فرائض کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم اس غم و غصہ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جو انگریزوں کو اس وقت ہوگا جب کہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اس بات کا اعلان کر دے کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔ پچھلے سال کلکتہ ہائی کورٹ کے مسلمان وکلاء نے اس بارے میں وہ عرض داشتیں بھیجی تھیں، انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب عیسائیوں کو سال میں باسٹھ چھٹیاں دی جاتی ہیں اور ہندوؤں کو باون، تو پھر مسلمانوں کو بارہ ہی کیوں ملتی ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے لیے منظور شدہ چھٹیاں اکیس تھیں، اس کے باوجود عرضی گزاروں کی التجا صرف یہ تھی کہ ان تعطیلوں کی کم سے کم تعداد جو کہ اب گیارہ تک پہنچ چکی ہے اور کم نہ کی جائے۔ مختصراً یہ کہ اس حکم سے ان کے مذہبی تہواروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو ان کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دی جا سکتی ہیں تو آپ کے

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۱۹۵

سائل عرض پرداز ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجاآوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی۔[1]

انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے لیا تھا اس لیے کہ ان کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مسلمان ہم سے اس ملک کو واپس نہ لے لیں اور ہم کو یہاں سے بے دخل نہ کر دیں۔ خصوصاً اس بناء پر کہ ان کی دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت، عزم و استقلال، سیاسی مہارت وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایسے خطرات کا ہمیشہ انتظام کرنا ضروری سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کو اس قدر کچل دیا جائے کہ ان میں اٹھنے کی طاقت نہ رہے اور ہندوؤں کو اتنا ابھار دیا جائے کہ اگر کسی وقت میں مسلمان سر اٹھائیں بھی تو یہ ان کے دبانے کے لیے کافی ہو سکیں۔ مگر ہندوؤں نے تعلیم میں بہت کچھ ترقی حاصل کر لی تھی، اس کے باوجود ان کو ذمہ دار عہدوں سے ہمیشہ محروم رکھا گیا۔ بالخصوص فوج کے اعلی عہدوں کے تک اخیر تک کسی ہندوستانی کو پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ حالانکہ یہی ہندوستانی ہندو اور مسلمان شاہان مغلیہ وغیرہ کے تمام عہدوں پر سپہ سالاری سے لے کر ادنی فوجی عہدہ تک اور وزارت سے لے کر ادنی سویلین تک تمام ملکی اور فوجی خدمتیں بخوبی انجام دیتے تھے۔ برطانوی حکومت میں یہ اصول تھا کہ کلکٹر اور ڈپٹی کلکٹر تک بالعموم انگریز رکھے جاتے تھے، ہندوستانیوں کو یہ عہدے اہلیت کے باوجود نہیں دیے جاتے تھے۔ ہندوستانیوں کی بڑی معراج یہی تھی کہ وہ تھانے دار یا نائب بنا دیے جائیں، اس سے بڑا عہدہ دینا انگریزوں کی مصلحت کے خلاف تھا۔ بعض بہت ہی وفادار ملازم کو کہیں کہیں ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا تھا۔

قانون اور طب جو اُس دور میں انتہائی معزز اور نفع بخش پیشے تصور کیے جاتے تھے، مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے حصول سے بڑھ کر ناممکن الحصول بنا دئے گیے تھے۔اس بات کے ثبوت کے طور پر ہنٹر کئی واضح مثالیں

---

[1] حسین احمد مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ ص، ۲۲۶

پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے "میں خواہ کسی محکمے یا کسی پیشے پر نظر دوڑاؤں، ہر جگہ ایک ہی جیسی عدم مساوات پائی جاتی ہے۔"اس نے مثال کے طور پر ۱۸۶۹ کے کلکتہ یونیورسٹی سے متعلقہ اعداد وشمار اس طرح پیش کیے ہیں:

ا۔ طب کے گریجویٹ: ہندو=۳،انگریز=ایک، مسلمان=ندارد

۲۔ طب کے بیچلر: ہندو=۱۰،انگریز=ایک، مسلمان=ندارد

۳۔ طب کا لائسنس پانے والے: ہندو=۵۸،انگریز=پانچ، مسلمان=ایک

جن دنوں ہنٹر بنگال میں مسلمانوں کی حالت کے بارے میں تحقیقات کرنے میں مصروف تھا ان ہی دنوں لارڈ ہوبرٹ نے اپنی مشہور یادداشت مرتب کی جس کا تعلق مسلمانوں کی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تقرر سے تھا۔اس نے اپنی تحقیقات کا دائرہ مدراس کی حد تک محدود رکھا اور ان مختلف وجوہات کی وضاحت کرنی چاہی جو بقول اس کے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی بتدریج کمی کا باعث بنے۔اس نے جن وجوہات کی نشان دہی کی ہے ان میں سے اکثر جانی پہچانی تھیں۔ مدراس کے گورنر کی حیثیت سے ہوبرٹ نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے جو معلومات اکھٹا کیں ان کے بموجب وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ:

جہاں تک اس پریسیڈنسی (صوبے) کا تعلق ہے مسلمانوں کی ملازمت میں کمی حقیقی ہے نہ کہ قیاسی۔اپنی یادداشت سے منسلکہ ایک گوشوارے میں اس نے بتلایا کہ کس طرح غیر معہودہ دیوانی خدمات کے اونچے درجوں کے لیے منتخبہ ۴۸۵ امیدواروں میں ۴۱۷ امیدوار ہندو تھے اور مسلمانوں کو ان اسامیوں میں سے صرف ۱۹ جگہیں مل سکی تھیں۔ محکمہ جاتی سطح پر یہ تقسیم حسب ذیل تھی:

(ا) محکمہ عدلیہ: صدر امین خاص (بہ مشاہرہ پانچ سو روپیہ): ہندو=۱۰، مسلمان=صفر، دیگر=۲

۲۔ ضلع منصف: (بہ مشاہرہ ۲۰۰تا ۳۰۰روپیہ) ہندو=۲۷، مسلمان=۶، دیگر=۱۷

(ب) محکمہ مال اور انتظام

۱۔ ڈپٹی کلکٹر اور مجسٹریٹ (بہ مشاہرہ ۲۵۰تا ۶۰۰) ہندو= ۳۱، مسلمان=۲، دیگر=۱۷

۲۔ تحصیلدار: ہندو=۱۴۳، مسلمان=۴، دیگر=۹

۳۔ سب مجسٹریٹ: ہندو=۱۴۶، مسلمان=۷، دیگر ۴

بمبئی پریسیڈینسی میں بھی مسلمانوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں حکومت کے اعلی عہدوں پر شاذ ہی ہندوستانیوں کا تقرر کیا جاتا تھا تاہم اس صوبے کی انڈین آرمی اینڈ سول سروس لسٹ بابت ۱۸۷۱ میں کسی ایک بھی مسلمان کا نام موجود نہیں ہے۔ محکمہ عدلیہ کے جن چار عہدوں پر ہندوستانی فائز تھے ان میں سے تین پر ہندو اور ایک پر پارسی عہدیدار مامور تھا۔

برطانوی دور میں سرکاری ملازمتوں کو حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان سے کماحقہ واقفیت لازمی تھی اور مسلمان اس زبان سے بے بہرہ تھے۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے ان ہندو اور مسلمان طلباء کے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے جو 72-1871 کے تعلیمی سال کے دوران بمبئی پریسیڈنسی کے مختلف سرکاری تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم تھے، یہ اعداد و شمار صرف ان اداروں سے متعلق ہے جہاں مخصوص علوم جیسے کہ قانون، طب، انجینیرنگ، تدریس اور صنعتی فنون وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی:

ہندو	مسلمان	ڈویژن
۳۳۹	۲۱	سنٹرل

۴۹	--	شمال مشرقی
۱۴۹	۱۳	شمالی
۱۶۰	۱۱	جنوبی
۳۹	۳۲	سندھ
۷۳۶	۷۷	ٹوٹل

بمبئی کے سینٹ زیویر کالج جیسے خانگی تعلیمی ادارے میں ایک بھی مسلمان طالب علم زیر تعلیم نہیں تھا۔

چنانچہ اس دور میں بہ حیثیت مجموعی سماجی اور معاشی اعتبار سے مسلمان نہایت کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ اس صورت حال سے سر سید اس قدر دل گرفتہ تھے کہ انھوں نے ۲۶ مئی ۱۸۷۵ کو عظیم آباد (پٹنہ) کے زعماء کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا:

> اب آپ تمام ہندوستان پر نگاہ دوڑائیے اور اس کے مختلف اداروں کو پیش نظر رکھیے، سرکاری محکموں کو لیجیے، کارخانوں یا محکمہ ریلوے کو لیجیے چھوٹی چھوٹی دکانوں سے لے کر بڑے بڑے تجارتی مراکز کو دیکھیے یا کسی بھی قسم کے خانگی کاروبار کو لے لیجیے اور پتہ چلایئے کہ ان تمام جگہوں پر ملازمت پانے والوں میں مسلمان کتنے ہیں؟ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ان کا تناسب ہزار میں ایک سے بڑھ کر نہیں ہوگا۔

یہ انحطاط نہ صرف یہ کہ بڑا ہی بے کیف تھا اور اس کے خلاف مسلمان صدائے احتجاج بلند کرتے رہے اور عرضداشتیں پیش کرتے رہے جن کے جواب میں انگریز قوم تسلیاں بھی دیتی رہی تاہم انحطاط کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس کی روک تھام نہ ہو سکی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات مزید ابتر ہوتے گئے۔ ۱۸۸۲ کے اوائل میں

سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسیشن نے لارڈ رپن کو جو تفصیلی یاد داشت پیش کی اس میں کہا گیا تھا کہ ۱۸۷۱میں گزیٹیڈ عہدیداروں کے تقررات میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب 7.1 سے کم تھا لیکن ۱۸۸۰تک یہ تناسب گھٹ کر 10:1 کا رہ گیا۔

محکمہ خارجہ میں ۵۴ عہدیداروں میں صرف ۲ مسلمان تھے، محکمہ داخلہ کے ۶۳ عہدیداروں میں سے صرف ایک مسلمان تھا، خزانہ اور مال کے محکمہ جات کے ۵۷ عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا، کنٹرولر جنرل کے ماتحت ۶۳ عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا، عدلیہ، سیاسیات و تقررات کے محکمہ جات میں کام کرنے والے ۸۲ عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا، ریونیو بورڈ کے ۱۱۳ مددگاروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا، یہی حال محکمہ محصول کا تھا جس کے عہدیداران بالا اور ماتحتین کی تعداد ۱۳۰ تھی، بالکل یہی حالت محکمہ انسداد اور ہندوستانی محکمہ ڈاک کے ڈائریکٹر جنرل کے دفاتر کی بھی تھی، محکمہ ڈاک میں چند مسلمان ضرور کام پر مامور تھے لیکن ان کی تعداد ۲۰۳۵ میں سے صرف ۱۱۰ تھی۔

یہ حالت زار ان مسلمانوں کی تھی جن کی تعداد ہندوستان کی جملہ آبادی کی ایک چوتھائی کے برابر تھی اور جو صرف ایک سو سال پہلے تک حکومت کے بیشتر عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے بطور خاص بنگال اور شمال مغربی صوبہ جات میں۔

اس یادداشت میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی حالت زار میں بہتری پیدا کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس تناسب میں فوری توازن پیدا کرے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ حکومت اس قسم کا توازن صرف اسی وقت پیدا کر سکتی ہے جب وہ یونیورسٹی سے کامیاب کردہ امتحانات پر غیر ضروری زور دینا ترک کرے۔ یادداشت میں اس امر پر بھی حکومت کو متنبہ کیا گیا کہ اگر حکومت نے اس ضمن میں فوری

اقدامات نہیں کیے تو مسلمان قوم اسی طرح انحطاط اور زبوں حالی کا شکار بنی رہے گی جو نہ صرف ملت اسلامیہ بلکہ حکومت برطانیہ کے مفادات کے لیے بھی نقصان دہ ہو گا۔

کمپنی کے اکثر عہدیدار نہایت عامیانہ طبقے کے لوگ تھے اور انہوں نے صرف تجارتی اور کاروباری حالات میں پرورش پائی تھی، جب انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی اقتدار کے انتہائی زینے پر پایا تو ان میں ہر گز یہ اہلیت موجود نہ تھی (اور اس کے لیے خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرتے وہ اس میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتے تھے) کہ بہترین دیانتدار ہندوستانیوں کو مشیر کار بنائیں، تمام عہدیداروں کا مطمح نظر غارت گری تھا۔

نہ صرف وجہ معاش بلکہ سول اور فوجی زندگی میں اعلی تربیت کے مواقع بھی اہل ہند سے چھین کر اہل برطانیہ کو مل رہے تھے۔ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہ تھی۔ ہندوستان ایک تربیت گاہ بن گیا تھا جس میں برطانیوں کو برطانیہ کی خدمت یا برطانیہ کے مقبوضہ ملک کی حیثیت سے ہندوستان کی خدمت کے لیے تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۲۷ء میں سر جان میکولم بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے۔ تو انہیں لندن میں الوداعی دعوت دی گئی جس میں برطانیہ کے وزیر خارجہ جارج کیننگ نے فخریہ لہجے میں کہا کہ دنیا میں کوئی سلطنت ایسی نہیں جس نے سول اور فوجی زندگی میں اعلی قابلیت کے اتنے آدمی پیدا کیے ہوں جتنے ہندوستان نے۔ پہلے اپنے لیے تعلیم دی پھر انہیں ان کے وطن کے حوالے کر دیا۔ یعنی برطانیہ کے۔

برطانوی تعلیمی وملازمتی پالیسی کے خلاف اودھ پنچ کا رویہ

ہندوستان میں حصول اقتدار کے بعد برطانوی حکمرانوں نے اس ملک کے باشندوں کی فلاح و بہبود اور ان کی خوش حالی و ترقی کے لیے کوئی منظم پیش رفت نہیں کیا بلکہ ہر طرح سے اسے کمزور اور برباد ہی کیا۔ ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے اور انہیں تعلیم اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیا بلکہ

مزید تنزلی کا شکار بنا دیا، ہندوستانیوں کی تعلیمی انحطاط کی وجہ یہ رہی کہ انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد اگر ہندوستان میں بڑھتی رہی تو وہ ہماری حکومت کو ختم کر دیں گے اور ہماری حکومت زیادہ دنوں تک یہاں قائم نہیں رہ پائے گی۔ اس لیے انہوں نے تعلیم گاہوں کو برباد اور تعلیمی نظام کو نیست و نابود کر دیا۔

ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اس کو ہمیشہ لوٹتے رہنے کی ملعون خواہش کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی پالیسی رکھتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کر دی جائے۔ ان میں علمی بیداری پیدا نہ ہونے دی جائے، ان کے ہر قسم کے کمالات فنا کر دیے جائیں اور ان کو غلامی کی بدترین خدمت گزاریوں ہی میں ہمیشہ مبتلا رکھا جائے۔ تاکہ ہماری برتری ہمیشہ قائم رہے اور ہم ہندوستان کے اعلیٰ حاکم بنے رہیں۔

انگریز حکمراں ہندوستانیوں کو حکومت میں کسی بھی معزز عہدے کا اہل نہیں سمجھتے تھے، اس کے لئے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے، ہندوستانیوں کو سول سروس سے دور رکھنے کے لئے اس کی اہلیت کی عمر بائیس سال سے کم کر کے انیس سال کر دی گئی، اس مسئلہ کو سامنے رکھتے ہوئے اودھ پنچ نے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں 'پولیٹیکل اقلیدس' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا، اس مضمون میں اقلیدس کے ہندسیہ طریقے کو اپناتے ہوئے مضمون نگار نے پہلے اس مسئلہ کے حدود متعین کئے کہ 'سول سروس وہ میوہ ہے جو سفید رنگ کے لئے مخصوص ہے، جس کا سر چھوٹا او وزن کم ہو وہ دیسی ہے۔ پھر اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ کا تعین کر کے شکل اول اور اس کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے، اسے ملاحظہ کیجیے:

دعویٰ: دیسیوں کو باوجود ذی علم اور لائق ہونے کے ذلیل کرو۔

عمل: ایک قاعدہ مقرر کرو کہ سول سروس کے امتحان کے واسطے بائیس سال کی جگہ انیس برس کی قید لگائی جائے، دیسیوں کو سول سروس بنا کوئی معزز عہدہ نہ دیا جائے۔ جو رائے دیں اس پر تحقیر کے ساتھ مضحکہ ہو، پس ہندوستانیوں کی ذلت ہو گئی۔

ثبوت: دیسی بوجہ نقص طریقۂ تعلیم سرکاری انیس سال کے سن تک سول سروس کا امتحان دینے کی کامل لیاقت نہیں رکھتے اور سول سروس کے میوہ کو ہندوستان کی آب و ہوا موافق نہیں، لہذا یہ ولایتیوں کے واسطے مخصوص ہے، چوں کہ دیسیوں کا کم وزن ہوتا ہے اور کم وزن، چھوٹا سر حماقت کی نشانی ہے لہذا دیسی احمق ہیں، اس واسطے دیسیوں کی رائے قابل مضحکہ ہے اور مضحکہ چوں کہ ذلیل کرتا ہے اس لیے دیسی ذلیل ہو گئے۔[1]

مندرجہ بالا مضمون میں ایک جدید طریقۂ نگارش میں ایک حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریز حکمراں ہندوستانیوں کو ذلت و پستی اور جہالت و پس ماندگی میں باقی رکھنے کے لئے کس طرح کے حربے استعمال کرتے تھے،

ہندوستانی باشندے وکالت کا امتحان اولاً تو بہت ہی کم دیتے تھے، اور اگر کچھ لوگ دیتے بھی تو اہلیت کے باوجود انہیں نااہل قرار دیا جاتا تھا۔ جو کچھ لوگ منتخب بھی ہوتے تو انگریزی نظام کی وجہ سے بہت سے غیر شریفانہ طور طریقے ان میں پائے جانے لگتے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تحریر لکھی گئی۔

ہر گاہ قرین مصلحت ہے کہ کوئی قاعدہ واسطے ہدایت وکلائے متذکرہ بالا کے قرار دیا جائے۔
لہذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے:

---

[1] اودھ پنچ لکھنؤ، جلد اول، ۲۳ اگست ۱۸۷۷

دفعہ ا۔ جو قانون سر کلرات و نظائر وکلائے مذکور الصدر نے قبل امتحان دینے کے یا کیے ہوں یا یاد کرنے کی نظر ڈالی ہو بشر طیکہ ان کا خیال ہو وہ سب ایکٹ ہذا کی رو سے صفحۂ حافظہ سے حک تصور کیے جاویں۔

دفعہ ۲۔ الہ آباد سے واپس آنے کے ساتھ ہی بغرض تشہیر اپنے نام کی کوئی تدبیر جا و بے جا اٹھا نہ رکھی جائے اور تدبیر مصرحہ ذیل اختیار کی جاویں۔

الف۔ اپنے مکان کے دروازے کی چھت پر ایک رو سیاہ تختہ جس میں اپنا نام مع قومیت وغیرہ بہت جلی قلم سے تحریر ہو، لکھنؤ کے علم کی چھڑ سے باندھ کر آویزاں کر دے، تاکہ عقاب، ہما، بلکہ فرشتہ تک اس کی کشش سے کھنچ آویں۔

ب۔ کسی ڈھنڈھورے کو بشر طیکہ خود فرصت نہ ہو بلا کر سارے شہر میں دن کے پچیس گھنٹہ تک اپنا نام پکروائے۔

ج۔ اودھ پنچ کے دفتر میں سال بھر بعد بمعیت اپنی ولدیت و سکونت کے حاضر آکر اپنے جعل، فریب، چکمے، دھوکے کی کچی کچی کیفیت بیان کر جائے۔ دفتر مذکور سے کماحقہ اس کی تشہیر ہو جائے گی۔

دفعہ ۳۔ جب شیطان سے زیادہ مشہور ہو جائے تو مقدمات میں آنے کے واسطے دلال اور مختار سے کوئی خوشامد تالیف قلوب کی تدبیر اٹھا نہ رکھے۔[1]

اسی طرح کا ایک اور مضمون جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وکالت کا امتحان ہندوستانیوں کے لیے کس قدر مشکل ہے، اور دوران امتحان ہندوستانیوں کی کس طرح بے عزتی کی جاتی ہے:

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۶ فروری ۱۸۷۷ء

الحمد للہ کہ آج امتحان وکالت سے فارغ ہوا، ایک کوہ گراں سر سے ٹلا، آبرو بچ گئی، جانوں کی خیر رہی، صحیح سلامت اپنے گھر جاتے ہیں، سند ملی یا نہ ملی اپنی حساب اب تو بروا گھاٹ، دریائے شور اور مہاراجہ بنارس کی کوٹھی کالے جیل خانے سے کم نہیں ہے، وکالت کو سلام، ہمیں خود مختاری ہی گون ہے، ایسا ہی ارمان ہے تو کسی کے عقد نکاح میں شریک ہو کر دم بھر کو وکیل بن لیں گے، ۱۶ گئے تو صدقہ سے سال بھر کی محنت ضائع ہوئی تو بلا سے، آبرو کا صدقہ جان اور جان کا صدقہ مال، ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ کسی گارڈ جھڑ کی نہیں اٹھائی، بیڈ کی چوٹ نہیں سہی، گو اکثر خدا کے بندوں پر یہ معرکہ بھی گذر گیا، اس خو گیر کی بھرتی سے چہرہ کٹوانا ہی مناسب ہے، چٹائی پر بیٹھ کر فرشی قواعد کون کرے اور قواعد بھی وہ جس کا کوئی اصول نہیں، کبھی پچھم رخ بیٹھائے گئے کبھی اتر رخ کبھی پورب کبھی دکھن، امتحان تھا یا چو مکھی کا وزن تھا، شرفاء کی توہین گارڈوں کی دل لگی، اور گارڈ بھی وہ کہ مائی گاڈ، کوئی گورکھی کوئی نیپالی، کوئی دکھنی کوئی بنگالی، خدا جانے کس کس دیساور کے ریزے چن چن کہ مہیا کیے گئے تھے اور کئی برس کی امیدواری میں یہ عہدہ جلیلہ ان کو بخشا گیا تھا۔ دیکھ بھال کر سفید پوش ہی پر منہ آتے تھے۔ بظاہر معزز دکھتے، اسی کو گیڈر بھپکیاں دکھاتے تھے۔ سب سے زیادہ ممدوح ایک صاحب تھے۔ پست قامت، نیلی رنگت، دانت بڑے، تیور کڑے، سر کے پریشان بال، چھچھوندر کی سی چال، گول دیدے، انتہا کے ندیدے، داڑھی گھسا، ہاوڑہ ساکن، ان کے بے موقع جملے بھی یادگار رہیں گے۔[1]

درج ذیل مضمون میں انگریز حکمرانوں کی اس پالیسی پر تنقید کی گئی ہے جس کے تحت وہ نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے بجائے پہلے سے موجود اداروں کو بھی زوال کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ جیسا کہ دہلی کالج کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مضمون کا عنوان ہے۔ 'تخفیف کا کٹھا کتا'

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۶ مارچ ۱۸۷۷ء

دوڑیو، دوڑیو، کاٹاکاٹا، دھوت دھوت، کہیں ٹانگ تو نہیں لے گا؟ ارے میاں، دیکھنا یہ کون غل مچا رہا ہے ؟ارے تو کون ہے، کیوں شور مچاتا ہے ؟ صاحب میں دہلی کالج ہوں۔ ناحق یہاں آپھنسا ہوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تخفیف کا کتا باولا ہو گیا ہے۔ بھلے کو یہ نہیں دیکھتا، برے کو یہ نہیں دیکھتا، جسے دیکھتا ہے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ لکڑی مارو تو اور زیادہ بھونکتا ہے۔ زر کا ڈھیلا کہاں سے لائیں جو اسے سمجھائیں۔ یہ کہنا تھا کہ جھٹ اس نے چکت دی۔ ہائے رے ہائے رے کاٹ کھایا، کاٹ کھایا۔[1]

ہندوستانی باشندوں کو عمومی طور پر کوئی عہدہ یا نوکری نہیں مل پاتی تھی، اگر کوئی ہندوستانی انگریزوں کا خوشامدی ہوتا یا ان کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہوتا تو اسے کچھ مل جاتا، درج ذیل مضمون میں اسی کی طرف طنز کا وار کیا گیا ہے۔

پیارے پنچ، انگریزی تہذیب کا دور ہے۔ اس لیے حذف زوائد کے بعد مدعا طراز ہوں۔ ان ہندوستانی عہدیداروں کے افادے کے لیے جو ترقی کے خواہاں ہیں ایک نسخہ تیار کیا ہے کہ جس کے استعمال سے بہت سے لوگ عروج پا گئے ہیں اور اکثر پاتے جاتے ہیں۔ اس لیے راقم حب الوطنی سے اس کی ایک نقل آپ کی خدمت میں بھیجتا ہے کہ آپ اس کو مشتہر فرما کر اپنے ہم وطنوں کو پورا پورا فائدہ پہنچا لیں۔

۱۔ صاحب لوگوں کی بلا امتیاز اعلی یا ادنی خوشامد اختیار کرنا ایسا کہ لوگوں کو یقین کامل ہو جائے کہ ان کی ملازمت کا خاص مدعا گورے رنگ کی خوشامد ہے۔

۲۔ انگریزی وضع کا اختیار کرنا حتی کہ اس میں اور انگریزوں میں رنگ کے علاوہ کوئی اور تمیز نہ رہے۔

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۳ مارچ ۱۸۷۷ء

۳۔انگریزوں سے خلط ملط رکھنااور برعکس اس کے ہندوستانیوں سے متنفر رہنااور مثل انگریزوں کے ان کو کالا لوگ، بگر وغیرہ کہنااور کلمات "ویل""ٹم" سے خطاب کرنا۔

۴۔انگریزوں سے ہم پیالہ وہم نوالہ رہناایسا کہ لوگوں کے نزدیک اس کے کرشٹان ہونے میں کچھ شبہ نہ رہے۔

۵۔انگریزوں کے کھیل تماشوں وجلسہ بال، ناچ وغیرہ میں ہمیشہ شریک رہنااور اکثر اوقات ان کو دعوتیں دیتے رہنا۔ یہاں تک کہ تنخواہ کا کم از کم نصف حصہ ان کی دعوتوں اور ضیافتوں میں جائے۔

۶۔کمیٹیوں، میٹنگ میں جو خاص انگریزوں سے متعلق ہیں اپنے بالادست انگریز عہدیداروں سے بڑھ چڑھ کر چندہ دیتے رہنا۔

۷۔ہمیشہ یااقتدار انگریزوں کو عموماً اور لوکل گورنمنٹوں کے سکریٹریوں اور میم صاحبات کو خصوصاً نذر نذرانے چڑھاتے رہنا۔[1]

ذیل کے اس مضمون میں ایک عورت اور اس کے بچے کے بیچ مکالمہ کی صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی ہندوستانی کے لیے سول سروس میں عہدہ پانا کتنا مشکل ہے۔

(بڑھیا اپنے بچے سے) بیٹا، تو کیوں سڑی ہو گیا ہے۔ اپنے بل کیوں نہیں بیٹھتا، جب دیکھو جب روتا ہے، مچلتا ہے، چڑچڑاتا ہے، دانت پیستا ہے، رہ تو سہی، بی شادی کو بلاتی ہوں۔ آنا بی شادی، کان تو کاٹنا، یہ نہیں مانتا۔

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۳اپریل ۱۸۷۷ء

بچہ: اوں اوں اوں، نہیں نہیں، چھیول چھروچھ (سول سروس) لونگا۔ دلا دے، نہیں تو تیرے گھر نہیں رہتے۔

بڑھیا: چپ چپ، کہیں کوئی سن نہ لے۔ ہائے کوئی ایسی بات کرتا ہے بابا۔ وہ تو کان کاٹ لیتی ہے۔ تجھ کو پکڑ لے جائے گی۔ سورہ سورہ، میں نندیا بلاتی ہوں۔ اری نندیا، آجا، بالے کو سلا جا، اچھا تم سوؤ، میں لوریاں گاتی ہوں:

گورے سول سروس پاویں کالے منہ تکتے رہ جاویں

سات سمندر کے اس پار سول سروس کا ہے یار

جو کوئی جاوے اس کو لانے سول اس کو دوڑے کھانے"[1]

حکومتی عہدوں پر تقرری یا پروموشن کے لیے جب انگریزی زبان سے واقفیت کی شرط لگائی گئی تو اودھ پنچ نے یہ رخ اختیار کیا۔

گورنمنٹ گزٹ مطبوعہ ۱۲ مارچ کو دیکھ کر کہ جس میں ایکسٹرا اسسٹنٹی تک بخوبی انگریزی دانی کی شرط ہو گی بے چارے ان ترقی خواہوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی جو کہ بڑی جانفشانی اور بے انتہا سرگرمی سے دس دس بارہ بارہ روپیے کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے اپنے ایک بڑے حصہ عمر کو صرف کر کے تحصیل داری یا پیشکاری تک پہنچے تھے اور اب قوی امید تھی کہ ہماری کامیابی کا درجہ قریب ہے کہ یکایک ان کو اس خبر کے سنتے ہی ایک سناٹے کا عالم ہو گیا اور دلوں پر یاس چھا گئی۔ فی الحقیقت یہ لوگ اپنی شومی بخت سے جس قدر حسرت وافسوس کریں کم ہے۔ اس لیے کہ ابھی وہ مژدہ فرح بخش سنے ہوئے کچھ بہت روز نہیں ہوئے ہیں

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۰ اپریل ۱۸۷۷ء

جس میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مستحق ہندوستانی بشرط لیاقت معزز عہدوں پر سرفراز کیے جاویں گے۔ گویہ مژدہ برائے نام یا دل خوش کن کیوں نہ ہو، اس نظر سے کہ اس کا ہنوز عملدرآمد نہیں ہوا۔ مگر تاہم عام کو ایک بڑی مسرت تھی کہ ہماری عادل سرکار اور ہماری منصف گورنمنٹ ہماری ترقی و بہبودی سے غافل نہیں ہیں اور وہ ضرور اس ناتواں حالت پر غور کر کے ہم کو اس کے ذاتی استحقاق سے محروم نہ رکھے گی۔ اگرچہ یہ بے چارے انگریزی نہ پڑھے ہوئے ایسے بڑے عہدوں کے بذات امید نہیں رکھتے تھے، بلکہ بخوبی جانتے تھے کہ ہم بغیر انگریزی دانی کے عالی عہدوں پر ترقی نہیں پا سکتے۔ لیکن اس قدر تو البتہ بھروسہ تھا کہ ہماری موجودہ ترقی جو کہ محدود کر دی گئی ہے اس میں کچھ فرق نہ آوے گا اور نہ آئندہ کو کوئی قید لگائی جائے گی۔ مگر ان قناعت گزیں ہندوستانیوں کو یار لوگ مرفہ الحال کب دیکھ سکتے ہیں۔ اب اگر اودھ میں شمار کیا جاوے تو بہ نسبت انگریزی دانوں کے انگریزی نہ پڑھے اکسٹرا اسسٹنٹ زیادہ ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اب تک کام اچھا نہیں کیا یا کہ آئندہ ان سے کام اچھا نہ ہوگا۔ نہیں، بلکہ یہ لوگ نہایت لائق ہیں اور اپنا کار متعلقہ بخوبی کر سکتے ہیں، جیسا کہ انگریزی دان کرتا ہو، بلکہ ہم ان لوگوں کو ان یورپین پر ترجیح دیتے ہیں جو کہ اکثر اضلاع اودھ میں اکسٹرا اسسٹنٹ ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ حکام اردو لکھنا پڑھنا کیا ہندوستانی زبان بھی جیسی چاہیے ویسی نہیں جانتے اور اس عہدہ کے واسطے بخوبی اردو جاننا بوجہ ہر قسم کے مقدمات کے نہایت ضروری ہے۔ پس ہم نہیں جانتے کہ ہمارے ایسے سرپرست افسر اور قدر دان حاکم نے اس خاطر شکن حکم کا جاری کرنا کیوں روا رکھا؟[1]

تعلیم کے تعلق سے انگریزوں کی جو پالیسی تھی اور جس طرح سے وہ ہندوستانیوں کو جہالت کے گڑھے میں ڈھکیل رہے تھے، اس کی طرف اس اقتباس میں اشارہ موجود ہے۔

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۰ اپریل ۱۸۷۷ء

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب (سر رشتہ تعلیم سے) اس کمبخت تعلیم نے دیسیوں کو بہت گستاخ کر دیا ہے۔ کیا کہیں ہم ایسا نہ سمجھتے تھے۔ اگر یہی لیل و نہار ہے تو آج کل میں سلطنت کی استقامت میں لغزش کا احتمال ہے۔

سر رشتہ تعلیم: حضور بجا ہے۔ اس کی فکر ضرور کر دینا چاہیے۔

لیفٹیننٹ گورنر: اجی، اس کا جھگڑا ہی نا چکا دو۔ اٹھا ہی نہ رکھو۔ ہم تو ایک سوچے ہیں۔ آؤ اس کے گلے میں بھاری پتھر باندھ کے گہرے پانی میں اسے ڈبا دیں۔

سر رشتہ تعلیم: بمجرد حکم کے اس کار خیر میں مصروف ہوا اور بہ لطائف الحیل تعلیم کو جکڑ کر گلے میں بھاری پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا۔

دیسی اور دیسی اخبارات (تعلیم کو غوطہ کھاتے دیکھ کر) دوڑیو، دوڑیو، پکڑیو، پکڑیو، ہے کوئی وطن کا خیر خواہ جو اس آڑے وقت میں آڑے آوے۔ یہ سن کر دو چار دل جلے پانی میں کود پڑے اور بصد مشکل تعلیم کی ٹانگ پکڑ کر کنارے کھینچ لیا۔ مگر دیکھتے کیا ہیں کہ سر دھڑ سے ندارد۔ جیوں تیوں من منوتی کر لی۔ کوئی کہتا تھا کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی، کوئی کہتا تھا کہ خیر دھڑ تو بچ رہا۔

نتھو: (جو الگ کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا) بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔[1]

انگریزی حکام کی طرف سے ہندوستانی باشندوں اور انگریزوں کے بیچ جو تفریق اور تعصب ہر میدان میں برتا جاتا تھا اسی پر تنقید و طنز ہے۔

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۱۵ مئی ۱۸۷۷ء

دفعہ نمبر ۹: لارڈ میکالے کا قول (جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا الخ) ترمیم کیا گیا۔ آئندہ بجائے اس کے یوں پڑھنا چاہیے جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا صرف واسطے یورپین کے کام ہے ایک دانا گورنمنٹ کا اور قائم رکھنا اس کا کام ہے ہم قوم (یورپین) دانا رعایا کا۔

دفعہ ۱۰: یورپین کو بلحاظ ہم قومی عام اختیار ہے کہ جس امر پر جیسی ان کی مرضی ہو بحث و مباحثہ کریں۔

دفعہ ۱۱: کبھی کبھی بربنائے حکمت عملی دیسیوں کی مفید اکثر تدابیر و تجاویز کی افواہ غلط اڑائی جاتی ہے۔ انگریزی اخباروں کو لازم ہے کہ جس قدر احاطۂ مکان کے اندر باہر، اوپر نیچے ہو، شور و غل مچائیں اور سوتی بھریں، جگائیں، تاکہ گورنمنٹ انفساخ تجویز یا کم توقف تعمیل پر مجبور و معذور ہو۔

دفعہ ۱۲: کسی دیسی کو بھولے سے اگر کوئی معزز عہدہ دیا بھی جائے تو انگریزوں کا حق ہے کہ جس قدر زور ہو گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائیں۔ اپنی حق تلفی پر واویلا کریں اور بھلا برا جو ہو سکے گورنمنٹ کو سنائیں، تاوقتیکہ وہ حکم منسوخ ہو یا اس عہدے کا نام ہی مبدل کیا جاوے۔ جیسے کہ دیسی جوڈیشیل اسسٹنٹوں کو آخرالامر ایکسٹرا جوڈیشیل اسسٹنٹ لکھا گیا۔

دفعہ ۱۳: کسی یورپین سے کوئی خطائے فاحش بھی سرزد ہو تو اول تو حتی الامکان حکام کو اس سے اغماض قطعی ضروری ہے اور شاید بحسب موقع کوئی ایسی ہی بات آبنے تو سزائے خفیف کی تجویز ہونی چاہیے۔

دفعہ ۱۴: جب ایسی سزا کا حکم صادر ہو عام اس سے کہ وہ کیسا ہی خفیف ہو تو انگریزی اخباروں کو فوراً اس پر لے دے کرنا فرض منصبی ہے تاوقتیکہ عدالت اعلیٰ سے بریت حاصل ہو جائے

اور خدا نخواستہ کوئی حاکم اعلی کسی حکمت عملی سے ایسا حکم منسوخ نہ کرے جو اسے خبطی، بیوقوف، نالائق بنادینے میں کوئی جرم نہیں ہے۔

دفعہ ۱۵: ہندوستانیوں کا خون کوئی جرم نہیں ہے اور ان کی جان عموما ایک گورے کے کتے بلی کے ہم قدر بھی نہیں بشرطیکہ قاتل قوم پیسری میں سے ہو۔ عام اس سے کے ادنی ہو یا عہدیدار۔

دفعہ ۱۶: جب کوئی ایسا واقعہ وقوع میں آئے تو قرین انصاف ہے کہ ایسے قاتل کو جو جرم قیصری میں سے ہو کچھ دست مزد کے طور پر دلایا جائے کیونکہ ایسے وحشی اور نالائق آدمیوں کے قتل سے دست نازک کو ضرور ہی تکلیف ہوتی ہو گی۔

دفعہ ۱۷: میڈیکل کالجوں میں ابتدا ہی سے یہ تعلیم بھی ساتھ ہونی چاہیے کہ جب کہیں قاتل یورپین اور مقتول انڈین ہو تو مقتول کو مطحول یا کسی اور مرض سخت کا ظاہر کیا جائے اور واسطے تعمیل حکم دفعہ ۱۶ ایک شہادت کافی لکھ دیا جایا کرے۔[1]

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے بیچ برتے جانے والے برتاؤ اور تعصبات پر نظم کی شکل میں تنقید کی گئی ہے۔

کچھ نہیں کام ہے لیاقت کا　　مرتبہ ہے تو گوری رنگت کا

سول سروس سے ہو گئے محروم　　خانہ برباد ایسی رنگت کا

کام کرتے ہیں ہندی اور انگریز　　صلہ پاتے ہیں حسن خدمت کا

قومی ہمدردی ہو جو مد نظر　　ستیاناس ہو عدالت کا

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۲۴ جولائی ۱۸۷۷ء

وقت پر ہو گیا الگ انگلینڈ　　یہ ملا ثمرہ اب محبت کا

کوششیں خوش ہیں کوٹ پتلون　　ہندی پہناوا ہے جہالت کا

طواف لندن کا جو ہے کر آیا　　نہیں قائل وہ ہوتا جنت کا

ہنس کہ کہتے ہیں لوگ سب سن کر　　ریختہ عمدہ یہ شہرت کا[1]

برطانوی حکمرانوں کی طرف سے ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے کوئی نظم کرنے کے بجائے صرف ترقی کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا، اس سے دل برداشتہ ہو کر اودھ پنچ نے لکھا۔

باوجودیکہ ۱۸۷۷ کی خشک سالی نے سب کا بھرم کھول دیا، افسوس صد افسوس گورنمنٹ سے جب جواب ملا تو یہی ملا کہ ترقی کرو، اخبار والوں سے جو سنا تو یہی سنا کہ ترقی کرو، ترقی معلوم نہیں کہ ترقی کس چیز میں کی جاوے، اگر علم کی ترقی کے لیے یہ زور شور ہے تو بھلا پتلی دال کھانے والے کہاں تک زور کریں، انٹرینس تک پہونچے کہ بصارت نہ دارد، عمر کا آدھا حصہ نہ دارد، جو لوگ کسی صیغہ میں نوکر بھی ہو گئے وہ کہتے ہیں کہ ترقی کیوں کر کریں، دو چار عہدہ داروں کو پھاند جائیں یا اپنے ہاتھ سے ترقی لکھ لیں، ہاں جس چیز میں ترقی ممکن تھی اس میں ترقی دیکھ لیجیے، نسل کی ترقی لے لیجیے، رنج و فکر و مصیبت کی ترقی دیکھ لیجیے، اس کے سوا آخر دنیا میں ترقی کرنے کا نتیجہ کیا ہے، ہزار ترقی کرو گے پھر آخر کو تنزل کی حالت کو آجاؤ گے، کیونکہ دنیا گول ہے۔ جہاں سے ترقی کرنا شروع کرو گے آخر کو اسی جگہ آنکلو گے۔[2]

---

[1] اودھ پنچ، جلد اول، ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء

[2] اودھ پنچ، جلد چہاردہم، ۲۵ مئی ۱۸۹۰ء

حاصل مطالعہ

کسی بھی ملک یا کسی علاقے پر اس ملک یا علاقے کے مقابلے میں زیادہ طاقتور کسی دوسرے ملک کی حکومت یا عوام کا اس انداز میں قبضہ کر لینا کہ اس مقبوضہ ملک کے ہر طرح کے معاملات میں اس قابض ملک کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور وہ اپنے انداز میں اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرے، جس طرح چاہے محکوم عوام کا استحصال کرے اور مقبوضہ ملک کی دولت و صنعت کو اپنے مفاد کے لیے اپنے طور پر استعمال میں لائے، نو آبادیات کہلاتا ہے۔ اس عمومی تشریح کو اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کے تناظر میں دیکھیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کا تجارت کی غرض سے ہندوستان میں آکر شاطرانہ و عیارانہ چالوں سے یہاں کے تخت و تاج پر قابض ہو جانا اور یہاں کی عوام کا استحصال کرتے ہوئے یہاں کی دولت کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا ہندوستان کے لیے برطانوی نو آبادیات کہلاتا ہے۔

اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ کسی بھی ملک پر دوسرے ملک کی حکومت یا عوام کا اس طرح قابض ہو جانا کہ اس مقبوضہ ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات پر قابض ملک کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور اسی کی حکمرانی ہو، وہ جس طرح چاہے محکوم عوام کا استحصال کرے اور اس ملک کی دولت و ثروت کو اپنے حصول مفاد کے لئے اپنے طور پر استعمال میں لائے، نو آبادیات کہلاتا ہے، نو آبادیات کا مطلب یہ ہے کہ ایک ملک جو اپنے آپ کو مختلف جہات مثلاً نسل، تہذیب، معیشت اور جدید ٹکنالوجی وغیرہ کے اعتبار سے برتر اور ترقی یافتہ سمجھتا ہے وہ ایک ایسے ملک پر قابض ہو کر اسے اپنی محکومی میں رکھتا ہے جسے وہ مذکورہ بالا امور میں کم تر اور پس ماندہ خیال کرتا ہے، اور یہ غیر ملکی اقلیت اس محکوم معاشرہ اور قوم کو اس وقت تک اپنی محکومی میں رکھتی ہے جب تک کہ وہاں کی عوام اس نظام

حکومت اور افراد حکومت کے خلاف قومی تحریک چھیڑ کر اور جان و مال کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو آزادانہ کرالیں۔

نوآبادیاتی نظام میں غیر ملکی حکمراں طبقہ اس محکوم ملک کے باشندوں کی تہذیب و ثقافت اور معاشرتی امور میں دخل اندازی کر کے انہیں ختم کرنا اور اپنے ملک کی تہذیب و معاشرت کو اس نوآبادی میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح محکوم ملک کی معیشت کو اپنے ملک کے مفاد کو ترقی دینے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ محکوم ملک کی معیشت اور وہاں کے مال و دولت کو اپنے ملک کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد اور مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظام میں حکمراں طبقہ محکوم ملک کے باشندوں کو اپنے آہنی پنجوں میں لا کر ان کا بڑی تیزی سے استحصال کرتا ہے۔ نوآبادیات دراصل ایک دریا کی مانند ہے جو عالمی سرمایہ داری کی آبیاری کرتا رہتا ہے، اگر اس کا رخ بدل دیا جائے یا یہ دریا سوکھ جائے تو اس نظام کو بہت بڑا نقصان پہنچے گا۔ تاریخ عالم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ اور سرمایہ دار ملک مثلاً برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور جاپان نے اپنے اپنے نوآبادیات کا بلا روک ٹوک استحصال کر کے بے انتہا مال و زر اپنے اپنے ملکوں کے لئے جمع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مذکورہ ملکوں کی موجودہ خوش حالی اور زود رفتار صنعتی ترقی نوآبادیات کا خون چوس کر ہی ہوئی ہے اور ان کے زیر اثر محکوم ممالک کی تنزلی اور پسماندگی بھی اسی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ ہے۔

عہد قدیم سے ہندوستان تہذیب و تمدن، طرز معاشرت، اچھے اخلاق اور باہمی میل جول کے لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل رہا ہے، یہاں پر بسنے والے لوگوں کی فطرت میں قدرت نے مہمان نوازی، سماجی اقدار کا پاس و لحاظ اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک ہونے کا جذبہ موجزن فرمایا ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب و برادری کے اعتبار سے مختلف قسم کی رنگارنگی اور تنوع کے باوجود یہاں کے لوگ آپس میں مل جل کر زندگی گزارتے اور ایک ہی ساتھ رہتے رہے ہیں، ہندوستان قدیم زمانہ سے روحانی پیشواؤں اور اعلیٰ اقدار کے حامل رہنماؤں کا مرکز رہا

ہے اور انہیں کا اثر تھا کہ انگریزی اقتدار کے عروج سے پہلے تک یہاں کے عام باشندے اعلی صفات اور عمدہ اخلاق کے عادی تھے۔

ہندوستان کو قدرت نے نہایت زیادہ زرخیز ملک بنایا ہے۔اس میں ہر قسم کے اناجوں کی کاشت اور پیداوار کے طرح طرح کے ذرائع مہیا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے زمانۂ قدیم سے یہاں بافراط غلہ پیدا ہوتا رہتا تھا اور یہاں کے باشندے ہمیشہ خوش حال اور فارغ البال رہتے تھے۔ قحط اور کال کا نام تک ملک کے عام باشندے تقریباً نہیں جانتے تھے،اس قدر پیداوار ہوتی تھی کہ اس زمانہ کی ارزانی کو سن کر نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات گزشتہ تاریخی تصریحات کو آج کے زمانہ کے لوگ جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں غلہ جات کی پیداوار بہت زیادہ تھی اور بہت زیادہ ارزانی اور سستے بھاؤ سے تمام اناجوں کے اقسام اور ضروریات زندگی فروخت ہوتی تھیں، جس کی وجہ سے تمام باشندگان ہند نہایت خوش حال اور فارغ البال، راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عموماً ان کو اناج اور خورد و نوش کی کمی ستاتی نہ تھی۔

صنعتی اور تجارتی اعتبار سے بھی یہ ملک کافی اہمیت کا حامل تھا، یہاں ہر قسم کی اعلی اور ادنی صنعتوں کے بے شمار کارخانے قائم تھے جن سے ملکی ضروریات اور ذرائع ترقیات پوری ہوتی تھیں، ہر صنعت کے اعلی درجہ کے ماہر دست کار پائے جاتے تھے جو کہ یہاں کی خام پیداوار سے نہایت نفیس ایسی عمدہ اشیاء تیار کرتے تھے جن کی اطراف عالم میں نہایت زیادہ مانگ اور قبولیت ہوتی تھی، خشکی اور تری کے راستوں سے ان کی تجارت ایشیاء، یورپ، افریقہ اور دیگر ممالک میں ہوتی تھی، بیرونی ملک سے ہر سال کروڑوں اشرفیاں انہیں مصنوعات کی قیمت میں ہندوستانی تاجر حاصل کرتے تھے اور ہندوستانی باشندے کروڑوں آدمیوں کی تعداد میں یہاں کی صنائع، ہنرمندیوں اور تجارتوں کے ذریعہ آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر برطانیہ کو ہندوستانیوں کا عیش و آرام نہ بھایا اور ان کی آنکھوں میں کھٹکنے اور چبھنے والا کانٹا بن کر دن و رات بے چین کرنے لگا۔ مدبرین برطانیہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح ہندوستان کی

صنعت اور تجارت پر چھاپہ مارا جائے اور اس کی تمام صنعتوں اور تجارتوں پر اپنا قبضہ جمایا جائے۔ تنہائیوں میں، مجمعوں میں، حکومت کے ایوانوں میں اس کے تذکرے جاری ہوئے، اسکیمیں بنائی گئیں، رزولیوشن پاس ہوئے اور مظالم کے نت نئے طریقے ایسے ایسے جاری کیے گئے جن کی انسانی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ تہذیب کا دعوی کرنے والی قوم اور انسانیت کی خدمت کا ڈھونگ رچانے والی ملت نے ایسے ایسے انسانیت کش طریقے اپنائے اور ہندوستان میں جاری کیے جن کے سامنے قدیم زمانہ کے ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر بادشاہوں اور قوموں کے وحشیانہ مظالم بھی ہیچ تھے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر انگریزی اقتدار تک ہندوستان میں مختلف غیر ملکی قوموں کی حکمرانی رہی ہے، ہندوستان میں باہر سے آنے والے حکمرانوں میں سب سے زیادہ دنوں تک مغلوں کی حکومت رہی۔ اس حکومت نے یہاں کی تہذیب اور رہن سہن میں چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اپنے آپ کو اسی طرز میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ باہر سے آنے والوں کے کچھ اثرات یہاں کے باشندوں نے قبول کیے اور یہاں کی کچھ تہذیب و تمدن کو آنے والے حکمرانوں نے اپنایا اور اس نتیجہ میں عظمت انسانی، تہذیب و شائستگی، علم و فن اور زبان و ادب کی بے کراں ترقی و اشاعت عمل میں آئی۔ ہندوستان اپنی سماجی رواداری، تجارتی شناخت، زرعی پیداوار، اقتصادی ترقی اور صنعتی امتیاز کے سبب ہمیشہ مختلف ملکوں اور قوموں کی توجہ کا مرکز رہا ہے، اسی وجہ سے دیگر ممالک کے بہت سے لوگوں اور کمپنیوں نے تجارتی مقاصد کے پیش نظر یہاں کا رخ کیا اور یہاں کے لوگوں اور حکمرانوں نے ان سب آنے والوں کا استقبال کیا اور انہیں ہر طرح کی اعانتیں اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان ہی غیر ملکی کمپنیوں میں برطانیہ سے آنے والی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' بھی ہے۔ اس کمپنی سے منسلک انگریزوں کا مقصد اصلی تجارت کے پس پردہ یہاں کی حکومت پر قابض ہونا تھا اور وہ اول دن سے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے خاکے اور منصوبے تیار کرنے لگے اور بالآخر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔ ہندوستان میں حصول اقتدار کے بعد انہوں نے اس ملک اور یہاں کے باشندوں کا ہر ہر محاذ پر استحصال کرنا شروع کر دیا۔

انگریزوں نے ہندوستانی باشندوں پر اپنی سماجی، سیاسی اور تہذیبی برتری قائم کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے۔ انہوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان مذہب کے نام پر ہندو مسلم میں تفریق پیدا کی تو دوسری طرف ایک ہی مذہب کے لوگوں کو مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ کیوں کہ ہندوستانیوں کے متحد ہونے سے ان کی حکومت کو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، انہوں نے ہندوستانیوں کو کہیں ذات کے نام پر تو کہیں علاقے کے نام پر بھی لڑانے کی کامیاب کوشش کی۔ انگریز حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں اور ان کی تہذیب و تمدن کو غیر مہذب اور بداخلاق و غیر شائستہ کہہ کر انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھا۔ مقامی باشندوں کے اوپر یورپ سے لائی گئی تہذیب و تمدن کو تھوپنے، اپنی نسلی، سماجی و سیاسی برتری کو قائم رکھنے اور اپنی عنان حکومت کو بنائے رکھنے کو نوآبادیات کا نام دیا۔ نوآبادیت پر حکومت کے زعم میں طرح طرح کی بندشیں عائد کیں اور نئے نئے قوانین نافذ کیے جن کی مدد سے ان کا برابر استحصال کیا جاتا رہا اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا گیا۔

انگریز حکمرانوں کے ذریعہ نوآبادیاتی ہندوستان میں صنعتی اور اقتصادی ترقی کو نہ صرف زبردستی روکنے کی کوشش کی گئی بلکہ یہاں کی گھریلو صنعتیں اور زراعتی نظام کو بھی بڑے خفیہ اور منظم انداز میں جان بوجھ کر ناکارہ اور تباہ کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی عوام اور خاص کر مزدوروں اور کسانوں کی معاشی حالت کنگالوں کی سی ہو گئی۔ کسانوں سے لگان کے نام پر اس کی پیداوار کا بڑا حصہ وصول کر لیا جاتا، سرکار ان زمینداروں کا ساتھ دیتی جو کسانوں پر کمر توڑ لگان لگاتے اور ان ساہوکاروں اور تاجروں کی پشت پناہی کرتی جو طرح طرح سے غریب کسانوں اور مزدوروں کو لوٹتے اور ان کا استحصال کرتے۔ ان حالات میں ملک کی پوری کی پوری آبادی غریبی اور محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی، بھوک مری اور فاقہ کشی تک کی نوبتیں پہنچ گئیں۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اور زمین و جائداد کے مالک آہستہ آہستہ اس نظام کا شکار ہوتے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ وہ لوگ جن کے درباروں سے روزانہ سینکڑوں لوگوں کی روزی روٹی اور معاش کا سلسلہ جڑا ہوا تھا وہ خود فاقہ کشی کا شکار ہونے لگے، ان کی زمینیں، جائداد اور

مال وزر کو ضبط کر لیا گیا اور ملک میں معاشی بد امنی اور سماجی بے راہ روی کا نقشہ ہر طرف دیکھنے کو ملنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر انصاف پسند مؤرخین اور قلم کاروں نے نو آبادیاتی حکومت کی پالیسیوں اور نظام حکومت پر تنقید کی ہے اور اسے ایک ظالمانہ اور متعصبانہ رویہ قرار دیا ہے۔

صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ہندوستانیوں کے پاس ایک پیشہ ملازمت کا باقی رہ گیا تھا جس سے وہ اپنی اقتصادی اور معاشی حالت کو کچھ سدھار سکتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے یہاں بھی بے ایمانی، تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا۔ ہندوستانیوں کو آہستہ آہستہ اعلی ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا اور تمام منفعت بخش اختیارات اور عہدے انگریز سوداگروں اور کلرکوں کو دے دیے گئے۔ بے ایمانی اور تنگ نظری کی انتہا یہ ہوئی کہ ایک ہی عہدے پر کام کرنے والے ہندوستانی اور انگریز میں تفریق کی گئی، خلاف قانون انگریز عہدیداروں کی تنخواہیں ہندوستانیوں کے مقابلے میں بڑھادی گئیں اور بہت سے عہدے صرف انگریزوں کے ہی لیے مخصوص کر دیے گئے۔ جس کے نتیجے میں یہاں کے باشندوں میں بے روزگاری بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی اور ہندوستانی باشندے محتاجگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس ملک اور یہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کے لیے کوئی منظم کام نہیں کیا بلکہ ہر طرح سے اسے برباد ہی کیا۔ ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے اور انہیں تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیا بلکہ اسے اور تنزلی کا شکار بنا دیا۔ ہندوستانیوں کی تعلیمی انحطاط کی وجہ یہ رہی کہ دراصل انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت کو ختم کر دیں گے اور ہماری حکومت زیادہ دنوں تک یہاں قائم نہیں رہ پائے گی، اس لیے انہوں نے تعلیم گاہوں کو ملیامیٹ اور تعلیمی نظام کو نیست و نابود کر دیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو ۱۸۳۸ء میں سرکاری قبضہ میں لے کر ہندوستانیوں کی تعلیمی ترقی کی راہ کو مسدود کر دیا۔

تحریک انقلاب میں نمایاں اور قائدانہ رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کے تباہ کن اثرات سے ہندوستانی عوام کو متعارف اور باخبر کرنے میں اردو صحافت نے ذمہ دارانہ کردار ادا کیا۔ اس دور کے نمائندہ اردو اخبارات نے اپنے دور کے سماج کی بہترین نمائندگی کی اور بالعموم صحافتی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے بہترین کردار ادا کیا۔ تاریخ عالم کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی بھی طرح کے انقلابات ہوئے اور حکومتوں کا تغیر و تبدل ہوا، اس میں وہاں کی صحافت نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ جہاں امریکہ، فرانس اور یونان جیسے ممالک میں صحافت نے معرکۂ حریت کو نئی سمت عطا کیا، وہیں ہندوستان کو انگریزی سامراج سے آزادی دلانے میں اردو صحافت نے ہر گام اور ہر ڈگر پر آزادی کی نقیب بن کر نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی بتاتی ہے کہ ملک کو آزاد کرانے میں اردو صحافت نے جس جوش و خروش اور شجاعت و بے باکی کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ صحافت کا نمایاں باب ہے، آزادئ وطن کی خاطر اردو صحافت کی عظیم خدمات اور قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جنگ آزادی میں اردو صحافت اور اس کے ذریعہ دیے گئے 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے نے انگریزی حکومت کے بلند عزائم کو متزلزل کرنے میں توپ، میزائل اور دیگر آلات حرب و ضرب سے زیادہ مؤثر رول ادا کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

انسانوں کے بنیادی حق (آزادی) کو بالجبر چھین کر انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والی قوتوں اور اس بنیادی حق کی پاسداری اور تحفظ کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دینے والی قوتوں کے درمیان باہمی کشمکش اور مقابلہ آرائی کے واقعات اور حالات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ چونکہ صحافت انسانی زندگی کی سرگرمیوں اور ملکی نظام حکومت کے توازن کو برقرار رکھنے میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ملک میں بہتر نظم و نسق کو بحال رکھنے میں صحافت کو چوتھے ستون کا درجہ حاصل ہے، چنانچہ انسانوں کے بنیادی حقوق کی پامالی کرتے ہوئے کسی بھی ملک اور اس کے باشندوں کو جبر و تشدد اور ظلم و زیادتی کے ذریعہ غلام بنا لینے کی وجہ سے جو افراتفری اور مزاحمت کی صورت حال پیدا ہوتی ہے اس کے اثر کا صحافت میں بھی پایا جانا عین فطری اور ایک متوقع عمل ہے۔

انیسویں صدی کے اردو اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے واقعات بتاتے ہیں کہ نوآبادیاتی ہندوستان میں خود کو مہذب اور تہذیب و ثقافت کے علمبردار کہے جانے والے جھوٹے انگریزوں نے کس طرح کے غیر مہذب اور انسانیت سوز برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ کئے ہیں۔ طاقت و قوت کے زعم میں کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر انسانی عزت و حرمت کی ساری حدوں کو پار کر جانے والے انگریزوں کی ان ملعون حرکتوں کے خلاف اردو اخبارات نے کھل کر لکھا۔ ہندوستان کے سماجی و معاشرتی معاملات میں انگریزوں کے ذریعہ کی جانے والی دخل اندازیوں کو قطعاً برداشت نہیں کیا اور اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت کو انگریزوں کے ذریعہ بگاڑے جانے کی ہر کوشش کو ناکام کرنے کی قابل ستائش کوشش کی۔ انگریزی حکام کی ملمع سازی اور تہذیب و تمدن کے جھوٹے لبادہ کا پردہ چاک کرنے میں ان اخبارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستانی عوام کو صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز قائم کر کے صحیح لائحۂ عمل مرتب کرنے کا سبق دیا۔

اس پورے سفر میں ہندوستانی عوام کے ہر طبقے نے اپنے اپنے طور پر بساط بھر کوشش کی۔ صحافت اور خاص کر اردو صحافت کی خدمات کا باب بھی اس سلسلے میں تابناک اور روشن ہے۔ اردو اخبارات میں اودھ پنچ نے خاص کر نوآبادیاتی نظام حکومت اور مغربی تہذیب و معاشرت کے خلاف سینہ سپر ہو کر بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نمایاں کردار ادا کیا۔

جس وقت اودھ پنچ منظر عام پر آیا اس وقت تک اردو صحافت تقریباً نصف صدی کا سفر طے کر چکی تھی۔ اپنے آغاز سے لے کر اب تک اردو صحافت بہت سے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے ترقی کے درخشاں دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اودھ پنچ کے اجرا سے پہلے کئی معیاری اور رجحان ساز اخبارات منظر عام پر آچکے تھے اور میدان صحافت میں ان کی نمایاں حیثیت اور قابل قدر کارناموں کے لوگ قائل تھے اور اردو اخبارات کے قارئین کا ایک وسیع حلقہ ملک کے مختلف علاقوں میں قائم ہو چکا تھا۔ ماضی میں وجود پذیر ہونے والے اخبارات میں چند اخبارات نے تو انقلاب ۱۸۵۷ء

میں ملکی اور قومی خدمات کے حوالے سے تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا تھا لیکن ان تمام خصوصیات و کمالات کے باوجود اودھ پنچ کی اشاعت ہندوستانی صحافت اور خاص کر اردو صحافت کی تاریخ کا ایک یادگار کارنامہ اور زریں باب ہے۔

جس دور میں اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا، ہندوستانی تاریخ کے اس دور میں مختلف رجحانات آپس میں دست و گریباں تھے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب و معاشرت کے مقابلے میں مغربی تہذیب و تمدن کو تفوق و برتری حاصل ہو رہی تھی۔ ہندوستانی باشندوں کا ایک طبقہ اپنی قدیم روایات اور تہذیب و معاشرت کو کسی قیمت پر ختم ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جسے انگریزی تہذیب اور کلچر میں صرف خوبیاں ہی نظر آ رہی تھیں اور وہ آنکھیں بند کر کے مشرقی اقدار کو ختم کر کے مغربی طرز زندگی کو اپنائے جانے کا حامی و علمبردار تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو اعتدال و توازن کی راہ اپنانے کے حق میں تھا اور جدید و قدیم دونوں تہذیبوں میں پائی جانے والی خوبیوں سے استفادہ کر کے ایک مخلوط نئی تہذیب کو وجود میں لانا چاہتا تھا۔ لہٰذا ہندوستانی تاریخ کا وہ دور سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک ہنگامی دور تھا اور اسی زمانہ میں اودھ پنچ نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد انگریزی تہذیب اور نو آبادیاتی ہندوستان میں سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی بے راہ روی اور حکومتی تعصب و جانب داری کی مخالفت تھا اور اس نے اس مقصد کے حصول کے لئے قدیم صحافتی طرز نگارش سے ہٹ کر طنز و ظرافت کا ایک جدید طریقہ اختیار کیا۔

سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے جس طرح کی بھی تبدیلیاں اس دور میں ظہور پذیر ہو رہی تھیں وہ سب کی سب کم و بیش اس دور کے اردو اخبارات کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ سیاسی، تہذیبی اور لسانی مسائل پر فکری اختلافات کے باوجود بہ حیثیت مجموعی اس دور کے اخبارات نے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی نشاندہی کی۔ عوام کے شعور کی بیداری اور فرسودہ خیالات کو تبدیل کرنے میں اخبارات نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ جہالت، پس ماندگی، ذہنی افلاس اور طرح طرح کی سماجی اور اخلاقی برائیوں کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا۔ ان کے خلاف پُر زور مہمیں چلائیں اور ان مصلحین کے دست و بازو بنے جو معاشرے میں تبدیلی و اصلاح کے لیے سر گرم عمل تھے۔ ان تمام

اخبارات میں اودھ پنچ مذکورہ بالا تمام مسائل کو منظر عام پر لانے اور ان پر تبصرہ و تنقید کرنے میں پیش پیش تھا۔اس کے علاوہ اودھ پنچ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ نو آبادیاتی ہندوستان میں برطانوی طرز حکومت کو بھی اس نے تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنایااور غلط پالیسی اور ملک مخالف فیصلوں کی زبردست تنقید کی۔اس اخبار نے اردو نثر نگاری میں ادبی انقلاب کے ضمن میں اس دور میں جو تغیرات اور تبدیلیاں ہوئیں،انہیں صحیح رخ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔صحافتی نقطۂ نظر سے وہ دور اردو صحافت کے عہد زریں کی تمہید ہے اور اس اخبار نے اس عہد زریں کو عروج کمال تک پہنچایا۔اودھ پنچ نے خود کو محض ایک عام اخبار کی حیثیت سے نہیں پیش کیا بلکہ ادبی تحریکوں، سیاسی مسائل اور سماجی بے اعتدالیوں کو منظر عام پر لانے میں مؤثر کردار ادا کیا۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

اسماعیل، محمد پانی پتی، مقالات سرسید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷

الہ آبادی، اکبر حسین اکبر، کلیات اکبر، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۳۱

اودھ پنچ، ۱۹۱۲-۱۸۷۷ (مختلف فائلیں) دور اول: ایڈیٹر منشی سجاد حسین

اودھ پنچ، ۱۹۳۳-۱۹۱۶ (مختلف فائلیں) دور ثانی: ایڈیٹر، حکیم محمد ممتاز حسین عثمانی

اودھ پنچ، ۱۹۳۴-۱۹۳۳ (مختلف فائلیں) دور ثالث: ایڈیٹر، ظہیر حیدر

پاشا، احمد جمال، اودھ پنچ، دور سوئم، لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۷۵

چکبست، برج نرائن، مضامین چکبست، الہ آباد: انڈین پریس، ۱۹۲۸

صدیقی، انور، (ترتیب) انتخاب مضامین سرسید، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۲

صدیقی، رشید احمد، طنزیات و مضحکات، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱

کاظمی، رضی، (ترتیب) انتخاب اودھ پنچ، لکھنؤ: کتابی دنیا، ۱۹۷۸

ثانوی مآخذ

ابن اسماعیل، اردو طنز و مزاح: احتساب و انتخاب، سری نگر: گلشن پبلیشرز، ۱۹۸۸

اختر، اقبال، اردو نثر میں ظرافت، پٹنہ: اردو لائبریری، ۱۹۸۶

ادروی، اسیر، دارالعلوم دیوبند: احیائے اسلام کی عظیم تحریک، دیوبند: دارالمؤلفین، ۲۰۰۸

ادروی، اسیر، مولانا قاسم نانوتوی: حیات اور کارنامے، دیوبند: شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم، ۱۹۹۷

اشرف، ڈاکٹر ہمایوں، (ترتیب) اردو صحافت: مسائل اور امکانات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶

اکبر آبادی، سعید احمد، مسلمانوں کا عروج وزوال، ممبئ: مکتبہ الحق، ۲۰۰۶

اکبر، ایم. جے. ہندوستان اپنے حصار میں، پٹنہ: ادارہ تحقیقات اردو، ۱۹۹۳

امام، ظفر، مارکسزم: ایک مطالعہ، نئی دہلی: مسلمانوں کا سوشلسٹ مرکز، ڈیفنس کالونی، ۱۹۷۱

انصاری، اختر، افادی ادب، دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۵۹

انصاری، اختر، لسان العصر، کراچی: بزم اکبر، ۱۹۵۱

انور، ڈاکٹر سہیل، مرزا فرحت اللہ بیگ بحیثیت مزاح نگار، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۸

آغا، ڈاکٹر وزیر، اردو ادب میں طنز ومزاح، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰

بیدار، عابد رضا، اودھ پنچ انیسویں صدی میں، علی گڑھ: علی گڑھ اردو ادب میگزین، ۱۹۶۳

پاشا، احمد جمال، ظرافت اور تنقید، سیوان: اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۹

پاشا، احمد جمال، ظرافت اور تنقید، یوپی: مطبع نشاط پریس، ٹانڈہ، ۱۹۸۲

پرولکر، اے. کے. ہندوستان میں چھاپہ خانہ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۹

ٹامسن، ایڈورڈ، انقلاب ۱۸۵۷: تصویر کا دوسرا رخ (مترجم: شیخ حسام الدین)، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶

جالندھری، ڈاکٹر رشید احمد، برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، دیوبند: مکتبہ اتحاد، سن اشاعت درج نہیں

جوشی، پی سی، انقلاب ۱۸۵۷ء، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۱۹۸۳

جوشی، پی سی، انقلاب ۱۸۵۷، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۷۲

چند، تارا، تاریخ تحریک آزادئ ہند، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۱۹۹۸

چندرا، بپن، جدید ہندوستان نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۱۹۹۴

چندن، گربچن، اردو صحافت کا سفر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷

چندن، گربچن، جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱

چودھری، ڈاکٹر فوزیہ، اردو کی مزاحیہ صحافت، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۰

حسین،احتشام،(ترتیب)ادب پارے، لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو،۱۹۵۹

حسین،احتشام،اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل،۱۹۹۷

حسین،پروفیسر محمد شاہد،ابلاغیات،دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۴

حسین،ثریا،سرسید احمد خان اور ان کا عہد،دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،

حسین،ڈاکٹر اعجاز،ادب اور ادیب،الہ آباد: ادارہ انیس اردو،۱۹۶۰

حسین،سید عابد، قومی تہذیب کا مسئلہ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل،۱۹۹۸

حسین،سید عشرت،حیات اکبر الہ آبادی، کراچی: کلیم پریس،۱۹۵۱

حسین،مظہر (مظہر مہدی) علی گڑھ تحریک: سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۹۳

خان،نادر علی،اردو صحافت کی تاریخ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۷

خورشید،عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں،لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۳

خورشید،عبدالسلام،کاروان صحافت، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)،۱۹۶۴

دریابادی،عبدالماجد،اکبر نامہ، لکھنؤ: فروغ اردو،۱۹۵۴

ذکاءاللہ،تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ،دہلی: شمس المطابع،۱۹۰۴

ردولوی،پروانہ،اردو صحافت کا استغاثہ، نئی دہلی: حیا پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۴

رمیش دت،ہندوستان کی معاشی تاریخ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو بیورو،۱۹۷۹

رمیش دت،ہندوستان کی معاشی تاریخ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل،۱۹۷۹

زاہد، محمد،اکبر کی طنزیہ و ظریفانہ شاعری، علی گڑھ: مصنف،۱۹۷۹

زکریا،ڈاکٹر رفیق،ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۸۵

زیدی،ڈاکٹر شمع افروز،اردو ناول میں طنز و مزاح، نئی دہلی: بیسویں صدی پبلیکیشنز،۱۹۸۷

زینی،سید عبید السلام،اسلامی صحافت،دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی،۱۹۹۰

سرکار، سمت، جدید ہندوستان، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳

سرور، آل احمد، تنقیدی اشارے، لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۵

سعید، طارق، اردو طنزیات ومضحکات کے نمائندہ اسالیب، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۶

سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اردو، دہلی: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۳

سکسینہ، رمن راج، جدید ہندوستان کے معمار، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۱۹۸۸

سندر لال، پنڈت، سن ستاون، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۷

شیدا، راجندر ناتھ، ادب، فکر، سماج، دہلی: ایشیا پبلشرز، ۱۹۷۲

صابری، امداد، تاریخ صحافت اردو، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان، ۱۹۵۳

صابری، امداد، روح صحافت، دہلی: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، ۱۹۶۸

صدف، مشتاق، اردو صحافت: زبان، تکنیک، تناظر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰

صدیقی، ابواللیث، لکھنو کا دبستان شاعری، لکھنؤ: اردو پبلیشرز، ۱۹۷۳

صدیقی، عابد، ادب اور صحافت، حیدر آباد: نیرنگ اکبری، ۱۹۷۴

صدیقی، محمد عتیق، اٹھارہ سو ستاون کے اخبار اور دستاویزیں، دہلی: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، ۱۹۶۶

صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۷

طاہر، محمد، مشتاق یوسفی کی ادبی خدمات، اعظم گڑھ: ابوذر پریس، ۲۰۰۳

ظفری، ڈاکٹر ظفر عالم، اردو صحافت میں طنز و مزاح، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۶

عابد حسین، سید، قومی تہذیب کا مسئلہ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸

عباس، اصغر، سرسید کی صحافت، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۵

عبدالغفور، خواجہ، طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۳

عبدالودود قاضی، چند اہم اخبارات و رسائل، پٹنہ: ادارہ تحقیقات اردو، ۱۹۹۳

علوی، احمد ابراہیم، اردو صحافت کا جائزہ، لکھنؤ: کوالٹی پروسیز، ۲۰۰۰

علی، انور دہلوی، اردو صحافت، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷

علی، عبداللہ یوسف، انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ، کراچی: جاوید پریس، ۱۹۶۷

علی، محمود، عظمت ہندوستان اور عہد وسطی، دہلی: محمودیہ پبلک اسکول، ۲۰۰۲

فاروقی، محمد عبدالرزاق، اودھ پنچ اور اکبر الہ آبادی، کرنول: یونائیٹڈ پریس، ۱۹۸۲

فاروقی، محمد عبدالرزاق، اودھ پنچ کی ادبی خدمات، کرنول: شاہین کلب، ۱۹۸۲

فاروقی، محمد عبدالرزاق، داغ اور اودھ پنچ کے ادبی معرکے، کرنول: یونائیٹڈ پریس، ۱۹۸۲

فتحپوری، ڈاکٹر فرمان، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴

فرقت، غلام احمد کاکوری، اردو ادب میں طنز ومزاح، لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۵۷

فہمی، محمد یونس، اردو شاعری میں طنز ومزاح، حیدر آباد: الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۹

قادری، سید اقبال، رہبر اخبار نویسی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۲۰۱۱

قدوائی، محمد ہاشم، جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۱۹۸۵

قریشی، نسیم، (ترتیب) علی گڑھ تحریک، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاٶس، ۱۹۸۶

قیصر، مصباح الحسن، معاونین اودھ پنچ، لکھنؤ: یونائیٹڈ پریس، ۱۹۸۰

قیصر، مصباح الحسن، اردو طنز وظرافت اور منشی سجاد حسین، لکھنؤ: یونائیٹڈ پریس، ۱۹۷۸

کشور، برج، ایس کے بھٹناگر، ہندوستانی معیشت، نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ، سن اشاعت واضح نہیں

کھوکھر، محمد افتخار، تاریخ صحافت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹

کول، کشن پرشاد، ادبی و قومی تذکرے، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۵

کول، کشن پرشاد، گلدستۂ پنچ، لکھنؤ: نول کشور پریس، ۱۹۵۱

گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی، دیوبند: مکتبہ دار العلوم، سن اشاعت درج نہیں

گیلانی، مناظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ممبئی: مکتبہ الحق، ۲۰۰۷

محمد خان، ظہور، تحریک آزادئ ہند، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، ۲۰۰۱

محمد میاں، سید، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، دیوبند: فیصل پبلی کیشنز، سن اشاعت درج نہیں

محمد میاں، سید، علمائے ہند کا شاندار ماضی، دیوبند: فیصل پبلی کیشنز، سن اشاعت درج نہیں

محمود، ڈاکٹر خالد، (ترتیب) اردو ادب میں طنز و ظرافت کی روایت، دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۵

مدنی، حسین احمد، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، لاہور: طیب پبلیشرز، ۲۰۰۴

مسعود، ڈاکٹر طاہر، اردو صحافت انیسویں صدی میں، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹

منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، بدایوں: نظامی پریس، ۱۹۳۰

مہدی، صغریٰ، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۱

مہدی، مظہر، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات: نوآبادیاتی ہندوستان، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹

ندوی، سید ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت، لکھنؤ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۲۰۰۰

نظامی، خلیق احمد، سر سید احمد اور علی گڑھ تحریک، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۳

نعمانی، شبلی، شعر العجم، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۷۲

نقوی، سید محمد اشرف، اختر شہنشاہی، لکھنؤ: اختر پریس، ۱۸۸۸

نقوی، نورالحسن، سر سید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۱

نورانی، امیر حسن، (ترتیب) اردو کے ادبی معرکے: سودا کے عہد سے چکبست تک، لکھنؤ: مصنف، ۱۹۶۹

ہاشمی، مسرور علی اختر، مغربی تعلیم اور مسلمان، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۱

ہاشمی، نورالحسن، دلی کا دبستان شاعری، لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۱

English Books

Aziz K. K., *Britain and Muslim India*, Reprinted Islamic Book Service, Lahore, 1987

Balandier, G. "The Colonial Situation: A Theoretical Approach" in Immamuel Wallerstein. (ed.) *Social Change: The Colonial Situation*, New York, London and Sydney, John Wiley & Sons, 1966

Chandra, Bipin, *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi 1989

Chanra, Bipan, "Colonialism, Stages of Colonialism and Colonial States", *Journal of Contemporary Asia*, Vol. No. 10, (1980)

Keith, Arthur Beweredate, *A Constitutional History of India*, 1600 – 1935, Imprint, Delhi Low Price, Publications, 1990

Mushirul Hasan, *Witt and Humour in Colonial India*, Niyogi Books, New Delhi, 2009

Sharma, L. K., *Indian Society*, NCERT, New Delhi, 1990

Smith, Adam, *Wealth of Nations*, Modern Library Edition, London, J. M. Dent & Sons, 1993

William, Adam: "Reports on the State of Education in Bengal 1835 – 1838", edited by A. Basu, Imprint Calcutta: University of Calcutta, 1941

رسائل و جرائد

آج کل (نئی دہلی) اردو صحافت نمبر، نومبر-دسمبر، ۱۰۸۳

آج کل (نئی دہلی) اگست ۱۹۸۶

آج کل (نئی دہلی) جنوری ۲۰۰۵

آج کل (نئی دہلی) ستمبر ۱۹۹۹

آج کل (نئی دہلی)طنز ومزاح نمبر، اپریل ۱۹۷۴

آج کل (نئی دہلی)طنز ومزاح نمبر، مئی ۱۹۷۴

آج کل (نئی دہلی)فروری ۱۹۷۵

آج کل (نئی دہلی) مارچ ۱۹۹۴

آج کل (نئی دہلی)مئی ۱۹۹۳

ادیب (علی گڑھ) خصوصی شمارہ، ۱۹۹۳

اردو دنیا (نئی دہلی) ۲۰۰۰

اوراق (لاہور)طنز ومزاح، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۷۲

ایسٹرن کریسنٹ (انگریزی)، مرکز المعارف (ممبئی)(متفرق شمارے)

ایوان اردو (دہلی)اگست ۲۰۰۰

ایوان اردو (دہلی)جنوری ۲۰۰۳

چنگاری (نئی دہلی)کام نگار نمبر، ۱۹۸۴

رسالہ فروغ اردو (لکھنؤ)جون ۱۹۶۰

ساقی (دہلی)طنز وظرافت نمبر، اپریل ۱۹۴۵

ساقی (دہلی)طنز وظرافت نمبر، اپریل ۱۹۴۵

شاہراہ (دہلی)طنز ومزاح نمبر، ۱۹۶۳

شگوفہ (حیدر آباد)ہندوستانی مزاح نمبر، جون ۱۹۸۵

علی گڑھ کالج میگزین (علی گڑھ) ۱۹۵۰

علی گڑھ میگزین (علی گڑھ) اکبر نمبر، ۱۹۵۰

علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)طنز وظرافت نمبر، مارچ ۱۹۴۴

فکر و تحقیق (نئی دہلی) جولائی، ۲۰۰۵

فکر و نظر (علی گڑھ) جنوری ۱۹۶۴

فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۵

کتاب نما (نئی دہلی) دسمبر، ۲۰۰۵

نقوش (لاہور) شخصیات نمبر، ۱۹۵۶

نقوش (لاہور) طنز و مزاح نمبر، فروری ۱۹۵۹

نیا دور (لکھنؤ) اردو صحافت نمبر، جون-جولائی ۲۰۱۱

نیا دور (لکھنؤ) یادِ رفتگاں نمبر، مارچ، ستمبر، ۱۹۸۸

نیا ورق (ممبئی) نومبر ۲۰۰۱

ہم سخن، جناح کالج (کراچی) طنز و مزاح نمبر، ۸۲-۱۹۸۱

Nau-Abadiyat, Muzahamat Aur Urdu Sahafat:

Lucknow Ka Haftahwar Awadh Panch (1877-1934)

Colonialism, Resistance And the Urdu Journalism:

The weekly Awadh Panch of Lucknow (1877-1934)

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfillment of the requirement
for the award of the degree of

Doctor of Philosophy

By

Razi Ahmad

Under the supervision of

Prof. Mazhar Mehdi Hussain

Centre of Indian Languages

School of Language, Literature and Culture Studies

Jawaharlal Nehru University

New Delhi- 110067

2017